مراقبات سلسلہ نقشبندیہ مجدّدیہ معصومیہ ہاشمیہ سیفیہ مع تشریحات

کل چھتّیس مراقبات مروّج ہیں۔ مراقبہ کا معنی انتظارِ فیض کرنا ہے۔ لہٰذا مراقبہ میں فیضِ الٰہی کے انتظار میں سکون و اطمینان کے ساتھ بیٹھنا ہوتا ہے۔ اور مراقبات کرتے وقت حضرت مرشدنا و اصلنا الی اللہ اخندزادہ سیف الرّحمٰن صاحب سقی اللہ ثراہ' وجعل الجنۃ مثواہ کا فرمان ہے کہ فارسی زبان میں ہی نیتِ مراقبہ کر کے بیٹھنا زیادہ فیض کا باعث ہوتا ہے۔ مراقبات شروع کرنے سے پہلے چند شرائط ہیں جن پر عمل کرنے سے مراقبہ میں زیادہ سرور و تسکین و لذت ملتی ہے جو درجِ ذیل ہے۔

شرائطِ مراقب و مراقبات:

۱) مراقب کو چاہیے کہ وقتِ مراقبہ طہارتِ کامل رکھتے ہوئے بالکل یکسوئی کے ساتھ متوجّہ ہو کر فیضانِ الٰہی کا منتظر رہے اور علاوہ مقصود کے ہر طرف سے اپنی توجّہ ہٹا دے۔

۲) یہ مراقبات ایسے شخص کے لئے سود مند ہیں اولاً جس کا عقیدہ اہل سنت والجماعت کی آراء کے مطابق بالکل صحیح ہو اور شیخِ کامل کے ہاتھ پر بیعت کر کے تابع ہو چکا ہو اور کسی کامل و مکمل مرشد سے مراقبات کا اذن لے چکا ہو۔

۳) یہ مراقبات اس وقت تجویز کئے جائیں گے جب سالک کے لطائف عالمِ امر و عالمِ خلق میں مرشدِ کامل مکمل کی صحبت سے حیات پیدا ہو چکی ہو اور ذکرِ الٰہی اس میں جاری ہو چکا ہو۔ اور نفی اثبات کا جس طور پر کہ لازم ہے عامل ہو چکا ہو۔ اس کے بعد اگر اس میں استعداد ہو تو مراقبات شروع کرائے جائیں۔

For More Books Click On
Ghulam Safdar Muhammadi Saifi

۴) تعداد توقفِ ایام ہر مراقبہ میں مرشد موصوف کے اذن پر موقوف ہے ورنہ:

ہر آن کاری کہ بے اُستاد باشد یقین می دان کے بے بنیاد باشد

۵) ہر مراقبہ کے الگ الگ آثار اور کیفیات ہوتے ہیں۔ مراقب کو چاہیئے کہ متابعتِ سنن اور آدابِ طریقت کا صحیح پابند رہے۔ آداب اور سنّتِ مصطفوی صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَسَلَّمَ کی کسی وقت مخالفت نہ کرے کیونکہ اس باب میں نہایت کوشش اور احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر کچھ سستی محسوس ہو تو اپنی تقصیرات کی طرف متوجّہ ہو کر معافی مانگ لینا چاہیئے کیونکہ:

ہر چہ ہست از قامت ناسازبی ہموار ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائی کس کوتاہ نیست

۶) مراقبہ کرتے وقت اس طور پر بیٹھنا چاہیئے کہ اگر کسی دوران نیند طاری ہو جائے تو وضو کی تجدید کی ضرورت نہ پڑے۔ اس لئے کہ مراقبہ نیند کی کیفیت رکھتا ہے، جیسا کہ بحر العلوم شرح فقہ اکبر میں کراماتِ اولیاء کی بحث میں صراحتہً فرمایا گیا ہے، تفصیل کے لئے وہاں رجوع کریں۔

۷) اگر دورانِ مراقبہ کچھ واقعات دیکھنے میں آجائیں تو اپنے مرشد کے حضور میں ذکر کرنا چاہیئے۔ خصوصاً عالم امر کے ظہور میں کہ اس مقام میں بیچونیت کا شائبہ دیکھا جاتا ہے۔ اپنے کو چون دیکھنے پر کہیں فریفتہ نہ ہو جائے۔ بہت سے سادہ لوح افراد اس وادی میں پھنسے ہوئے ہیں۔

۸) مراقب کو چاہیئے کہ جس مراقبہ میں جتنے دن کرنے پر معمور کیا گیا ہے، اس میں سستی نہ کرے۔

۹) مراقبات کی نیّت یاد کرنی چاہیئے۔ تمام مقامات، منازل اور کیفیاتِ سیر و سلوک سے واقفیت رکھنا ضروری ہے۔

۱۰) سالک کے سلوک کرنے کے لئے کام کسی کامل و مکمل شیخ کی توجہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر ایسا شخص مراقبہ کرے جو کہ لطائف کی کچھ اطلاع نہ رکھتا ہو، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کمثل الحمار یحمل اسفارا۔

ہر جاہل و کاہل و کہن سال ——— کے بود لائق شیخیت واقبال

۱۱) طالب کو چاہیئے کہ ہر وقت مرشد کے بسط کا منتظر رہے اور ان کی توجہات سے نفع وافر حاصل کرے، یہاں تک کہ ولایتِ صغریٰ جس کی ابتداء مراقبہ معیّت سے ہوتی ہے، کہ اس مقام سے گزار دیا جائے۔ اس لئے کہ یہ گزرگاہ نہایت تنگ ہے۔ بہت سے لوگ اس مقام میں متمرکز ہو چکے ہیں جو اپنی جان اور اپنے عروجات تک کی خبر نہیں رکھتے۔ اور وحدت الوجود کے قائلین بھی اس مقام میں انا الحق پر قرار پکڑے ہوئے ہیں۔ اسی باب میں حضرت مرشد کی توجہ کی تاثیر کبریت احمر ہے کہ ان کی توجہ کی برکت سے لوگ بجلی کی طرح اس مقام سے گزر جاتے ہیں۔ اور دائرہ ولایتِ کبریٰ میں پہنچ جاتے ہیں اور طالب حیران رہ جاتا ہے اور وحدت الوجود کے مقام سے گزرنا نہایت دشوار ہے۔ اور تنگیِ راستہ سے مراد بھی یہی دشواری ہے۔

سلسلہ نقشبندیہ کے مراقبات

بسم اللہ الرّحمن الرّحیم

نیت وقوف مراقبات

۱) نیت مراقبہ وقوف قلب: فیض می آید از ذات بیچون بہ لطیفہ قلبی من بواسطہ پیران کبار رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ توقف۔۔۔روز

۲) نیت مراقبہ وقوف روح: فیض می آید از ذات بیچون بہ لطیفہ روحی من بواسطہ پیران کبار رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ توقف۔۔۔روز

۳) نیت مراقبہ وقوف سِر: فیض می آید از ذات بیچون بہ لطیفہ سری من بواسطہ پیران کبار رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ توقف۔۔۔۔روز

۴) نیت مراقبہ وقوف خفی: فیض می آید از ذات بیچون بہ لطیفہ خفی من بواسطہ پیران کبار رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ توقف۔۔۔۔روز

۵) نیت مراقبہ وقوف اخفٰی: فیض می آید از ذات بیچون بہ لطیفہ اخفائے من بواسطہ پیران کبار رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ توقف۔۔۔۔روز

۶) نیت مراقبہ وقوف نفسی: فیض می آید از ذات بیچون بہ لطیفہ نفسی من بواسطہ پیران کبار رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ توقف۔۔۔۔روز

۷) نیت مراقبہ وقوف قالبی: فیض می آید از ذات بیچون بہ لطیفہ قالبی من بواسطہ پیران کبار رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ توقف۔۔۔۔روز

۸) نیت مراقبہ وقوف خمسۂ عالم امر: فیض می آید از ذات بیچون بہ لطائف خمسہ عالم امر من بواسطہ پیران کبار رحمۃاللہ علیہم اجمعین۔

توقف۔۔۔روز

۹) مراقبہ وقوف خمسۂ عالم خلق: فیض می آید از ذات بیچون بہ لطائف خمسہ عالم خلق من بواسطہ پیران کبار رحمۃاللہ علیہم اجمعین۔ توقف۔۔۔روز

۱۰) نیت مراقبہ وقوف مجموعہ لطائفِ عالمِ امر و عالمِ خلق: فیض می آید از ذات بیچون بہ مجموعہ لطائف عالم امر و عالمِ خلق من بواسطہ پیران کبار رحمۃاللہ علیہم اجمعین۔

توقف۔۔۔روز

۱۱) نیت مراقبہ احدیت: فیض می آید از ذات بیچون کہ جامع جمیع صفات وکمالات است و منزّہ از جمیع عیوب و نقصانات است وبی مثل است بہ لطیفہ قلبی من بواسطہ پیران کبار رحمۃاللہ علیہم اجمعین۔

توقف۔۔۔روز

مراقبۂ احدیت یعنی فنائے قلبی

تہلیل کے بعد فکر کے پہلے سبق کو ”مراقبہ احدیت“ کہتے ہیں۔

”احدیت“ احد (ایک) سے ہے، اس میں صرف فیض وارد ہونے کا دھیان رکھنا ہوتا ہے، نیت یوں کرتے ہیں ”فیض می آید از ذاتے کہ مستجمع جمیع صفات وکمالات است، ومنزہ از ہر نقصان وزوال، موردِ فیض لطیفۂ قلب من است“ میرے لطیفۂ قلب پر اس ذات والاصفات سے فیض آرہا ہے جو تمام

کمالات اور خوبیوں کا جامع ہے اور جملہ عیوب ونقائص سے منزہٗ وپاک ہے اور اسم مبارک "اللہ" کا مسمی ہے اور موردِ فیض میر الطیفہ ٔقلب ہے۔"

جس پر انوار وارد ہو رہے ہوں، اس جگہ کو مورد کہتے ہیں تو یہ فیض دل پر وارد ہوتا ہے، جب سالک نے یہ نیت کرلی اور بیٹھ گیا تو اس فکر کے ذریعہ سے سالک کی ترقی شروع ہو جاتی ہے، کیا عجیب شان ہے اللہ کی کہ بندے نے فقط ایک نیت کرلی تو اس نیت کی وجہ سے اس پر نور کا نزول شروع ہو جاتا ہے۔

میرے مولا کا کتنا بڑا اکرم ہے کہ فقط نیت پر فیض ملنا شروع ہو گیا، اس لئے یہ فکر سب سے افضل ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر اور اس کی حکمتوں کے عجائب کے متعلق سوچتے ہیں اس سے اللہ جل شانہٗ کی معرفت میں قوت پیدا ہوتی ہے، جو لوگ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور وفکر کرتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے "اولوا الالباب "یعنی عقلمند فرمایا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور وفکر کرنے سے منع کیا۔

فرمایا: کیونکہ وہ وراء الوراء ہے، سوچ سے بالاتر ہے، سوچ کی اوقات نہیں کہ وہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی حقیقت کو سماسکے، سنار کے ترازو سے کوہ ہمالیہ نہیں تولا جاسکتا اسی طرح انسان کی عقل بھی اللہ تعالیٰ کی ذات کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ حدیث میں فرمایا کہ تم صرف مخلوقات میں غور وتدبر کیا کرو۔

"فضائل ذکر" میں شیخ الحدیث زکریا نے نقل کیا ہے کہ امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ غور وفکر کو افضل عبادت اس لئے کہا گیا کہ اس میں معنیٰ ذکر کے تو موجود ہوتے ہی ہیں، دو چیزوں کا اضافہ اور ہوتا ہے ایک اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس لئے کہ غور و فکر معرفت کی کنجی ہے، دوسری

اللہ تعالیٰ کی محبت کہ فکر پر یہ مرتب ہوتی ہے۔یہی غور و فکر ہے جس کو صوفیہ "مراقبہ" سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی ملتی ہے یعنی انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ واقعی اس کائنات کا کوئی نہ کوئی پیدا کرنے والا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو دیکھتا ہے تو بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے، غور و فکر سے معرفت کا پیدا ہونا اور محبت کا پیدا ہونا یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے۔

شیخ الحدیث صاحب ایک اور حدیث مبارک نقل کرتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ رات کو تشریف لائے، میرے بستر پر میرے لحاف میں لیٹ گئے، پھر ارشاد فرمایا: ذرني أعبد ربي، چھوڑ! میں تو اپنے رب کی عبادت کروں۔ یہ فرما کر اٹھے ،وضو فرمایا اور نماز کی نیت باندھ کر رونا شروع کر دیا یہاں تک کہ آنسو سینے مبارک پر بہتے رہے، پھر اسی طرح رکوع میں روتے رہے، ساری رات اسی طرح گزاری حتی کہ صبح کی نماز کے واسطے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ لینے کیلئے آ گئے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ تو بخشے بخشائے ہیں پھر آپ اتنا کیوں روئے؟

ارشاد فرمایا: أفلا أكونُ عَبدًا شَكُورًا۔[1]

کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

پھر فرمایا: میں کیونکر نہ روتا حالانکہ آج مجھ پر یہ آیتیں نازل ہوئیں:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ

---

[1] البخاري (ت ٢٥٦)، صحيح البخاري ٦٤٧١• مسلم (ت ٢٦١)، صحيح مسلم ٢٨١٩• البزار (ت ٢٩٢)، البحر الزخار المعروف بمسند البزار ٣٣١/١٤• ابن جرير الطبري (ت ٣١٠)، تفسير الطبري ٨٤/٢/١٣• ابن حبان (ت ٣٥٤)، صحيح ابن حبان ٣١١• ابن حبان (ت ٣٥٤)، المجروحين ٥٢٥/١•

وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (البقرۃ۱۶۴)

بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات و دن کا بدلتے آنا اور کشتی کہ دریا میں لوگوں کے فائدے لے کر چلتی ہے اور وہ جو اللہ نے آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو اس سے جِلا دیا اور زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلائے اور ہواؤں کی گردش اور وہ بادل کہ آسمان و زمین کے بیچ میں حکم کا باندھا ہے ان سب میں عقلمندوں کے لئے ضرور نشانیاں ہیں۔

پھر فرمایا: ہلاکت ہے اس شخص کیلئے جو ان کو پڑھے اور غور و فکر نہ کرے۔

"فضائل ذکر" میں ایک اور روایت ہے کہ عامر بن قیس کہتے ہیں کہ میں نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ایک، دو یا تین سے نہیں، بلکہ ان سے زیادہ سنا سے سنا ہے کہ ایمان کی روشنی اور ایمان کا نور غور و فکر ہے۔ سبحان اللہ! پس ہمیں سند مل گئی کہ اتنے سارے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے فرمایا کہ ایمان کی روشنی اور ایمان کا نور غور و فکر میں ہے، ثابت ہوا کہ اگر مراقبہ میں کوئی غور و فکر کی نیت سے بیٹھے گا تو اس کے ایمان کو نور ملے گا، اس کا سینہ منور ہو گا، یہ تو حدیث پاک سے ثابت ہو رہا ہے کہ ایمان کی روشنی اور ایمان کا نور فکر میں ہے۔

ام درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کسی نے پوچھا کہ ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی افضل عبادت کیا تھی؟ فرمایا: غور و فکر ان کی افضل ترین عبادت تھی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ غور و فکر میں بیٹھنے کو مراقبہ کہتے ہیں۔ اب اگر کوئی کم فہم اعتراض کرے کہ دور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں مراقبہ نہیں ہوتا تھا، تو یہ شخص یا تو جاہل ہے یا پھر متجاہل ہے، کیونکہ یہ تو احادیث مبارکہ اور صحابہؓ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عمل سے ثابت ہے، چنانچہ ام درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہا گواہی دے رہی ہیں کہ ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی افضل ترین عبادت غور و فکر یعنی مراقبہ تھا۔

اس سبق میں ذکر نہیں کرتے جیسے پہلے سبق میں تھا کہ اللہ، اللہ کی صدا آرہی ہے، ذکر تو ساتویں سبق پہ ختم ہو گیا اور تہلیل آٹھویں اور نویں سبق میں تھا، اس کے بعد فکر کے مراقبے ہیں، تو مراقبۂ احدیت میں فقط ابتداء میں نیت کرنی ہوتی ہے، پھر خاموش بیٹھنا ہوتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور نور برستا ہے جو سینے کو منور کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شان دیکھئے کہ بندہ جیسی نیت کرے ویسی برکت آتی ہے، مثلاً ذات سے فیض آرہاہے، صفات سے آرہاہے، شیونات سے آرہاہے الغرض جہاں کی نیت کرے، وہیں سے فیض ملتاہے، اس میں اتنا فیض ملتاہے کہ بندے کو ذکر میں استغراق حاصل ہو جاتاہے اور اس پر فنائیت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، یہ فنائے قلبی کا سبق ہے، بندے کو قلب کی فنائیت یہاں مل جاتی ہے، ذکر بندے کے قلب کے اوپر غالب آجاتاہے کہ وہ بندہ ذکر میں فنا ہو جاتاہے اس کو ''فنافی اللہ'' کہتے ہیں اور یہ ہمارے سلوک کا ایک نمایاں موڑ ہے۔

ہدایت الطالبین میں شاہ ابوسعید نوراللہ مرقدہ لکھتے ہیں کہ مراقبہ احدیت میں جو فیض اترتاہے وہ انسان کے لطیفہ قلب کے اوپر اترتاہے۔یعنی مورد فیض انسان کا لطیفۂ قلب ہے۔شاہ غلام علی مجددی دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات ''درالمعارف'' میں لکھاہے کہ مراقبہ احدیت صرفہ کا تعلق حضرت ذات سے ہے جو کہ اسم مبارک اللہ سے مسمیٰ ہے اس لئے اس میں صفات کا شیونات کا یا کسی اور چیز کا تصور نہیں کرتے بلکہ صرف ذات کا کرتے ہیں اللہ کے ذکر کی فنائیت یہاں حاصل ہوتی ہے بعض بزرگوں نے کہا کہ اس میں ذات کا اختتام یہاں آکر ہوتاہے یعنی اس کی تکمیل یہاں آکر ہوتی ہے مزید فرماتے ہیں وقوف قلبی دل کی طرف توجہ کرکے اور اس معنیٰ کا لحاظ رکھ کر کہ ذات پاک اللہ کے سوا کوئی مقصود نہیں ہے۔ذکر کے الفاظ کی صحت کے ساتھ دل کے وسوسوں

سے نگہداشت ہمیشہ ہونی چاہیئے کیونکہ دل زیادہ کے بغیر نہیں کھلتا اور بعض گشت کہ اے اللہ تعالیٰ میرا مقصود توہی ہے اور تیری رضا ہے اپنی محبت اور معرفت عطا فرما۔ اپنی نیستی (فنا) اور حضرت ذات پاک (اللہ تعالیٰ کی ہستی کی اثبات بقاء) کی ملاحظہ وانکساری وعاجزی کے ساتھ دائمی ذکر ہونا چاہیئے۔

حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلوی کے ملفوظات درالمعارف میں لکھا ہے کہ ایک حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مکتوبات کا درس چل رہا تھا۔

شروع میں مراقبہ میں احدیت مسمیٰ اسم مبارک اللہ کرتے ہیں جو تمام صفات کمال کا جامع اور نقصان وزوال سے منزہ پاک ہے۔

صفات کے لحاظ کے بغیر کہ اللہ سننے والا ہے (سمیع)

یا دیکھنے والا ہے (بصیر)

یا جاننے والا ہے (علیم)

یا قدرت رکھنے والا ہے (قدیر)

حاضرین میں سے کسی نے حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ سمیع ،بصیر، علیم اور قدیر وغیرہ کے لحاظ رکھنے کی کیا وجہ ہے؟ تو حضرت شاہ غلام علی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس مراقبہ میں اس ذات کو ملحوظ رکھتے ہیں جو تمام صفات کی جامع ہے نہ کہ صفات میں سے کسی صفت کی۔ کیونکہ اس ذات سے جو مقصود بالذات ہے صفا جو مقصود بالعرض ہے، کی طرف متوجہ کرنا مقصود حقیقی سے مطلوب عرضی کی جانب مائل ہونا ہے۔

حضرت شاہ غلام علی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات درالمعارف میں یہ بھی لکھاہے کہ ہم پہلے مراقبہ احدیت کی تلقین کرتے ہیں اوروہ عبارت ہے اسم مبارک اللہ کے مفہوم کے لحاظ سے، جس پر ہم ایمان لے آئے ہیں کہ وہ بے مثل وبے مثال (بے چون وبے چگون) ہے اور تمام صفات سے موصوف اورسب نقصان اورزوال سے منزہ (پاک)ہے۔مراقبہٗ احدیت تک دائرہ امکان کے اندر سیر ہوتی ہے۔آپ یوں سمجھئے کہ جب خلائی جہاز چلتاہے توپہلے وہ فضامیں سفر کرتا ہے پھر ایک ایساوقت آتاہے کہ جہاں وہ فضاسے نکل کر خلامیں پہنچ جاتاہے،وہاں کامعاملہ کچھ اورہوتا ہے ہمارے اس سلوک میں آپ یوں سمجھیں کہ مراقبہٗ احدیت سےپہلے سالک فضاءمیں سیر کررہاتھااورمراقبہٗ احدیت کے بعدپھر خلامیں سیر کرتاہےیوں سمجھیں کہ مراقبہٗ احدیت کے بعدسلوک کارخ ہی دوسراہوجاتاہے۔گویااسم ذات اور تہلیل کاذکرلطائف کے اندر استعداد پیدا کرنے کیلئے تھا،جب کہ فکر کامراقبہ اصل مقصود تھا۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ جب تک کسی برتن کوپاک صاف نہ کیاجائےاس میں دودھ نہیں ڈالا جاتا۔اللہ تعالیٰ نے نور ڈالنے سےپہلے فرمایاکہ تم دل کے برتن کوپہلے میرے نام سے صاف کروکچھ رہ جائےتولاالہ الااللہ سےرگڑلوجب تمہارابرتن صاف ہوجائے تو پھر میرے سامنے فقیرسائل بن کر یہ نیت کرکےبیٹھ جاناکہ اللہ تعالیٰ یعنی اس ذات سے فیض آرہاہے جوتمام صفات وکمالات کی جامع ہے۔ہر نقصان وزوال سے پاک ہےاورلطیفہ قلب پر فیض آرہاہے۔اللہ تعالیٰ فرماتاہے کہ تم اپناکاسہٗ گدائی میرے سامنےکرکے بیٹھوگے تو میں پروردگار تمہارے دلوں کونورسے بھردوں گا۔اس لئے مراقبہٗ احدیت کے بعدجتنے اسباق ہیں وہ سب فکرکے مراقبات ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ **دائم الفکر** اور **متواصل الحزن** تھے یعنی ہمیشہ غمزدہ اور فکر مند رہتے تھے۔

تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کے پیارے حبیب ﷺ کے اوپر اتنے انوار کی بارش ہوتی تھی کہ آپ ﷺ ان انوار کے حصول میں کئی مرتبہ مستغرق ہوا کرتے تھے اس لئے تو آپ ﷺ فرماتے تھے کہ میرا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص وقت ہے۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حدیث مبارک سے دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ کی طویل خاموشی غفلت کی خاموشی نہیں ہو سکتی۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی خاموشی غفلت کی خاموشی ہو، وہاں تو گناہ کا تصور ہی نہیں، وہ معصوم تھے تو پھر آپ ﷺ کی خاموشی میں کیا عمل ہوتا تھا؟

اس کا جواب یہی ہے کہ وہ فکر کا عمل تھا بلکہ اگر یوں کہیں کہ نبی کریم ﷺ غار حرا میں کیا کرتے تھے؟ تو وہ بھی فکر ہی تھی چونکہ اس وقت نہ قرآن مجید تھا تو جب قرآن بھی نہیں تھا اور نماز بھی نہیں تھی تو پھر آپ ﷺ غار حرا میں کیا کرتے تھے؟ محققین کرام کے نزدیک نبی کریم ﷺ غار حرا میں فکر اور تفکر فرماتے تھے اسی فکر نے تو پھر دل کو ایسا روشن اور منور کر دیا کہ جیسے شمع جلنے کے قریب ہو جائے۔ **یضی ولو لم تمسسه نار**۔ (سبحان اللہ) جیسے ابھی آگ نے تیل زیتون کو چھوا بھی نہیں لیکن بالکل وہ جلنے کے قریب ہو گئی۔ تو محبوب ﷺ کی یہ کیفیت فکر کی وجہ سے تھی، اللہ تعالیٰ نے وہ نور عطا فرما دیا تھا۔

الحمد للہ! ہم اگر اپنے مشائخ کے راستے پر نہ آکر زندگی گزارتے تو ہمیں پتہ ہی نہ چلتا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے اس طرح بھی انوار حاصل کیے جا سکتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص بندوں پر راستہ

کھول دیا کہ دیکھو تم اگر مجھ سے انوار اور برکات لینا چاہتے ہو تو اس کا یہ طریقہ ہے ۔الحمدللہ یہ جو تھوڑی دیر کا مراقبہ ہے اس کی اہمیت سے واقف ہو جانا چاہیئے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جس لطیفے کو فنا حاصل نہیں ہو گی وہ لطیفہ قیامت کے دن اندھی حالت میں کھڑا کیا جائے گا۔ وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَى فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَى (الاسراء ۷۲) اور جو اس زندگی میں اندھا ہو وہ آخرت میں اندھا ہے۔"

اس لئے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا دیدار ظاہر کی آنکھوں سے نہیں ہو گا۔وہ دل کی آنکھوں سے ہی ہو گا اور دل کی آنکھوں سے سارے لطائف بینا ہوں گے اس کو اللہ رب العزت کے جمال کا صحیح لطف نصیب ہو گا۔اور جس کا من ہی اندھا ہو گا وہ دیدار محبوب کی لذت نہ پاسکے گا تو ہم دنیا میں محنت کر کے اپنے تمام لطائف کو نقطۂ فنا تک پہنچا دیں گے تاکہ جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوں گے تو من کی آنکھیں روشن ہوں ۔اور اللہ رب العزت کے دیدار کی صحیح لذت ہمیں حاصل ہو سکے۔تو یہ فنائے قلبی ولایت کا پہلا قدم ہے۔بندہ کم سے کم اس درجے تک تو پہنچے جہاں نفس کی خباثتوں سے جان چھوٹ جائے۔جہاں انسان اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آجائے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں میں اس کا شمار ہو جائے۔قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ۔(الحجر ۴۲)۔ بیشک میرے بندوں پر تیرا کچھ قابو نہیں۔"

تو وہ جو عبادی کا زمرہ ہے وہ اس مراقبہ احدیت سے آگے شروع ہوتا ہے، جس نے کام کو اس نقطے تک پہنچا دیا کہ اب اس کے اندر غفلت نہیں رہتی۔

وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ (الاعراف ۲۰۵) اور غافلوں میں نہ ہونا۔" کے حکم پر اس کو عمل نصیب ہو جاتا ہے۔

مشائخ نے فرمایا ہے کہ عدم غفلت عبدیت کی طرف پہلا قدم ہے تو وہ قدم یہاں آکر راسخ ہو جاتا ہے۔اس کے بعد غفلت نہیں ہوتی۔فکر کا مراقبہ کرنے کے بعد پھر بندے کو دائمی حضوری نصیب ہوتی ہے۔اس لئے لیٹے بیٹھے چلتے پھرتے ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان رہتا ہے۔اس لئے یہ مراقبۂ احدیت ذکر و سلوک کے راستے میں ایک موڑ ہے۔دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہمیں ان مراقبات کو پابندی کے ساتھ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین۔بحرمۃ سید الانبیاء والمرسلین علیٰ نبینا و علیھم السلام۔

ان پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں بھی وہ عطا فرمائے اور ہم کوتاہ پرواز اور پست پرواز ہیں لیکن اللہ رب تو بے نیاز ہے وہ تو نیت کو دیکھتا ہے اگر ہم دل کے برتن کو سیدھا کر کے طلب لے کر بیٹھ جائیں گے تو اگرچہ ہم وہ مجاہدے نہ کر سکیں وہ ریاضتیں بھی نہ کر سکیں مگر اسی راستے پر چلنا تو چاہتے ہیں بہرحال اچھی نیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مہربان ہو گا۔

یہ حقیقت ہے کہ ماں اپنے کمزور بچے پر زیادہ مہربان ہوتی ہے اور باپ بھی اپنے کمزور بیٹے پر زیادہ مہربان ہوتا ہے۔

آج کے دور میں ذکر و سلوک کے راستے پر چلنا کوئی آسان کام نہیں ہے سچی بات یہ ہے کہ پہلے زمانے میں یوسف علیہ السلام کیلئے ایک زلیخا تھی۔آج ہر یوسف کیلئے دس دس زلیخائیں ہیں۔ایسا پرفتن دور آگیا ہے اس وقت میں نفسانی وشہوانی گناہوں سے بچنا اور ان تمام لذتوں سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جانا بہت بڑی قربانی ہے۔اس پر اللہ تعالیٰ مہربانی فرما دیتا ہے اور بالآخر بندے کو ولایت کا نور عطا فرما دیتا ہے۔

جیسا کہ **الفانی لا یرد**۔ کہ فانی لوٹتا نہیں۔ جس بندے کو مراقبۂ احدیت تک کی کیفیت صحیح مل گئی اب اس کے بھٹکنے اور پھسلنے کے امکانات نہیں رہتے وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آجاتا ہے۔ اور جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

حضرت خواجہ معصوم رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ کو الہام ہوا کہ آپ کو ہم ایسا بیٹا عطا کریں گے جو زندگی کبیرہ گناہ نہیں کرے گا اور وہ مادرزاد ولی ہو گا بچپن سے ولایت کا نور لئے پیدا ہو گا۔ ہم گناہوں سے اس کی حفاظت فرمائیں گے۔ اس الہام کے بعد امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام محمد معصوم رکھا اب وہ خواجہ محمد معصوم رحمہ اللہ تعالیٰ کے نام سے پہچانے جاتے ہیں جنہوں نے حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ سے ۹ سال کی عمر میں اجازت و خلافت پائی۔ ۹ سال کی عمر کتنی چھوٹی عمر ہوتی ہے ۹ سال کی عمر میں حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ سے خلافت پائی اور وہ قیوم وقت بنے۔ اپنے وقت کے روحانی اعتبار سے قیوم کہلائے۔ یہ مرتبہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا۔ ایک جگہ اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ میں اس قابل تو نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے جنت کی عظیم نعمتیں مانگوں ہاں اتنی تمنا ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بخشے ہوئے بندوں کی صف میں مجھے بھی شامل فرمالے۔

نیاتِ مراقبات

صفائی باطن کا دوسرا طریقہ مراقبہ ہے، دل کو وسوسوں اور خطرات سے خالی کر کے فیضِ خداوندی اور رحمت الٰہی کا انتظار کرنا اور اس کے مورد پر وارد ہونے کا لحاظ کرنا مراقبہ کہلاتا ہے۔ جس لطیفے پر فیض وارد ہو رہا ہوتا ہے اس لطیفے کو موردِ فیض کہتے ہیں۔

۱۱) نیت مراقبہ احدیت: فیض می آید از ذات بیچون کہ جامع جمیع صفات وکمالات است ومنزّہ از جمیع عیوب ونقصانات است وبی مثل است بہ لطیفہ قلبی من بواسطہ پیران کبار رحمۃاللہ علیہم اجمعین۔ توقف۔۔۔روز زبانِ حال کے ساتھ یہ نیت کرکے فیضان الٰہی کے انتظار میں بیٹھا رہے۔اس مراقبہ میں جمعیت اور حضورِ قلب کی نسبت حاصل ہونے کی طرف توجہ رکھنی چاہیئے اور تنزیہ وتقدیس ذات حق سبحانہ کا پوری طرح خیال رکھنا چاہیئے۔

اثرات: خطراتِ قلبی کے بالکلیہ زائل ہونے یا کم ہونے کو جمعیت کہتے ہیں۔ قلب کی توجہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف پیدا ہونے کو حضور کہتے ہیں۔ مراقبۂ احدیت میں سالک کو حق تعالیٰ کے ساتھ حضوری اور اس کے ماسوا سے اعراض حاصل ہو جاتی ہے حتیٰ کہ کم از کم چار گھڑی تک خطرے اور وسوسے کے بغیر یہ حضور حاصل ہو جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ اس مراقبے کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

مراقبۂ احدیت کے بعد مراقباتِ مشارب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مشارب جمع مشرب کی ہے بمعنی راہ اور گھاٹ۔ ان مراقبات کے ذریعے سالک مقامِ فنا تک پہنچ جاتا ہے اس لئے ان کو مشاربات کہتے ہیں۔ عالمِ امر کے ہر لطیفہ کی اصل عرش کے اوپر ہے، چنانچہ لطیفۂ قلب کی اصل تجلی افعال الٰہی ہے، لطیفۂ روح کی اصل تجلی صفات ثبوتیہ ہیں، لطیفۂ سر کی اصل شیونات ذاتیہ ہیں، لطیفۂ خفی کی اصل تجلیٔ صفاتِ سلبیہ ہے، لطیفۂ اخفیٰ کی اصل تجلی شانِ جامع ہے۔ جب تک ہر لطیفہ نورانی ہو کر اپنی اصل تک نہ پہنچے اس لطیفہ کی فنا حاصل نہیں ہوتی۔ واضح رہے کہ جب تک ہر مراقبہ کا اثر سالک کے لطیفہ

پر محسوس نہ ہو، ہر گز دوسرا مراقبے کی تلقین نہ کی جائے ورنہ ماسواء کا خیال دل سے کبھی دور نہ ہو گا اوراس کو مقامِ فناتک (جو ولایت کا پہلا قدم ہے) رسائی نصیب نہ ہو گی۔

۔۔۔۔۔۔نیت اصول مراقبات۔۔۔۔۔۔

۱۲) نیت مراقبہ اصل قلب: الٰہی قلبِ من بمقابل قلبِ نبی علیہ السّلام، آن فیض تجلّائی صفاتِ فعلیہ خود کہ از قلبِ نبی علیہ السّلام بہ قلبِ آدم علیہ السّلام رسانیدہ بہ قلبِ من نیز برسانی بواسطہ پیران کبار رحمہم اللہ تعالٰی۔ توقف۔۔۔روز

ترجمہ: اے اللہ! میرا لطیفۂ قلب رسول اکرم ﷺ کے لطیفۂ قلب کے بالمقابل فیض کا منتظر ہے جو تونے اپنی صفات فعلیہ سے حضرت آدم علیہ السلام کے لطیفہ تک پہنچایا، وہ فیض میرے لطیفۂ قلب پر بھی القاء فرمابزرگان دین رحمہم اللہ تعالٰی کے وسیلۂ جمیلہ سے۔

یہ ولایت کا پہلا زینہ ہے، اس زینہ پر چڑھنے والا حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ہر وقت توبہ و انابت میں محو و مشغول رہتا ہے، نیز بری عادات وصفات رذیلہ کو ترک کرکے اخلاق حسنہ کو اپنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ تاکہ اس حدیث مبارک تخلقوا بأخلاق اللہ (اپنے اندر اللہ تعالٰی کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرو) کا مصداق بن جائے۔ اسے ہر شے میں اللہ تعالٰی کے جلوے نظر آتے ہیں اور اپنے و دیگر مخلوقات کے افعال کو اللہ تعالٰی کی طرف منسوب کرنے لگتا ہے۔

اثرات: اس لطیفہ کے مراقبہ میں اپنے افعال اور تمام افعال اور تمام مخلوق کے افعال سالک کی نظر سے پوشیدہ ہو جاتے ہیں اور ایک فاعل حقیقی کے فعل کے سوا اس کی نظر میں اور کچھ نہیں آتا۔ جب اس دید کا غلبہ ہو جاتا ہے تو سالک کائنات کی ذات وصفات کو حق سبحانہ وتعالٰی کی ذات وصفات کا

مظہر دیکھتا ہے اور ماسوا کو اس قدر بھول جاتا ہے کہ بتکلف یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آتا اور دنیا کے غم وخوشی سے قلب متاثر نہیں ہوتا، اس کو فنائے لطیفۂ قلب کہتے ہیں۔

۱۳)نیت مراقبہ اصل روح: الٰہی روح من بمقابل روح نبی علیہ السّلام، آن فیض تجلّائی صفات ثمانیہ ثبوتیہ ذاتیہ حقیقیہ خود کہ از روح نبی علیہ السّلام بہ روح ابراہیم ونوح علیہم السّلام رسانیدہ بہ روحِ من نیز برسانی بواسطہ پیران کبار۔

توقف۔۔۔روز

ترجمہ: اے ذات باری تعالیٰ میرا لطیفۂ روح رسول اکرم ﷺ کے لطیفۂ روح کے بالمقابل فیض کا منتظر ہے اپنی آٹھ حقیقی صفات کی تجلیات کا فیض جو کہ رسول اکرم ﷺ کے لطیفۂ روح سے حضرت ابراہیم ونوح علیہما السلام کے لطیفۂ روح پر پہنچا۔ وہ فیض میرے لطیفہ روح پر بھی القاء فرما۔ بزرگان دین علیہم الرضوان کے توسل سے۔

اس لطیفہ کے مراقبہ کرنے والے میں حضرت نوح و ابراہیم علیہما السلام کی طرح صفت توکل پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مصائب و آلام سے نہیں گھبراتا بلکہ خندہ پیشانی سے حوادث زمانہ کا مقابلہ کرتا ہے، نفس و شیطان کی مکاریوں سے بچتے ہوئے ہمہ وقت ذات باری تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے جو چیز بھی یاد خدا میں حائل ہو، اسے ذبح کرتا چلا جاتا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح عالم ملک وملکوت کا مشاہدہ کرتا ہے، یعنی اسے سیر آفاقی نصیب ہوتی ہے۔

اثرات: لطیفۂ روح کی فنا اس وقت حاصل ہوتی ہے جب سالک کی نظر سے اپنی اور تمام مخلوقات کی صفات غائب ہو جائیں اور تمام صفات کی نسبت حق تعالیٰ ہی کی طرف نظر آئے۔ اس مقام میں جب سالک اپنے آپ سے اور تمام مخلوقات سے وجود کی نفی کرتا ہے جو کہ تمام صفات کی

اصل ہے اور حق تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لئے وجود کا اثبات نہیں کرتا تو ناچار توحید وجودی کا قائل ہو جاتا ہے۔

دراصل اس سبق کے اثرات مختلف ہیں، اس سبق میں سالک کی نظر سے اپنی صفات زائل ہو جاتی ہیں اور اس پر اللہ تعالیٰ کی صفات کا غلبہ ہو جاتا ہے، اس مقام پر سالک کو وہ نعمت ملتی ہے جس کو کہتے ہیں۔ تخلقوا بأخلاق الله تعالىٰ (اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متصف ہو جاؤ) جب سالک روح کی فنایت حاصل کر لیتا ہے تو پھر اس کے اوپر صفات باری تعالیٰ کا اتنا اثر آ جاتا ہے کہ اس کی ذات ان صفات میں گم ہو جاتی ہے، اس کے اندر بھی وہ صفات آ جاتی ہیں، اور جب یہ صفات آ جائیں تو بندہ قرب کا مقام پالیتا ہے اور ان صفات کی وجہ سے بندہ اللہ تعالیٰ کا پیارا بن جاتا ہے۔ اس مقام پر سالک کو وہ درجہ ملتا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ حدیث قدسی میں فرماتا ہے:

ولا يزال عبدي يتقرب إلي بالنوافل حتى أحبه فإذا أحببته كنت سمعه الذي يسمع به وبصره الذي يبصر به ويده التي يبطش بها ورجله التي يمشي بها وإن سألني لأعطينه۔[2]

یعنی "بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کر لیتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں پھر جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے کسی چیز کا سوال کرتا ہے تو میں اسے عطا کرتا ہوں"۔

اور پھر اس مقام والے بندے کو اللہ تعالیٰ ایک ایسی نعمت عطا فرماتا ہے کہ اس کی دعائیں رد نہیں ہوتیں۔ چنانچہ اسی حدیث مبارکہ میں ہے وان سألنی أعطینه "اگر وہ بندہ مجھ سے مانگتا ہے تو

[2] صحيح البخاري، ج۵، ص ۲۳۸۴۔ الناشر: دار ابن كثير، اليمامة - بيروت

میں عطا کرتا ہوں" یعنی مستجاب الدعوات ہونے کا درجہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ عنایت فرما دیتا ہے۔

سبحان اللہ! شاعر نے شاید اسی متعلق کہا ہے:

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود — گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

ان (اللہ والوں) کا کہنا اللہ تعالیٰ کا فرمانا ہے اگرچہ بندہ کے منہ سے وہ الفاظ نکلے ہوں۔

۱۴) نیت مراقبہ اصل سِرّ: الٰہی سر من بمقابل سر نبی علیہ السّلام، آن فیض تجلّائی صفات شیونات ذاتیہ خود کہ از سر نبی علیہ السّلام بہ سر موسیٰ علیہ السّلام رسانیدہ بہ سر من نیز برسانی بواسطہ پیران کبار۔

توقف۔۔۔۔روز

شیون جمع ہے شان کی اور اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ شان ذاتیہ ہے کہ جس سے وہ صفات ثبوتیہ کے ساتھ موصوف ہے:

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمن ۲۹)

ترجمہ: ہر روز وہ (اللہ تعالیٰ) ایک نئی نئی شان میں ہے۔

مکتوب امام ربانی رحمہ اللہ تعالیٰ شیونات کے بارے میں

شیونات

جمع الجمع کا صیغہ ہے اس کا مفرد شان ہے اور شیون اس کی جمع ہے۔ شان کا معنی حال اور امر ہے۔[3] آیتِ مبارکہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمن ۲۹) اس مرتبے اور اصطلاح کی اصل ہے۔

---

[3] مجمع بحار الانوار ص ۱۷۰۔

اللہ تعالیٰ جب اپنے بندے پر تجلی فرماتا ہے تو اس تجلی کو حق کے اعتبار سے شانِ الٰہی کہا جاتا ہے اور بندے کے اعتبار سے حال کہتے ہیں۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ شیونات کی تعریف میں رقم طراز ہیں۔ اردو ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

اللہ تعالیٰ کی شیونات، اس کی ذات کی فرع ہیں اور اس کی صفات ان شیونات پر ہی متفرع ہیں اور اس کے اسماء جیسے خالق ورازق (وغیرھا) صفات پر متفرع ہیں اور اس کے افعال ان اسماء پر متفرع ہیں اور تمام موجودات افعال کے نتائج ہیں اور ان ہی پر متفرع ہیں۔ (اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے) پس معلوم ہو گیا کہ شیون اور چیز ہیں اور صفات اور چیز اور شیون خارج میں عینِ ذات ہیں اور صفات خارج میں ذات پر زائد ہیں۔[4]

نیز حضرت امام ربانی قدس سرہ مزید فرماتے ہیں کہ وہ فیض جو حق تعالیٰ کی طرف سے سالک کو پہنچتا ہے دو قسم کا ہے ایک قسم وہ ہے جس کا تعلق ایجا د (موجود کرنا) اِبقاء (باقی رکھنا) تخلیق (پیدا کرنا) ترزیق (رزق دینا) احیاء (زندہ کرنا) اماتت مارنا (مارنا) وغیرہا کے ساتھ ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو ایمان، معرفت اور مراتبِ ولایت و نبوت کے تمام کمالات سے متعلق ہے۔ پہلی قسم کا فیض سب کو صفات کے ذریعے سے آتا ہے اور دوسری قسم کا فیض بعض کو صفات کے ذریعے سے اور بعض کو شیونات کے واسطے سے آتا ہے اور صفات و شیونات کے درمیان بہت باریک فرق ہے جو محمدی المشرب اولیاء کے علاوہ کسی پر ظاہر نہیں ہوا اور نہ ہی کسی اور نے اس کی نسبت کلام کیا...

[4] معارف لدنیہ معرفت ص ۲۰۔

اس بیان کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں مثلاً پانی بالطبع اوپر سے نیچے کو آتا ہے یہ طبعی فعل اس میں حیات ، علم ، قدرت وارادہ کا اعتبار پیدا کرتا ہے کیونکہ صاحبانِ علم اپنے ثقل کے باعث بتقاضائے علم اوپر سے نیچے کو آتے ہیں اور فوق کی طرف توجہ نہیں کرتے اور علم حیات کے تابع ہے اور ارادہ علم کے تابع ہے۔ اس طرح قدرت بھی ثابت ہو گئی کیونکہ ارادہ میں اَحَدُ المقدورَین (دو مقداروں میں سے ایک کو اختیار کرنا) کی تخصیص ہے پس یہ اعتبارات جو پانی کی ذات میں ثابت کیے جاتے ہیں بمنزلہ شیونات کے ہیں ۔ اگر ان اعتبارات کے باوجود پانی کی ذات میں صفاتِ زائدہ ثابت ہو جائیں تو وہ وجودِ زائد کے ساتھ صفاتِ موجودہ کی طرح ہوں گے۔ پانی کو پہلے اعتبارات کے لحاظ سے حی، عالم، قادر اور مرید نہیں کہہ سکتے۔ ان اسموں کے ثابت کرنے کے لئے صفاتِ زائدہ کا ثابت کرنا ضروری ہے۔

لٰہذا جو کچھ بعض مشائخ کی عبارات میں پانی کے متعلق مندرجہ بالا اسموں کے ثبوت میں واقع ہوا ہے ان کی بنیاد شیون وصفات میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے ہے اور اسی طرح صفات کے وجود کی نفی کا حکم بھی اس فرق کے معلوم نہ ہونے پر محمول ہے اور شیون وصفات کے درمیان دوسرا فرق یہ ہے کہ مقامِ شیون صاحبِ شان کا مواجہ (روبرو) ہے اور مقام صفات ایسا نہیں ہے۔[5]

مقام شیون مواجہۂ ذات ہے

حضرت امام ربانی قدس سرہ کی نظر میں بنیاد یہ ہے کہ جو حضرات صرف شہودِ صفات تک پہنچے ہیں وہ ابھی مرتبۂ ذات تک وصول کی سعادت سے مشرف نہیں ہوئے اور جو شہودِ شیونات کے مرتبے سے شادکام ہیں انہیں وصولِ ذات کا مرتبہ بھی حاصل ہے کیونکہ شیونات، ذاتِ حق

[5] دفتر اول مکتوب ۲۸۷۔

تعالیٰ پر زائد نہیں اور نہ ہی ان کا وجودِ خارجی ثابت ہے لیکن صفات، ذات پر زائد ہیں اور وجودِ خارجی بھی رکھتی ہیں لہذا سیرِ صفات میں تعلقاتِ صفات پیش نظر ہوتے ہیں اور وہ ممکنات ہیں اس مرتبے میں عارف مرتبۂ ذات سے دور رہتا ہے کیونکہ یہ مقام صفات کا ہے لیکن مقامِ شیون مرتبۂ ذات تک وصول کا نام ہے لہذا مقام شیون کو مواجہۂ ذات قرار دیا گیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اثرات: فنائے سر یہ ہے کہ سالک اس مقام میں اپنی ذات کو حق سبحانہ و تعالیٰ کی ذات میں مٹا ہوا پاتا ہے اور اسے ذات حق اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ذات نظر نہیں آتی، جب سالک ذات وصفات الٰہی میں فنا ہو جاتا ہے تو طعن و ملامت کی پرواہ نہیں کرتا اور نہ ہی کسی تعریف و توصیف کا خواہشمند رہتا ہے، صرف ذات حق میں مستغرق رہتا ہے۔

یہاں ایک نقطہ قابل غور ہے کہ تینوں چیزیں ہیں: ایک اللہ تعالیٰ کی ذات، دوسری اس کی صفات تیسری اس کی شیونات۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہم جانتے ہیں، دوسری اس کی صفات ہیں جن کے بارے میں مشائخ نے فرمایا ہے کہ **لا ھو ولا** غیرہ اور تیسری شیونات ہیں، شیونات جمع شان کی ہے۔

یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جب محبوب کا ہر روز ایک نیا جلوہ ہے تو محب کے دل میں محبت کا ایک نیا ولولہ ہے، اللہ تعالیٰ کے جلووں کی انتہا نہیں اور عاشق کے ولولوں کی انتہا نہیں۔ ایسے عاشق صادق کو ہزار سال کی عمر بھی دی جائے تو بھی بندگی سے نہیں تھکے گا، روز ایک نئ مستی ہو گی، ایک نیا لطف ہو گا، روز اس کے اندر اللہ کی عبادت کا ایک نیا جذبہ ہو گا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے جلوؤں کو شیونات کہتے ہیں۔ ان کا فیض سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو ملا، اب یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ جلوہ کا شکار تھے۔

(سبحان اللہ!) انبیاء علیہم السلام میں سے کس نے کہا کہ مجھے دیدار کرنا ہے، صرف موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے عرض کیا تھا، چونکہ بات کرنے کا موقع ملا تھا اور شیونات ذاتیہ کا فیض سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو لطیفہ ٔسر کے ذریعے سے ملا تھا اس مقام پر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا تھا کہ رَبِ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْکَ (الاعراف ۱۴۳) اور یہ مقام مقام مشاہدہ کہلاتا ہے۔

جن مشائخ نے غلبہ ٔحال میں کچھ الفاظ کہہ دیئے ہیں وہ اس مقام میں ہی کہے ہیں، جیسے بایزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا تھا: **سبحانی ما أعظم شانی**، انہوں نے اپنے آپ کو دیکھ کر نہیں کہا بلکہ وہ اللہ رب العزت کی طرف متوجہ تھے، اس لئے ایسی بات کہہ دی۔ منصور حلاج (حسین بن منصور) رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے **أنا الحق** کہنے سے مراد یہ نہیں تھا کہ ''میں خدا ہوں'' بلکہ منصور حلاج رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ''میں نہیں ہوں، صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے''۔ یعنی وہ اپنے آپ کو گم پاتے تھے۔ اس لئے کسی نے پوچھا کہ فرعون نے **انا ربکم الاعلیٰ** کہا تو ہلاک ہوا۔ اور منصور حلاج رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے **أنا الحق** کہا تو وہ اہل محبت کے نزدیک کامیاب ہوئے، اس کا کیا مطلب؟ دعویٰ تو ایک جیسا ہی ہے، تو جواب دیا گیا کہ فرعون نے **انا ربکم الاعلیٰ** کہا تھا اپنے آپ کو رکھنے کے لئے اور اللہ کو مٹانے کے لئے جب کہ منصور حلاج رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے **أنا الحق** اللہ کو رکھنے کے لئے اور اپنے آپ کو مٹانے کے لئے کہا تھا۔ چونکہ اپنے کو مٹانے کی نیت سے کہا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو عزتوں سے نوازا اور فرعون بدبخت کو اللہ تعالیٰ نے عذاب میں ڈالا۔ فنائے خفی کی علامت ظاہر کا مظاہر سے الگ ہونا ہے، یعنی حق باطل سے ممتاز ہو جاتا ہے اور وحدت کثرت سے ممتاز ہو جاتی ہے۔ فنائے اخفٰی کی علامت اللہ تعالیٰ کے اخلاق کو اختیار کرنا ہے، یعنی تمام رذائل اخلاق حسنہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس مقام پر انسان وَإِنَّکَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ (سورۃ القلم ۴) کے

مقام پر فائز ہو جاتا ہے جو آفاق و انفس میں ظاہر ہوتا ہے وہ ظلیت کے داغ سے داغ دار ہے، جو لطائف عالم امر کے ہیں یا عالم خلق کے،اس کو آفاق اور انفس کہا جاتا ہے۔

مکتوب امام ربانی رحمہ اللہ تعالیٰ دورانِ سلوک مشاہدات کے بارے میں متن

بعدازان مرتبۂ وُجوب کہ جامع صفاتِ کلیہ است ظاہر شد وبصورتِ زن غیر جمیلہ مُسوَدّاللون متمثل گشت وپس ازان مرتبۂ احدیت بصورتِ مرددرازِ بالاکہ بردیوارِ باریک پہن ایستادہ است متجلی گشت واین ہردو تجلی بعنوان حقانیہ ظاہر شدند بخلاف تجلیاتِ سابق کہ نہ باین عنوان بودند۔

ترجمہ: اس کے بعد مرتبۂ وُجوب جو کہ صفاتِ کلیہ کا جامع ہے ظاہر ہوا اور بدصورت سیاہ رنگ عورت کی صورت میں نظر آیا اور اس کے مرتبۂ احدیت ایک دراز قد آدمی کی صورت میں ظاہر ہوا جو کم عرض والی دیوار پر کھڑا ہوا اور یہ دونوں تجلیات حقانیت کے عنوان (سرنامہ) کی صورت میں ظاہر ہوئیں بخلاف سابقہ تجلیات کے کہ وہ اس عنوان کے ساتھ ظاہر نہیں ہوئی تھیں۔

شرح

اس مکتوبِ قدسی میں آپ رحمہ اللہ تعالیٰ نے دوران سلوک پیش آنے والے مشاہدات اور واقعات کا ذکر فرمایا ہے اور ساتھ ہی بعض طالبان طریقت کے باطنی حالات پر بھی تبصرہ فرمایا ہے چنانچہ آپ رحمہ اللہ تعالیٰ رقم طراز ہیں کہ قبل ازیں جو تجلیات مرتبۂ ممکنات میں ظاہر ہوئی تھیں، بندہ نے ان کا حال سابقہ مکتوبات میں عرض کر دیا ہوا ہے اب مرتبۂ وجوب کی تجلیات اور ان

کے مشاہدات کا بیان عرضِ خدمت ہے۔ مناسب ہے کہ پہلے تجلی کے مفہوم و ثبوت اور اس کی اقسام کا ذکر کیا جائے۔

تجلی کا مفہوم

تجلی کا لغوی معنی "ظاہر کرنا و ظاہر ہونا" ہے۔ اصطلاحِ صوفیاء میں اللہ تعالیٰ کی ذات ، صفات اور اسماء و افعال کا کسی شان یا رنگ، کیفیت یا حالت میں اظہار تجلی کہلاتا ہے۔

تجلی کا ثبوت

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کا رَبِّ أَرِنِي مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے تجلی فرمائی۔

فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ موسَى صَعِقًا (الاعراف ۱۴۳)

"پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنا نور چمکایا اسے پاش پاش کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام گرے بے ہوش۔"

حدیث پاک میں ہے:

أتاني ربي في أحسن صورة۔[6]

ترجمہ: حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میرا رب میرے پاس ایک اچھی صورت میں آیا۔

تجلیات لاتعداد ہیں

چونکہ اللہ تعالیٰ کے ظہور کی شانیں بے انتہاء ہیں لہذا تجلیات بھی لاتعداد ہیں۔ ہر شخص پر اس کی استعداد کے مطابق جداگانہ تجلیات ہوتی ہیں جو تجلی ایک شخص پر ایک مرتبہ ہوتی ہے وہ پھر دوبارہ اس پر یا کسی اور پر کبھی نہیں ہوتی کیونکہ تجلیات میں تکرار نہیں ہر دم، ہر لحظہ اور ہر آن وہ نئی نئی شان

---

[6] ترمذی ص ۱۵۶ ج ۲۔

میں تجلی فرماتا رہتا ہے۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمن ۲۹) جس طرح اس کی ذات لامتناہی ہے اسی طرح اس کی تجلیات بھی حد و حصر سے باہر ہیں۔

اے ترا بر طورِ دل ہر دم تجلائے دگر　　طالبِ دیدار تو ہر لحظہ موسائے دگر

اقسامِ تجلیات

ان لامتناہی تجلیات کا احاطہ و حصر قطعاً ناممکن ہے تاہم نمونہ کے طور پر چند تجلیات کا ذکر درج ذیل ہے۔

۱۔ تجلی آثاری

اس کو تجلی صوری بھی کہتے ہیں۔ سالک اس تجلی میں حضرت حق سبحانہ تعالی کو صورت تمثیلی میں دیکھتا ہے اور وہ جان بھی لیتا ہے کہ یہ تجلی اسی ذات وحدہ لاشریک کی ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام پر ابتداء میں تجلی بصورت نار ہوئی پھر بصورتِ شجر، انہوں نے یہ بھی جان لیا کہ اس صورت میں کون متجلی ہے۔ کبھی یہ تجلی خواب میں بھی ہوتی ہے لیکن محتاجِ تعبیر رہتی ہے۔ یہ تجلی کامل طور پر صورت انسان میں ہوتی ہے۔

۲۔ تجلی فعلی

اس تجلی میں سالک حق تعالیٰ کو صفاتِ فعلیہ ربوبیۃ میں سے کسی صفت کے ساتھ متجلی پاتا ہے اس مشاہدے میں سالک سے حول و قوت اور فعل و ارادہ سلب ہو جاتا ہے اور وہ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کو متصرف و جاری دیکھتا ہے۔

۳۔ تجلی صفاتی

اس تجلی میں سالک حق تعالیٰ کو امہاتِ صفات میں متجلی پاتا ہے۔ امہاتِ صفات آٹھ ہیں۔ ان کو صفاتِ ثمانیہ حقیقیہ بھی کہا جاتا ہے اور وہ یہ ہیں:

۱۔ تکوین	۲۔ حیات	۳۔ علم	۴۔ قدرت
۵۔ ارادہ	۶۔ سمع	۷۔ بصر	۸۔ کلام

تجلی ذاتی

اس تجلی میں سالک فانی مطلق ہو کر اپنے علم، شعور اور ادراک سے بے تعلق ہو جاتا ہے۔ عبد فانی ہو جاتا ہے اور حق باقی رہتا ہے۔ اسی فنائیت کے بعد بقاء باللہ کا مقام آتا ہے اس تجلی میں سالک اپنے آپ کو بلا تعین جسمانی وروحانی اطلاق کے رنگ میں پاتا ہے اور کمال توحید عیانی کا مشاہدہ کرتا ہے۔

مزید اقسام

ان کے علاوہ بھی تجلیاتِ غیر متناہیہ ہیں، حق سبحانہ وتعالیٰ جس صورت میں جس چیز کے ساتھ جس طرح اور جب جس پر چاہتا ہے ہر معقول، مفہوم، موہوم، مسموع و مشہود میں تجلی فرماتا ہے اور سالک انہیں تجلیات پر قانع نہیں رہتا بلکہ هَلْ مِنْ مَزِيدٍ (ق ۳۰) کی صدائیں بلند کرتا رہتا ہے۔

بعض صوفیاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے حسبِ ذیل تجلیات کی بھی نشاندہی فرمائی ہے۔

تجلی ظہوری، تجلی رحمانی، تجلی رحیمی، تجلی شہودی، تجلی جمادی، تجلی نباتی، اور تجلی حیوانی وغیرہا۔

حضرت امام ربانی قدس سرہ مرتبۂ وجوب میں سیر کے دوران پیش آنے والے واقعات وواردات کا بیان فرمارہے ہیں۔

مرتبۂ وجوب

یہ مرتبہ صفاتِ کلیہ کا جامع مرتبہ ہے اوردائرہ اصل سے تعلق رکھتاہے۔ یہ عارف کے لئے مشاہدے کا مقام ہے اوروہ اس رتبے میں صفاتِ حقیقیہ ثمانیہ کی سیر کرتا ہے۔

مشاہدہ

کسی امر کے استحضاراوریقینی تصور کا قلبِ سالک پر اس طرح غالب اور قوی ہو جاناکہ گویاوہ دل کی آنکھ سے اسے دیکھ رہاہے مشاہدہ کہلاتا ہے۔ جیساکہ حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

نکون عندرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یذکرنا بالنار و الجنۃ حتی کأنا رأی عین۔[7]

"ہم لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں جب دوزخ وجنت کا ذکر سنتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔"

وجوب کے مرتبے میں سالک کو دوقسم کا مشاہدہ ہوتا ہے کبھی صفات بدون تعلقات اس کی نظر میں بعنوانِ کلیت مشہود ہوتی ہیں اور کبھی صفات متعلق بہ معلومات ومقدورات بعنوانِ جزئیت نظر آتی ہیں۔

قسم اول

پہلی قسم کے مشاہدے کو شہودِصفاتِ کلیہ کا نام دیتے ہیں ۔ اس مرتبے میں صفاتِ مجردہ مشہود ہوتی ہیں ان کا ممکنات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

---

[7] مسلم ص ۳۵۵ ج ۲۔ رقم ۲۷۵۰۔

قسم دوم

دوسری قسم کو شہودِ صفاتِ جزئیہ کہا جاتا ہے اس مرتبے میں صفات کا ممکنات کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اور سالک مشاہدہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت علم فلاں معلوم کے ساتھ اور صفتِ قدرت فلاں مقدور کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ علی ہذا القیاس تمام صفات، ممکنات سے متعلق نظر آتی ہیں۔ سالکین کے نزدیک مشاہدے کی پہلی قسم (شہود صفات کلیہ) زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔

تجلیاتِ عالمِ وجوب

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ کو مرتبہ وجوب میں سیر باطنی کے دوران عالم وجوب کی تجلیات مختلف صورتوں میں نظر آئیں۔ مثلاً مرتبۂ وجوب بصورت سیاہ رنگ کی عورت کی شکل میں نظر آیا اور مرتبۂ احدیت ایک دراز قد آدمی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس کی معنویت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سالکین پر تجلیات کا نزول کبھی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی بے صورتی میں، کبھی کسی خاص کیفیت میں اور کبھی بے کیفی میں لیکن اس مرتبے میں کامل تجلی انسان کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے کیونکہ تنزیہہ اور تشبیہہ دونوں مرتبے توحید کے ہیں اور ان دونوں مرتبوں میں سالکین کو مشاہدہ نصیب ہوتا رہتا ہے۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے صراحت فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن قرآن کے ہر حرف کی صورت میں تجلی فرمائے گا۔

حضرت مولانا عبد الرحمان جامی قدس سرہ فرماتے ہیں:

اگر خواہد در ہر صورت از صور عالم
ظاہر گردد وا گر خواہد از ہمہ منزہ باشد۔[8]

---

[8] شرح مکتوبات قدسی آیات مکتوب ۱۴۔

اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو کائنات کی ہر صورت میں ظہور فرمائے اگر چاہے تو ہر صورت سے منزہ رہے۔

عنوان حقانیت

حضرت امام ربانی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ دونوں تجلیاں بعنوان حقانیت ظاہر ہوئیں جبکہ سابقہ تجلیات اس عنوان کے ساتھ ظاہر نہ ہوئی تھیں، عنوان حقانیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ تجلیاں اپنی حقیقت کے ساتھ مشہود ہوئیں اور انہیں اچھی طرح پہچان لیا گیا کہ ان کی اصل حقیقت کیا ہے یہ شناخت کامل استعداد والے اہل حال کے شہود سے مربوط ہے (عام درجے کے سالک اس استعداد کے مالک نہیں ہوتے۔) (واللہ تعالیٰ اعلم)

متن

ودرہمین اثناء آرزوئے موت پیدا شد وچنان درنظر آمد کہ من گویا شخصے ام برکنار دریائے محیط ایستادہ ام بارادۂ آنکہ خودرا در دریا اندازد امّا از عقب او را بریسمانے مضبوط کردہ اند کہ نمی تواند بدریا درون رفت وآن ریسمان عبارت از تعلقات بدن عنصری خود میدانستم وآرزو می کردم کہ این ریسمان گستہ شود وایضاً کیفیتے خاص روداد کہ درآن وقت بطریق ذوق دریافت کہ دل راہیچ پایستے غیر از حق سبحانہ نماندہ است۔

ترجمہ: اسی اثناء میں موت کی خواہش پیدا ہوئی اور ایسا نظر آیا گویا کہ میں ایک شخص ہوں جو دریائے محیط (بہت بڑے سمندر) کے کنارے اس ارادہ کے ساتھ کھڑا ہے کہ اپنے آپ کو دریا میں ڈال دے لیکن پیچھے سے اس کو ایک رسی سے ایسا مضبوط باندھ دیا گیا ہے کہ دریا میں گر ہی نہیں سکتا میں اس رسی سے مراد اپنے بدن عنصری کے تعلقات کو سمجھتا تھا اور خواہش کرتا تھا کہ وہ رسی

ٹوٹ جائے اور نیز ایک کیفیت یہ ظاہر ہوئی کہ اس وقت ذوق کے انداز پر مجھے معلوم ہوا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے سوا دل میں کوئی خواہش نہیں رہی۔

شرح

خواہش وصل

سطور بالا میں حضرت امام ربانی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ عالمِ وجوب کے مشاہدہ کے دوران مجھ پر موت کی آرزو غالب ہونے لگی اس آرزو کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عارف جب عالمِ وجوب کی نورانیت، قدسیت اور لطافت کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس پر وصل کی خواہش غالب آجاتی ہے لیکن جب حیات دنیاوی میں یہ وصل ممکن نظر نہیں آتا تو عارف لامحالہ موت کی آرزو کرتا ہے کیونکہ **الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب** یعنی موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست سے ملا دیتا ہے۔

آرزوئے موت

محبوبانِ خدا وصل کے شوق میں موت کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ خود سرورِ کائنات ﷺ نے شوق شہادت میں فرمایا:

والذي نفسي بيده لو ددت أني أقتل في سبيل الله، ثم أحيا، ثم أقتل، ثم أحيا، ثم أقتل، ثم أحيا، ثم أقتل [9]

یعنی مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے میری یہ تمنا ہے کہ میں خدا کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔

---

[9] البخاری رقم ۲۷۹۷ ج۴ ص ۱۷۔

دراصل عاشقوں کے لئے موت ذریعۂ وصل ہے اور عید نظارہ ہے۔ انہیں قاتل کی شمشیر میں ہلال عید کی تابانیاں نظر آتی ہیں وہ وصالِ دوست کے لئے زہر کو تریاق اور موت کو حیات سمجھتے ہیں۔ سلطان العشاق حضرت سیدنا بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر جب نزع کا عالم طاری ہوا آثارِ وفات نمودار ہوئے تو احباب واہل خانہ غمگین ہوگئے ان کی بیوی جب شدتِ اضطراب سے بے قرار ہوئیں تو بے ساختہ ان کے منہ سے یہ لفظ نکلے "وَاحَرَبَاہ" یعنی ہائے مصیبت، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ لفظ سن کر تڑپ اٹھے اور جلال میں آکر بولے "وَاطَرَبَاہُ غَداًاَلقٰی الاَحِبَّةَ مُحَمَّداً وَصَحبَہٗ"[10] فرمایا تم یہ ہرگز نہ کہو "وَاحَرَبَاہ" یعنی ہائے مصیبت، بلکہ یہ کہو "وَاطَرَبَاہُ" (واہ خوشی) کیونکہ میں اپنے محبوب آقا ﷺ کے دیدار اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی ملاقات کے لئے جارہاہوں یہ مصیبت اور غم کا موقع نہیں بلکہ مسرت وشادمانی کا مقام ہے۔

آج پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسیؔ قبر کی رات ہے اس گُل سے ملاقات کی رات

اسی لئے عارفانِ ذات موت سے ڈرتے ہیں نہ گھبراتے ہیں بلکہ والہانہ شوق کے ساتھ مسکراتے ہوئے موت کا استقبال کرتے ہیں۔

نشانِ مردمومن باتوگویم چو مرگ آید تبسم برلب

جب کسی صاحبِ حال بزرگ پر شوقِ وصال اور لذتِ جمال کی اضطرابی کیفیت طاری ہوتی ہے تو کبھی نیم جان ہوکر یوں فریاد کرتے ہیں۔

امروز دیگرم درانتظار توشام شد درانتظارِ وصلِ تو عمرم تمام شد

آمد نمازِ شام ونہ آمد نگارِ من اے دیدہ پاسدار کہ خوابم حرام شد

(سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ)

---

[10] زرقانی ص ۳۱۸ ج ۶۔

اور کبھی بادیدۂ پرنم اور بادلِ پُر غم اپنے جذبات قلبی کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

خودکشی ہے معصیت ہستیِ حجابِ روئے دوست
نو گرفتارِ محبت ہائے کس مشکل میں ہے

حضرت امام ربانی مجددالف ثانی قدس سرہ شوقِ وصل اور سوزِ فصل کی انہی ملی جُلی کیفیات سے سرشار ہوکر اپنے مرشدِ برحق کی بارگاہ میں عرض گزار ہیں کہ ''آرزوئے موت پیدا شد'' یعنی وصالِ الٰہی کی حقیقی لذتوں سے شادکام ہونے کا شوق اس قدر بڑھ چکا ہے کہ اب اس دنیا میں رہنے کی بجائے آخرت کی آرزو غالب آگئی ہے۔

بینات

- دریائے محیط (بڑے سمندر) سے مرادعالمِ وجوب کی وسعت کا مشاہدہ ہے۔
- رسی کے ساتھ مضبوط باندھے ہونے کا مطلب روح کے ساتھ بدنِ عنصری کے تعلقات ہیں۔
- دریا میں نہ گرنے اور رسی نہ ٹوٹنے سے مراد یہ ہے کہ روح ابھی جسمانی تعلقات سے کلیۃً آزاد نہیں ہوئی یعنی روح اگرچہ عالمِ وجوب کے مشاہدے میں مصروف ہے لیکن حیاتِ ظاہری ابھی اتصالِ روح کی راہ میں حجاب ہے۔
- آپ قدس سرہ کا یہ ارشاد کہ ''کہ ذوق کے انداز پر مجھے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دل میں کوئی خواہش نہیں رہی'' اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ مشاہدہ مذکورہ کے بعد آخر میں آپ قدس سرہ کو فنائے حقیقی حاصل ہوگئی اور آپ قدس سرہ نے وصلِ حقیقی کا مرتبہ پالیا۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

۱۵)نیت مراقبہ اصل خفی:

سالک اپنے لطیفۂ خفی کو آں سرورِ عالم ﷺ کے لطیفۂ خفی کے مقابل تصور کرکے زبان حال سے بارگاہ الٰہی میں التجاء کرے اور یہ نیت کرے:

الٰہی خفی من بمقابل خفی نبی علیہ السّلام،آن فیض تجلّائی صفات سلبیہ خود کہ از خفی نبی علیہ السّلام بہ خفی عیسیٰ علیہ السّلام رسانیدہ بہ خفی من نیز برسانی بواسطہ پیران کبار رحمۃاللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ توقف۔۔۔۔روز

صفات سلبیہ کا مطلب یہ ہے کہ حق سبحانہ و تعالیٰ تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے وہ جسم و جسمانی، عرض وجوہر، مکان وزمان، حال و محل، محدود و متناہی ہونے سے بھی پاک ہے، وہ بے جہت، بے کیف، بے نسبت و بے مثل ہے۔ اس طرح ضد و ند، ہمسر و مثل ہونا اس کی پاک بارگاہ سے مسلوب و مفقود ہے۔ وہ ماں باپ، زن و اولاد سے پاک ہے، کیونکہ یہ سب حدوث کے نشانات ہیں اور ان سے نقص لازم آتا ہے، تمام قسم کی صفات کمال حق تعالیٰ کی جناب کے لئے ثابت ہیں اس لئے امکان وحدوث کی صفات سراسر نقص وشرارت ہیں یہ سب جناب پاک سے مسلوب سمجھنے چاہیئیں۔

صفات سلبیہ کا فیض حاصل ہونے کی علامات یہ ہیں کہ بندے کے اندر سے بشری صفات سلب ہوجاتی ہیں اور اس میں ملکوتی صفات سرایت کر جاتی ہیں، اس مقام پر ہمارے بعض بزرگوں سے یہ سنا گیا ہے کہ **یطعمنی ربی و یسقینی** میرا رب ہی مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے، اس لئے کہ ان کی بھوک ہی ختم ہو جاتی ہے۔ احادیث مبارکہ میں وارد ہے کہ قرب قیامت میں ایک وقت آئے گا کہ ایمان والے **سبحان اللہ، سبحان اللہ** پڑھیں گے اور ان کی بھوک جاتی رہے گی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ ان کو یہ نعمت عطا فرمائیں گے، ان کے اندر سے بشریت کے تقاضے نکال لئے جائیں گے، چنانچہ ہمارے اکثر

مشائخ کا کھانا پینا بالکل کم ہوتا ہے، ساری ساری رات عبادت کرتے ہیں مگر تھکنے کا نام نہیں لیتے، اس لئے کہ اُن میں روحانی قوت آجاتی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت خواجہ سراج الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حج پر تشریف لے گئے، تیرہ دن مکہ مکرمہ میں مقیم رہے، نہ کھایا، نہ پیا، نہ ہی قضائے حاجت۔ پوچھنے پر فرمایا کہ "میں کالا کتا اس پاک دیس کو کیسے ناپاک کروں؟" تیرہ دن کے بعد حج کر کے واپس آگئے۔ اس لطیفہ ُخفی کے سبق پر انسان میں یہ صفات آجاتی ہیں، پھر کھانے پینے کی بھی اس کو محتاجی نہیں رہتی۔ چنانچہ ہمارے بزرگوں کے حالات زندگی میں ہے کہ وہ فرماتے تھے، "میں تو سنت سمجھ کے کھاتا ہوں، ورنہ مجھے کھانے کی کوئی ضرورت نہیں رہی"۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہمت دے دیتے ہیں، ایک محدث نے اپنے شیخ کے متعلق لکھا ہے کہ رمضان میں سحری میں دو فنجان چائے پینے کا معمول تھا، اس کے باوجود مستقل ساری ساری رات عبادت فرماتے تھے، اصل میں ان میں یہ ملکوتی صفات آجاتی تھیں۔ ایسے موقع پر سالک کو سلبی توجہات ملتی ہیں۔ لہٰذا وہ کسی کمال کا انتساب اپنی ذات کی طرف نہیں کرتا۔

امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے لکھا ہے کہ سالک اپنے آپ کو فاسق، فاجر اور کافر فرنگ سے بھی بدتر سمجھے، وہ بات اس سبق پر آکر سمجھ میں آتی ہے کہ جب سالک کوئی کمال اپنی طرف منسوب ہی نہیں کرتا، سب لوگ اسے اپنے آپ سے اچھے نظر آتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہاں تک فرمایا کہ سالک اپنے آپ کو کافر فرنگ سے بھی کم تر سمجھے، پڑھنے والے کو یہ بات عجیب لگتی ہو گی لیکن اس سبق کو کرنے کے بعد اس میں کوئی عجیب چیز نظر نہیں آتی، اس لئے کہ کمال سب کمال والے کا ہے۔

اثرات: اس لطیفے کی فنا یہ ہے کہ سالک اس مقام میں حق سبحانہ و تعالیٰ کو تمام عالم سے ممتاز و منفرد پاتا ہے اور جمیع مظاہر سے مجرد و یگانہ دیکھتا ہے۔

ہر سالک کے لئے یہ لازم ہے کہ یہ یاد کرے

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی تین اقسام ہیں:

(۱) **صفات ذاتی حقیقی:** جو کہ آٹھ ہیں: حیات، علم، کلام، قدرت، ارادہ، سمع، بصر، تکوین۔

(۲) **صفات سلبیہ:** جیسا کہ **لیس کمثلہ شئی لم یلد و لم یولد و لم یکن لہ کفواً احد لا یاکل و لا یشرب و لا یموت و لا ینام۔**

(۳) **صفات فعلیہ:** جنہیں صفات اضافی بھی کہا جاتا ہے: خالق، رازق، محی، ممیت، رؤف، رحمٰن، رحیم، کریم، منان۔[11]

امام اہل سنت علامہ ابو شکور محمد بن عبد السعید سالمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب تمہید میں صفاتِ الٰہیہ کا تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں

مہتدی ابو شکور سالمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے، قدیم ہے، اپنی صفات کے ساتھ موصوف ہے۔

اور یہ کہنا جائز نہیں کہ قدیم مع صفاتہ، اس لئے کہ "**مع**" کا لفظ دو چیزوں کے درمیان مقارنت کے لئے آتا ہے اور صفت موصوف کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں کہ یوں کہا جائے صفت و موصوف علیحدہ علیحدہ دو چیزیں ہیں۔

---

[11] تسکین السالکین، ص ۱۹۳، ۱۹۴

سوال: اگر کوئی کہے کہ صفت شئے ہے؟ یا غیر شئے؟ پس اگر ہم کہیں کہ صفت شئے نہیں تو موصوف "لا شئے" کے ساتھ کیسے موصوف ہو گا؟ اور اگر کہیں کہ صفت بھی شئے ہے اور یہ شئے غیر موصوف ہے تو پھر یہ جائز نہیں کہ یہ بھی قدیم ہے۔

جواب: یہ ہے کہ صفت شئے ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ شئے ہے یا غیر شئے ہے۔

سوال: یہ ہے کہ صفت قدیم ہے یا غیر قدیم؟

جواب: یہ ہے کہ صفتِ قدیم ہے، اس لئے کہ ذات موصوف ہے وہ قدیم ہے، اپنی صفات کے ساتھ اور یہ کہنا جائز نہیں کہ صفات قائم بذاتہ ہیں لیکن ہم یہ کہیں گے کہ اس کی ذات موصوف بصفاتہ ہے اور یہ کہنا جائز نہیں کہ اس کی صفات قائم بذاتہ ہیں موصوف بالوصف ہے، بلکہ ہم کہیں گے کہ وہ موصوف بالصفت ہے اس لئے کہ وصف واصف کی صفت ہے اور وہ موصوف ہے، قبل اس کے کہ اس کی صفت بیان کرے اور یہ کہنا بھی جائز نہیں کہ وہ قدیم بجمیع صفاتہ ہے اس لئے کہ جمع اور افتراق اس کی صفات میں جائز نہیں، تو ہم یوں کہیں گے کہ قدیم بصفاتہ ہے اور بعض لوگوں نے صفات ونعوت کا بالکل انکار کر دیا، انہوں نے کہا کہ صفت ونعت وہ ذات باری تعالیٰ تو ہیں نہیں ضروری ہوا کہ ذات کا غیر ہوں اور جب غیر ہوں گی تو یا قدیم ہوں گی یا حادث و محدث اور یہ نہیں ہو سکتا کہ حادث و محدث ہوں اس لئے کہ پھر یہ کہنا پڑے گا کہ حادث و محدث قدیم میں حلول کیے ہوئے ہیں اور یہ کفر ہے۔

اور معتزلہ نے کہا کہ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ صفت ونعت قدیم ہیں اس لئے کہ اگر صفات قدیم ہیں تو پھر یہ کہنا واجب ہو گا دو یا تین یا اس سے بھی زیادہ قدیم ہیں اور یہ "**تعدد قدماء**" محال ہے انہوں نے پھر کہا کہ اللہ تعالیٰ حی، قادر، علیم، سمیع، بصیر، مرید بذاتہ ہے۔

معتزلہ نے مزید کہا کہ یہ جائز نہیں کہ اس لئے کہ وہ اِلٰہ ہے، رب ہے، صانع ہے، اور جب صانع کا عالم ہونا ثابت ہو گیا تو یہ مقتضی ہے کہ تمام اشیاء کو جانے اور تمام احوال کو تمام اوقات اور تمام اماکن (جگہوں) کو جانے اور جب وہ تمام اشیاء کو جانتا ہے تو تمام اشیاء اس کی معلوم ہوئیں اور بغیر علم کے ناممکن ہے کہ شئے عالم کی معلوم بنے، اس لئے کہ معلوم مقتضی علم ہے، لا محالہ تو ثابت ہوا کہ علم سے اس کا معلوم ہے۔ پس واضح ہو گیا کہ نفیٔ علم مستلزم ہے نفی عالم کو اور اثبات علم اثباتِ عالم کو مستلزم ہے، اللہ تعالیٰ پر تو ہم نے کہا کہ صحیح ہے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے عالم وقوف علم جب معلوم پر ہوتا ہے تو معلوم اس کا معلوم بنتا ہے اور جب علم ہی نہ ہو گا تو معلوم بغیر وقوف کیسے معلوم بن جائے گا؟ اور جب معلوم پر وقوف علم نہ ہوا تو وہ کسی شئے کو نہ جانے گا تو ثابت ہوا کہ عالم کا علم جب معلوم پر واقفیت پاتا ہے تو وہ معلوم بنتا ہے اور جب وقوفِ علم علی المعلوم نہ ہوا، عالم نہ ہوا اور جب عالم نہ ہوا تو صانع نہ ہوا اور یہ محال ہے۔[12]

اعتراض: اگر کہا جائے باری تعالیٰ جل شانہ تمام اشیاء کو بالذات جانتا ہے اور تمام معلومات اس کے معلوم بذاتہ ہیں تو کہنا یہ ہے کہ ذات عالم ہے تو نفی صفات موجب نفی ذات نہ ہوئی۔

جواب: ہم جواب میں کہیں گے کہ عالم اگر تمام اشیاء کو بالذات جانتا ہے تو معلومات اس کے بالذات ہوئے تو ذات علم ہو گی اور علم ہی ذات ہو گی، اس لئے کہ معلوم معلوم نہیں ہوتا بغیر اس پر وقوف کے اور بغیر علم کے تو ہر وہ شئے کہ جس کے ساتھ معلوم کا وقوف ہو وہ عالم ہے۔ پھر اگر کہا جائے کہ صانع صفت سے موصوف ہے تو یہ کہنا پڑے گا کہ دو، تین یا اس سے بھی زیادہ

---

[12] تو ثابت ہوا کہ جب عالم کا علم معلوم پر واقفیت پالیتا تو وہ معلوم بن جاتا ہے اور جب وقوف العلم علی المعلوم نہ ہو گا تو وہ عالم نہ ہو گا اور جب عالم نہ ہو گا تو صانع نہ ہو گا اور یہ باطل ہے۔ (ابو البرکات)

قدیم ہیں، اس لئے کہ صفت حادث و محدث تو ہو نہیں سکتی اور اگر ہم کہیں کہ قدیم ہے تو اس صورت میں دو، تین اور اس سے بھی زیادہ قدیم ثابت ہو جائیں گے۔

ہم نے کہا کہ یہ لازم نہیں آتا، اس لئے کہ ہم نے تو یہ کہا ہے کہ صفت موصوف کا غیر نہیں ہے کیونکہ صفت عرض نہیں اور جب عرض نہیں تو موصوف کا غیر کہنا صحیح نہیں اور موصوف کا غیر نہیں تو اس کے ثابت کرنے میں دو تین قدیموں کا ثابت کرنا لازم نہیں آتا کبھی ہوتا ہے کہ صفت صفت ہو اور عرض نہ ہو جیسے کہ یہ جائز ہے کہ ذات موجود ہے اور جوہر نہیں تو جب ذات جوہر نہیں ہو سکتی تو صفت عرض نہیں ہو سکتی تو صفت کے قدیم ماننے سے متعدد قدیموں کا ماننا لازم نہیں آیا۔ حیات یا قدرت یا علم یا سمع یا بصر ہو کیونکہ یہ اشیاء اس کے لئے ان صفات سے موصوف ہونے کی علت ہو جائیں گی اور یہ جائز نہیں کہ اس کے لئے علت ہو یا اس کی صفت علت پھر دو حال سے خالی نہیں یا موصوف ہو گا یا غیر ہو گا اور یہ دونوں حال محال ہیں۔

اہل سنت و جماعت کا مسلک

اور اہل سنت و جماعت نے کہا کہ اللہ تعالیٰ موصوف و منعوت ہے ازل سے ابد تک یعنی ہمیشہ سے موصوف و منعوت ہے اور ہمیشہ موصوف و منعوت رہے گا پھر ہم (اہل سنت و جماعت) کہتے ہیں کہ صفات باری میں ذات ہیں اور نہ غیر ذات بلکہ اس کی یہ صفات ہیں اس کا بیان یہ ہے کہ صفت اگر غیر موصوف ہے تو بذاتہ قائم ہو گی، اس لئے کہ شئے جب کسی شئے کے ساتھ قائم ہو گی تو اس کے ساتھ تمکن (جگہ اور گنجائش نکال کر) اور حلول کے ساتھ قائم ہو گی جیسے عرض جوہر میں ہوتی ہے اور جس کے لئے حلول و تمکن جائز ہو گا تو انتقال اور نزول بھی جائز ہو گا اور یہ حادث کی صفت ہوتی ہے تو ثابت ہوا کہ صفت موصوف کا غیر نہیں اور لیکن ہم نے جو کہا کہ صفت موصوف نہیں اس

لئے کہ اگر صفت وہی موصوف ہے تو یہاں تک پہنچا دے گا کہ دو خدا ہوں یا تین یا زیادہ اس لئے کہ موصوف صانع ہے اور وہ علم قدرت حیات وغیرہا صفات کے ساتھ موصوف ہے تو جب صفت موصوف ایک ہوئے تو صفت صانع ہو جائے گی تو پھر علم بھی صانع حیات بھی صانع، قدرت بھی صانع اور ہر صفت علیحدہ علیحدہ صانع ہوگی اور یہ محال ہے تو پھر صحیح ہوا کہ صفات عین موصوف نہیں ہے اور نہ وہ غیر موصوف ہیں اس معنیٰ کے اعتبار سے ہم نے کہا کہ صفت ذات نہیں اور نہ صفت غیر موصوف ہے۔

معتزلہ اور مسئلہ صفات باری تعالیٰ

معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی صفت نہیں تو ہم کہیں گے کہ صفت کی نفی کرنا موصوف کی نفی کرنا ہے، اس لئے کہ صانع اگر عالم نہیں تو وہ اشیاء اور احوال کو بھی نہیں جانتا اور جو کسی شئے کو پیدا کرے اور وہ نہیں جانتا کہ کس کو پیدا کیا؟ اور وہ موصوف بالجہل ہوگا اور موصوف بالجہل صانع نہیں ہو سکتا تو یہ محال ہے۔ پس ضروری ہوا کہ صانع، عالم ہو تا کہ جائز و صحیح ہو۔ میں نے کہا: جب وہ ایسا فعل کرے جو سقوط عدالت کا موجب ہے تو وہ فاسق ہو گیا۔ پھر اللہ عزوجل اس پر وحی نازل فرمائے، اسی فسق کی حالت میں تو وہ ایک فاسق آدمی پر نازل ہوگی تو معاذاللہ رسول فاسق ہوا، میں نے یہ بھی کہا کہ جو شخص "لاالہ الااللہ" پڑھتا ہے اور اعتقاد اس کے خلاف ہے، اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا: وہ مؤمن ہے۔

میں نے کہا: تمہارا دین نہیں ہے مگر یہ کہ تمہارا رب ناقص اور رسول فاسق اور مؤمن منافق اور سنو! اللہ تعالیٰ و رسول (ﷺ) ان خرافات سے پاک و منزہ ہیں تو وہ متحیر ہو گیا اور چپ رہا، کلام

نہ کرسکااس لئے کہ باطل حق کامقابلہ نہیں کرسکتا۔"الحق یعلو ولا یعلی"حق غالب ہوتاہے، مغلوب نہیں ہوتا۔

توان دلائل سے ثابت ہواکہ صفت نہ عین ذات ہےاورنہ غیرذات اورجب یہ بات "علم"(صفت علم)میں ثابت ہوگئی توجمیع صفات میں بھی ثابت ہوگئی جیسے قدرت، حیات، سمع، بصروغیرہ میں کہ نہ یہ عین ذات ہیں نہ غیرذات۔واللہ اعلم۔

دوسرا قول

صفات ذاتیہ اور صفات فعلیہ کا بیان

ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ صفات ذاتیہ قدیم ہیں اوروہ درج ذیل آٹھ صفات ہیں: حیات، قدرت، علم، کلام، سمع، بصر، ارادہ، قدم اوران کے سواتمام صفات مقتضیات قدرت وعلم ہیں اورجو تحت قدرت ہیں وہ سب صفات فعلیہ ہیں،حادث ہیں۔

متقشفہ کا مسلک

متقشفہ جوکرامیہ کاایک گروہ ہے، کہتاہے کہ صفات ذاتیہ قدیم ہیں اوروہ پانچ ہیں: حیات، قدرت، علم، سمع،بصراوران کے سوانعوت ہیں، صفات نہیں اوریہ محدث ہیں اوربعض نے کہاکہ حادثہ ہیں اوریہ عقیدہ کفرہے، محال ہے۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے زعم کے مطابق ان صفات کے حدوث سے پہلے ناقص ہوگااوران صفات کے حدوث کے بعدکامل ہوگااورصفت زائدہوگی اورجس کایہ عقیدہ ہوکافرہے۔اس لئے کہ حدوث واحداث موجب تغیرہے کہ ایک صفت دوسری صفت کی طرف متغیرہوجائےاورایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھرجائےاوراللہ تعالیٰ جل مجدہ پرتغیرجائزنہیں۔

مصنف کا حشویہ سے مناظرہ

امام مہتدی ابو شکور سالمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حشویہ فرقہ (جو کرامیہ میں سے ہے) کے ساتھ مناظرہ کیا، میں نے ان سے کہا: صانع اوراس کی صفات فعلیہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا: وہ حادثہ محدثہ ہیں۔ میں نے کہا کہ صانع اس صفت کے حدوث سے پہلے ناقص ہوگا اور یہ محال ہے۔

دوسرا سوال میں نے انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں کیا۔ میں نے پوچھا: بتاؤ! انبیاء کرام علیہم السلام وحی سے قبل معصوم تھے یا نہیں؟ اس نے کہا: قبل وحی نبی ہی نہ تھے اور نہ ہی ان چیزوں سے معصوم تھے جن سے عدالت ساقط ہوجاتی ہے۔

تحقیق مسئلہ

مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تخلیق کائنات سے پہلے بھی تھا اور اب بھی ویسا ہی ہے جیسا تھا، نہ گھٹا، نہ بڑھا تو بے شک ابتدائے آفرینش میں بھی وہ اس صفت کا مستحق ہے، پیدا کرنے سے پہلے بھی مستحق تھا اور وہ یہ کہ اگر ہم یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات کے وجود سے خالق نہ تھا تو یہ مقتضی ہوگی اور چاہے گی کہ بندوں کے معرض وجود میں آنے سے پہلے وہ معبود بھی نہ ہو اور بندوں کے موجود ہونے سے پہلے "الٰہ" بھی نہ ہو اور مرئیات (دکھائی دینے والی اشیاء) کے وجود سے پہلے وہ بصیر بھی نہ ہو اور معلومات کے پائے جانے سے پہلے وہ عالم بھی نہ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی نفی واجب ہوگی اور یہ صریح کفر ہے۔

اعتراض: اگر کہا جائے کہ جب تک فعل کا ثبوت نہ ہو، اس صفت کے ساتھ کسی کو موصوف نہیں کیا جاسکتا جیسے جولاہا (بافندہ) یا درزی اور اسی کی مانند جب تک سینا نہیں سیکھتا اور یہ عمل نہیں کرتا، اس کو اس صفت (سینے یا بننے) سے موصوف نہیں کریں گے۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ جب اس نے درزی کا کام سیکھا اور یہ کام جانتا ہے مگر کام ترک کر دیا تو اس کو درزی کہا جائے گا، اسی صفت اور نام سے اس کو یاد کیا جائے گا، اس لئے کہ وہ اس کام کی قدرت اور علم رکھتا ہے، اسی طرح صانع عالم جل شانہ (جہاں کا پیدا کرنے والا) عالم قادر تھا جب کہ مخلوق ابھی پیدا نہ ہوئی تھی۔

ایسی ایک مثال دیکھیں کہ اگر کوئی مارنے کے لئے تلوار بنائے تو قطع وضرب (کاٹنے اور مارنے) سے پہلے اس کو ضارب و قاطع کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں ضرب وقطع (مارنے اور کاٹنے) کی صلاحیت ہے تو ایسے یہاں سمجھ لیجئے کہ کسی چیز کو پیدا کیا یا نہ کیا، وہ ہمیشہ سے خالق ہے۔

اعتراض: اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے خالق ہے تو یہ مقتضی ہے کہ مخلوق بھی ہمیشہ سے ہو؟ اس لئے کہ صفت خالقیت تخلیق سے ہے تو لامحالہ تخلیق کا تقاضا ہے کہ مخلوق پائی جائے تو عالم ودہر کا قدیم ہونا لازم آئے گا اور یہ محال ہے کہ عالم ودہر قدیم ہو۔

جواب: یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے جو تم نے ذکر کیا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ صفت خالقیت کے ساتھ موصوف ہے۔

تیسرا قول

اس کا بیان کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے خالق ہے

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے خالق ہے، وہ صفت خالقیت اور دیگر صفاتِ ذاتیہ اور صفات فعلیہ سے موصوف ہے۔

اشعریہ اور کرامیہ کا مسلک

اشعریوں اور کرامیوں نے کہا کہ جب تک مخلوق کو پیدا نہ کرے وہ خالق نہ ہوگا اور یہ کفر ہے۔

اور ہم (اہل سنت وجماعت) کہتے ہیں باری عزّ اسمہ، خالق ہے اور ہمیشہ سے صفت خالقیت سے موصوف ہے، اس طرح تمام صفات مثلاً صفت خالقیت، رزاقیت وغیرہ سے موصوف ہے، مخلوق کے پیدا کرنے سے پہلے بھی خالق اور اب بھی خالق ہے، اس لئے خالق فاعل وصانع کا موصوف ہونا قادر وعالم ہونا اور مرید ہونا ضروری ہے کہ وہ عاجز نہ ہو اور جو صفت کو جانتا ہے اور بنانے پر قادر ہے، اگرچہ اس نے اپنی صفت کا اظہار نہ کیا ہو اس کو اس صفت سے موصوف ماننا ضروری ہے، خصوصاً جب کہ وہ صیغہ مخصوص ہو اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں تکرار نہیں ہوتی کہ ہم یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک یہ کام کیا اور اس سے فارغ ہو کر دوسرا کام شروع کیا اور جب وہ کسی صفت کا اظہار کرے تو اس کو موصوف مانا جائے اور جب صفت کا ظہور نہ ہو تو اس کو موصوف نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ اس سے منزہ وپاک ہے، اس کو شغل وفراغت کے ساتھ موصوف کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس کو تکرار واعادہ ایسی صفات سے موصوف کیا جاسکتا ہے۔

ہم یوں کہیں گے: اللہ تعالیٰ فاعل ہے، ایک ہی فعل سے اور جمیع مفعولات ایک ہی فعل کے مفعول ہیں اور یہ فعل اس سے زائل نہیں ہوا کہ دوسرا فعل پیدا ہوا اور تمام صفات اسی طرح

ہیں۔"اللہ لایشغلہ شان عن شان" یہاں تک کہ اگر اس نے ایک ساعت یا ایک لمحہ میں کسی کو پیدا کیا، کسی کو بخش دیا، یا کسی کو زندہ کیا، کسی کو مارا، کسی کو رزق دیا تو اس کی تمام صفات اثر کرتی ہیں بغیر شغل و فراغ کے، یہ صفات اس کی مراد ہوتی ہیں، اس لئے کہ وہ اسی ساعت میں موصوف بجمیع صفات ہے اور جب اس کو اس صفت سے فراغ نہیں تو پھر زوال صفت واجب نہیں ہوتا، اس لئے کہ وہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف متغیر نہیں ہوتا، لیکن تاثیر صفت اس وقت ظاہر ہوگی جب وہ پیدا کرلے گا اور تخلیق سے قبل خالقیت ہے، تاثیر کا ظہور نہیں ہے۔ اسی طرح صفت صانع کو سمجھنا چاہیئے اور دلیل یہ ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاللّٰہُ سَرِیعُ الْحِسَابِ (البقرۃ ۲۰۲) اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت سرعت حساب بیان فرمائی ہے اور حساب قیامت میں ہوگا تو حساب سے قبل اسم صفت کا اثبات صحیح ہوا تو ایسے صفت خالقیت خلق (پیدا کرنے) سے قبل ثابت کرنا جائز ہے۔

مناظرہ

ابو شکور سالمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک اشعری سے مناظرہ کی روئیداد

حضرت ابو شکور سالمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ایک اشعری سے میرا مناظرہ ہوا، اس نے کہا: تمہارا وضو اور نماز کیا ہے؟ سنو! تمہارے ہاں وضو اور نماز یہ ہے کہ ایک شخص پرنالہ کے نیچے بیٹھ جائے اور چہرہ، دونوں ہاتھ، سر اور دونوں پاؤں تر ہو جائیں تو پھر اٹھ کر کبوتر کی بھیٹ بچھائے اور اس پر کھڑا ہو جائے اور فارسی زبان میں کہے: اے خدائے بزرگ یعنی "اللہ اکبر" اور فارسی میں ایک آیت پڑھے اور کہے "دوبرگ سبز" یعنی "مدھامتان" پھر رکوع و سجود خاموشی سے کرے اور مقدار تشہد بیٹھ جائے اور بیٹھے بیٹھے گوز مارے (ہوا خارج کردے)، یہ تمہاری نماز ہے۔

ابو شکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ بات دراصل اس (شعری) نے سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے اصحاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) پر طعن کے طور پر کہی۔ میں نے اس کو جواب دیا کہ تم عقیدہ رکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کے پیدا کرنے سے قبل خالق نہ تھا، نہ رازق تھا، نہ معبود تھا اور اسی طرح مخلوق سے پہلے نہ گناہ بخشنے والا تھا اور نہ ثواب عقاب دینے والا اور رسول معاذاللہ نہ اب رسول ہے، نہ قبل وحی رسول تھا اور مؤمنین کا گناہ ایمان سے کم ہو جاتا ہے اور معبود تم جس کو معبود کہتے ہو تو معبود رب نہ تھا، اب مخلوق پیدا ہونے کے بعد وہ معبود ہے اور رسول رسول نہ تھا، پھر رسول ہوا ازاں بعد معزول ہو گیا اور مؤمن کے ہنسنے سے اس کا ایمان کم ہو گیا، اسی قدر کافی ہے عبادت سے۔

چوتھا قول

اللہ تعالیٰ کے علم کا بیان

جہمیہ جو معتزلہ ہی کی ایک شاخ ہے، کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرنے سے پہلے کسی شئے کو نہیں جانتا اور وہ معدوم بھی نہیں جانتا اور وہ معدوم کو بھی نہیں جانتا، یہ کفر ہے اس لئے کہ اگر وہ پیدا کرنے سے پہلے اشیاء کو جانتا نہیں تو جب وہ کسی شئے کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو کس طرح پیدا کرے گا اور کیسے جانے گا کہ اس کو پیدا کروں اور کتنی پیدا کروں اور کب پیدا کروں اور کیسے پیدا کروں؟ تو اس عقیدہ میں خدا کا الوہیت سے معطل ہونا لازم آتا ہے اور یہ کفر ہے اور صحیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عزوجل کامل طریقے سے ہر چیز کو جانتا ہے، پیدا کرنے سے پہلے ہو خواہ بعد اور تمام معدومات وموجودات کو جانتا ہے۔

ہمارا یہ کہنا کہ موجودات کو پورے اکمال واتمام کے ساتھ جانتا ہے، اس میں تو کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

اور ہمارا یہ کہنا کہ وہ معدوم کو بھی جانتا ہے یعنی من حیث المعدوم جانتا ہے کہ یہ معدوم ہے اور وہ جانتا ہے کہ معدومات میں سے کون عدم سے وجود میں آئے گی اور وہ کیسی ہوگی؟

اللہ تعالیٰ معدوم کو بھی جانتا ہے

دلیل: یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ معدوم کی خبر نہ دیتا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے معدوم کی خبر دی ہے اور یہ بھی خبر دی ہے کہ وہ معدوم جب موجود ہوگا تو اس کی کیفیت کیا ہوگی چنانچہ فرمایا۔

إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ (الحج ۱)

بیشک قیامت کا زلزلہ بڑی سخت چیز ہے۔

وَتَرَى النَّاسَ سُكَارَى وَمَا هُمْ بِسُكَارَى وَلَكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ (الحج ۲)

اور تو لوگوں کو دیکھے گا جیسے نشہ میں ہیں اور نشہ میں نہ ہوں گے مگر ہے یہ کہ اللہ کی مار کڑی ہے۔

اور اپنے رسول مکرم صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو خبر دی تو فرمایا:

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ (الفتح ۲۷)

بیشک تم ضرور مسجدِ حرام میں داخل ہوگے اگر اللہ چاہے امن وامان سے۔

تو جیسے خبر دی ویسے ہی ہوا اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اشیاء کو وجود میں لانے سے پہلے جانتا ہے اور یہ بات مخلوق میں بھی پائی جاتی ہے مثلاً انسان ذکر کرتا ہے ایک محل کا کہ اس کا طول و عرض اتنا ہوگا، اس کا صحن، اس کی دیواریں، اس کی چھت، اس کے دروازے ایسے ہوں گے، حالانکہ

اس محل کا ابھی وجود نہیں، پھر جب محل تیار ہو جاتا ہے تو اس معدوم کے مطابق محل موجود ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حق میں بطریقِ اولیٰ ہو گا یعنی اشیاء کے وجود سے پہلے اس کو علم ہوتا ہے۔

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللهُ۔(النمل ٦٥)

تم فرماؤ خود غیب نہیں جانتے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں مگر اللہ۔

سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد مبارک

امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے جواب میں فرمایا: اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے عالم تھا اور ہمیشہ عالم رہے گا اور وہ عالم الغیب ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ (الانعام ٢٨) "اور اگر واپس بھیجے جائیں تو پھر وہی کریں جس سے منع کیے گئے تھے۔" اور حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا: وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (نوح ٢٧) "اور ان کے اولاد ہو گی تو وہ بھی نہ ہو گی مگر بدکار بڑی ناشکر۔" اور اس کے بکثرت نظائر ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ کے علم میں سہو، غلطی اور نسیان ناجائز ہے، اس لیے کہ اگر اس کے علم میں سہو و غلط اور نسیان کا امکان ہو تو آیات و احکام و اعمال و اخبار سب معطل ہو جائیں، اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ رسالت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دینی تھی غلطی سے حضور اقدس ﷺ کو دے دی معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ نیز گناہ تو کیا کسی نے اور غلطی سے سزا دے دی دوسرے کو اور یہ بھی امر محال ہے جو سہو و نسیان خطا و غلطی کا قائل ہو وہ قطعاً کافر ہے۔

ابو شکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ایک مجوسی نے مقام "مرو" میں مجھ سے سوال کیا کہ کافر جب کافر مرا تو کیا اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ کفر کی حالت میں مرے گا؟ میں نے کہا: ہاں یقیناً جانتا تھا،

اس نے کہا کہ جب اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کافر مرے گا تو یہ کافر مرنے سے قبل ایمان لانے پر قادر ہے یا نہیں ؟ اگر تم کہو کہ وہ قادر ہے تو علم الٰہی میں خطا واقع ہو جائے گی اور اگر کہو کہ وہ قادر نہیں ایمان نہیں لا سکتا تو یہ جبر ہوا۔

میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ کفر کی حالت میں مرے گا اور اللہ تعالیٰ کے علم سے وہ مسلوب القدرت نہیں ہوا بلکہ وہ قادر ہے، ایمان لانے پر جس طرح وہ قادر ہے کفر پر قدرت موجود ہے، صلاحیت رکھتا ہے کہ ایمان لائے جیسے قدرت اور صلاحیت رکھتا ہے کفر پر قائم رہنے کی، لیکن باوجود قدرت کے ایمان نہیں لایا اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ایمان نہیں لائے گا اور اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو جانتا ہے جیسی اور جس حالت میں وہ ہیں اور اس کے مثل کو بھی وہ جانتا ہے۔

سوال: اگر سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مثل کو جانتا ہے یا نہیں ؟ اگر کہو کہ وہ اپنی مثل نہیں جانتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف جہل کی نسبت ہوئی اور اگر کہو کہ اللہ تعالیٰ اپنی مثل کو جانتا ہے تو تم نے اللہ تعالیٰ کے لئے مثل مان لیا۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ اس کی مثل نہیں اور اللہ تعالیٰ کی نہ شکل وصورت ہے، نہ ضد، نہ ند ہے۔

جہم ابن صفوان سے اسی طرح کا سوال ہوا کہ اللہ تعالیٰ دوزخیوں اور جنتیوں کے انفاس (سانسوں) کی انتہاء وغایت کو جانتا ہے یا نہیں ؟ اگر کہو کہ نہیں جانتا تو تم نے اللہ تعالیٰ کی طرف جہل کی نسبت کر دی اور اگر کہو کہ جانتا ہے تو جنت ودوزخ کا فنا کرنا ثابت ہو گیا، تو اس نے اختیار کیا کہ ہاں نہایتِ عدد انفاس اہل جنت واہل نار کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے اسی بناء پر اس نے کہا کہ جنت ونار فنا ہو جائیں گے۔

اور صحیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتاہے کہ اہل جنت واہل نار کے سانسوں کی تعداد کواوراس کے انتہاءنہ ہونے کوکہ ان سانسوں کی نہایت نہیں۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

پانچواں قول

سمع وبصر کابیان

معتزلہ اور جہمیہ تمام صفات کاانکار کرتے ہیں جیسے سمع،بصر،معتزلہ وجہمیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سمیع وبصیر ہے مگراس کے لئے سمع وبصر نہیں ہے۔

بعض معتزلہ نے کہاکہ اللہ تعالیٰ نہ سمیع ہے،نہ بصیر،نہ رائی،نہ مرئی بلکہ وہ ان تمام صفات کوجانتاہے۔ان کایہ عقیدہ کفرہے اس لئے کہ انہوں نے نص قطعی کاانکارکیا۔

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک قوم کے پاس سے گزرے، وہ اللہ تعالیٰ کوبلند آوازسے پکاررہے تھے، حضورﷺ نے فرمایا:اتنی آوازبلندنہ کروجس کوتم پکارتے ہووہ نہ غائب ہے نہ بہراہے۔پھرعلاوہ ازیں سمع وبصر کی نہ نفی موجبِ ذم ہے۔ اس پردلیل حضرت ابراہیم علی نبیناوعلیہ الصلوۃ والسلام کاقصہ ہے۔انہوں نے اپنےوالد(چچاآزر) سے فرمایاتھا:لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا (مریم ۴۲) اے میرے باپ کیوں ایسے کوپوجتاہے جونہ سنے نہ دیکھے اورنہ کچھ تیرے کام آئے۔

اوراللہ تعالیٰ نے فرمایا: قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ۔(المجادلۃ ۱) ”بے شک اللہ نے سنی اس کی بات جوتم سے اپنے شوہر کے معاملہ میں بحث کرتی ہے اور اللہ سے شکایت کرتی ہے۔“اللہ تعالیٰ نے خبردی کہ اس نے زمانۂ ماضی میں سنااوروہ مستقبل میں سنتاہے اوروہ اب سنتاہے اورجواس کاانکارکرے وہ کافرہے۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

چھٹا قول

ارادہ و مشیت کا بیان

لوگوں نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے۔ قدریہ، معتزلہ، جہمیہ فرقوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ شر و قبائح کا نہ ارادہ فرماتا ہے اور نہ حکم دیتا ہے۔

اور بعض کہتے ہیں: سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہے، حسن و قبح، خیر و شر، کفر و ایمان، طاعت و معصیت، پھر خیر و حسن اس کی مشیت و ارادہ سے ہوتا ہے اور قبائح اللہ تعالیٰ کی مشیۃ سے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے نہیں ہوتے کیونکہ ارادہ میں محبت و رضا (یعنی پسندیدگی اور خوشنودگی) کا دخل ہوتا ہے (اور اللہ تعالیٰ قبائح سے راضی نہیں)۔

اور بعض کہتے ہیں کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت اور قضاء سے ہوتا ہے، لیکن قبائح اس کے حکم سے نہیں ہوتے، اس لئے کہ حکم جبر و تسلط کو واجب کرتا ہے اور بعض کہتے ہیں: سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ارادہ و مشیت سے ہوتا ہے لیکن اس کی مشیت و ارادہ قرآن کی مانند مخلوق ہیں۔ یعنی بندے کا مشیت و ارادہ خدا کی طرف مضاف ہوتا ہے یعنی تملیک کے طور پر اس کی نسبت خدا کی طرف ہوتی ہے۔

اہل و سنت و جماعت کا مسلک

اہل سنت و جماعت کہتے ہیں: خیر و شر اللہ تعالیٰ کی قضاء، اس کی قدر و مشیت، ارادہ و علم اور حکم سے ہوتا ہے، پھر خیر و طاعت اس کے امر اور مرضی سے ہوتے ہیں اور شر و معصیت نہ اس کے امر سے ہوتا ہے اور نہ اس کی مرضی سے۔

دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروبن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: ہم حضوراقدس ﷺ کے دربار میں بیٹھے ہوئے تھے، ہم نے ایک آواز سنی کہ ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، بہت سے آدمی بھی ان کے ساتھ ہوتے ہیں، حضور ﷺ دریافت فرماتے ہیں کہ تم دونوں اونچی کیوں بول رہے تھے؟ تمہاری آوازیں کیوں بلند ہو رہی تھیں؟

ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عرض کرتے ہیں: حضور (ﷺ) ایک مسئلہ میں گفتگو کرتے ہوئے ہمارا اختلاف ہو گیا، میں یہ کہتا ہوں کہ خیر و شر سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عرض کرتے ہیں: حضور (ﷺ)! میرا موٴقف ہے کہ خیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور شر بندوں کی طرف سے ہوتا ہے، اب حضور (ﷺ)! آپ فیصلہ فرمائیں، ہم میں سے کس کا قول صحیح ہے؟

حضور (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: میں وہ فیصلہ کروں گا جو حضرت اسرافیل علیہ السلام نے، جبرائیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام کے درمیان کیا تھا۔

اے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ! جبرائیل علیہ السلام تو تمہاری طرح کہتے تھے اور اے ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ! میکائیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ تمہاری طرح کہتے تھے۔

جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا: ہم نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا تو زمین والے اس مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں، یہاں تک کہ جبرائیل علیہ السلام و میکائیل علیہ السلام نے حضرت اسرافیل علیہ السلام کو حَکَم بنایا، حضرت اسرافیل علیہ السلام نے لوحِ محفوظ میں اللہ تعالیٰ کی قضاء کے مطابق فیصلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: اے ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ! تمہارے قول کے مطابق اور اے عمر رضی

اللہ تعالیٰ عنہ! تمہارے قول کے موافق حکم نہیں فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: حضور ﷺ! میں اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتا ہوں اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضور سرور کائنات ﷺ سے سوال کیا کہ حضور ﷺ! اللہ تعالیٰ شر کی قضاء فرماتا ہے، پھر بندوں کو عذاب دیتا ہے ۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ (الانبیاء ۲۳)" "اُس سے نہیں پوچھا جاتا جو وہ کرے اور اُن سب سے سوال ہوگا۔"

روایت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

روایت ہے کہ ایک شخص حضرت مولیٰ مشکل کشا علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا کہ مجھ کو قدر کی خبر دیجئے؟ فرمایا: اندھیرا راستہ ہے، اس کے بارے میں نہ پوچھ۔ پھر اس نے ایک ساعت چپ رہنے کے بعد یہی سوال کیا کہ مجھ کو قدر کے متعلق خبر دیں، فرمایا: بحر عمیق ہے، بڑا گہرا سمندر ہے، اس میں داخل نہ ہوا۔ ایک ساعت کے لئے چپ رہا، پھر عرض کی: "اخبرنی عن القدر" مجھے بتائیے کہ قدر کیا ہے؟ فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا راز ہے۔ زمین میں اس کو افشا نہ کر۔ پھر ایک ساعت خاموش رہا، پھر یہی سوال دہراتا ہے مجھ کو قدر کی خبر دیجئے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے سوال کیا کیا یہ تیری مشیت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے یا تیری مشیت اللہ تعالیٰ کے مشیت کے خلاف جدا ہے تو وہ شخص حیران و ششدر ہو کر عرض کرنے لگا کہ آپ ہی فرمائیں، مولا علی مشکل کشا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اگر تو یہ کہے کہ میری مشیت اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ ہے تو تو نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشارکت کی اور اگر تو کہے کہ میری مشیت اللہ تعالیٰ کی مشیت سے برتر اور اوپر ہے تو تو نے الوہیت کا دعویٰ کیا۔ اب اس سے تجھ کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ

تیری مشیت اللہ تعالیٰ کے مشیت کے تحت ہے، یہ سن کر اس شخص نے توبہ کی اور جب جانے کے ارادہ سے اٹھا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اصحابِ مجلس سے فرمایا کہ اٹھو اس سے مصافحہ کرو کہ یہ اب مسلمان ہوا ہے۔

تو اس سے ثابت ہوا کہ جو قدر کا منکر ہے کافر ہے اور حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: قدریہ میری امت کے مجوسی ہیں، اگر بیمار ہو جائیں تو عیادت و بیمار پرسی نہ کرو اور اگر مر جائیں تو جنازہ کے ساتھ نہ جاؤ اور یہ دجال کا گروہ ہے اور حق ہے اللہ پر کہ ان کو دجال کے ساتھ ملا دے اس لئے کہ انہوں نے نص کا انکار کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (التکویر ۲۹) ”اور تم کیا چاہو مگر یہ کہ چاہے اللہ جو سارے جہان کا رب۔“

سوال: یہ ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہ ہونا چاہیئے کہ اگر بندہ چاہے کہ یہ گھاس سونا بن جائے تو اسے سونا ہو جانا چاہیئے اس لئے کہ تم کہتے ہو: بندہ وہی چاہتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ بندہ اس طرح چاہے تو بندہ نے ایسا چاہا اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے کہ گھاس سونا ہو جائے تو یقیناً سونا ہو جائے گا۔

غیلان قدری کا واقعہ

روایت ہے کہ غیلان قدری بصرہ سے کوفہ آیا اور وہاں کے فقہاء سے مناظرہ کیا، غیلان فقہاء پر غالب آ گیا۔ حضرت ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جوان تھے، حضرت حماد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں آیا جایا کرتے تھے۔ حضرت حماد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: اے جوان! تم اس شخص کے پاس جاؤ اور اس سے مناظرہ کرو۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بادشاہ کے دروازے پر پہنچے اور اندر داخل ہوئے اور بعد ازاں مناظرہ کیا جس میں امام صاحب غالب آئے اور غیلان مغلوب ہو گیا۔ غیلان نے امام صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے درج ذیل سوال کیے۔

غیلان: اے ابو حنیفہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! یہ بتائیے کہ ابلیس نے فرعون سے کیا چاہا؟

امام اعظم: اس نے فرعون سے کفر چاہا۔

غیلان: موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کیا چاہا۔

امام اعظم: موسیٰ علیہ السلام نے ایمان چاہا۔

غیلان: اللہ تعالیٰ نے فرعون سے کیا چاہا؟

امام اعظم: اللہ تعالیٰ نے فرعون سے کفر چاہا۔

غیلان: آپ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اللہ تعالیٰ کی مشیت ابلیس کی مشیت کے موافق کر دی اور موسیٰ علیہ السلام کی مشیت کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے موافق نہیں کیا اور چاہیئے یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت موسیٰ علیہ السلام کی مشیت کے موافق ہوتی۔

امام اعظم: اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ابلیس فرعون سے کفر چاہے اور اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون سے ایمان چاہیں اور اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ فرعون اپنے نفس کے لئے کفر چاہے تو یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوا اور یہ مسئلہ ایک نقطہ کی طرف لوٹتا ہے، وہ یہ ہے کہ کفر و شر دونوں مخلوق اللہ ہیں یا غیر کی مخلوق ہیں؟ تو اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق نہیں غیر کی ہیں تو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرا خالق و صانع ثابت کیا، تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرکے کافر ہوا اور اگر کہے کہ

کفر وشر اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے بغیر اس کے ارادہ ومشیت کے تو پھر یہ اعتقاد کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کے پیدا کرنے میں مجبور ومُکرَہ ہے اور یہ کفر ہے تو ثابت ہوا کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ارادہ ومشیت، قدرت اور قضاء سے ہے اور جو قدر کا انکار کرے کافر ہے۔

ساتواں قول

فضل وعدل کا بیان

معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ صفت فضل وعدل کے ساتھ موصوف ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں اور نہ ہی اس میں کسی کو شبہ ہے کہ اس کا فضل بغیر میل (جانب داری وجھکاؤ) کے عدل بغیر جور وستم کے ہوتا ہے، ہاں! البتہ اس میں اختلاف ہے کہ عدل وفضل کی تاثیر کیا ہے؟

اہل سنت وجماعت نے فرمایا کہ فضل کی صفت اور اس کی تاثیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے زیادتی لطف ہے جو کہ فقط مؤمنین کے لئے ہے، غیر مؤمنین کے لئے نہیں ہے اور وہ (زیادتی لطف) ایمان کے لئے انشراحِ صدر اور ہدایت ورہنمائی ہے اور درست باتوں کو مؤمنین کے دلوں میں ڈال دینا، اس کو قبول کرنے کی صلاحیت دینا اور طاعت وعبادت پر توفیق اور احسان واختصاص کرامت وولایت کے ساتھ یہ سب چیزیں مؤمنین کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے محض فضل اور زیادتی لطف وکرم سے حاصل ہیں، جو غیر کے لئے نہیں ہیں۔

معتزلہ کا مسلک

معتزلہ کہتے ہیں کہ یہ فضل نہیں بلکہ مَیل ہے، اس لیے کہ تمام انسان اللہ تعالیٰ کے غلام اور لونڈی ہیں، بس اگر کسی کو بغیر سبب کچھ عطا فرمائے اور دوسرے کو بلاوجہ محروم رکھے تو یہ اس

کے حق میں نجس (نقص)ہو گا اور پہلے کے حق میں میل (جانب داری)ہو گا اور پھر یہ حکمت کے خلاف ہے۔

معتزلہ کے نزدیک صفت فضل کیا ہے؟

ان کے نزدیک صفت فضل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو عاقل ، مرید، مختار اور فاعل کی صفات کے ساتھ پیدا فرمایا، پھر ان کے لئے دلائل واحکام سے راستہ بیان کر دیا اور یہی ہدایت کے معنی ہیں۔

فضل کسے کہتے ہیں؟

معتزلہ کے نزدیک فضل یہ ہے کہ جو ایمان لایا اور اطاعت کی تو اجر و ثواب پائے گا اور جس نے انکار کیا اور نافرمانی کی تو وہ سزا پائے گا اور اس کے سوا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے کچھ نہیں اور صحیح وہی بات ہے جو ہم نے ذکر کر دی ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو تمام مخلوق میں مختص کیا اور چار چیزوں سے ان کو خاص کیا۔

چار خصوصیاتِ انبیاء کرام علیہم السلام

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو چار چیزوں سے خالص کیا:

(۱) ایک تو یہ کہ ان کے اجساد پاک وطیب مٹی سے گوندھے گئے۔

(۲) اور ان کی روحیں روح القدس سے پیدا کی گئیں۔

(۳) اور تائید و عصمت سے ان کا اکرام کیا۔

(۴) اور ان کو حلال غیر مشتبہ روزی دی، اس سے بڑھ کر ان کو وحی و رسالت سے فضیلت دی تو جب انبیاء کرام صلوات اللہ علیہم اجمعین کو بغیر علت وسبب کے زیادہ لطف و تائید اور عصمت

ونبوت سے نوازنا جائز ہے تو ان کے غیر کو بھی ان کی قدر سے زیادہ دینا محض فضل اور لطف وکرم سے جائز ہوگا۔

اوران کا یہ کہنا کہ اگر دوسرے کو منع کرے گا تو بخس (یعنی نقص) ہوگا تو ہم کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے لئے کوئی شئے واجب نہیں، اگر وہ کسی کو مال ودولت عطا فرمائے تو یہ اس کا فضل ہوگا بغیر وجوب کے اور جائز ہے کہ کسی کو اپنے ارادہ سے زیادہ بھی عطا فرمادے اور پھر کسی کو کچھ نہ دے اور جو دوسرے کو دیا ہے اس سے منع کرے تو یہ منع واجب کا منع کرنا ہے، یہاں تک کہ اس کو بخس (یعنی نقص) کہا جائے، بلکہ اس سے عدل ہوگا، اس لئے کہ اس پر کچھ واجب نہیں اور اس پر ہمارا اجماع ہے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے جائز ہے، لیکن عنایت تو بعض کہتے ہیں کہ جائز ہے اور بعض کہتے ہیں: جائز نہیں، اس لئے کہ عنایت بہر حال میل (جانب داری) سے خالی نہیں ہے اور صحیح وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ بندوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معونت ہے اور ہم نہیں کہتے کہ عنایت ہے، اس لئے کہ یہ لفظ سماعاً وارد نہیں اور نہ ہی اہل علم اس پر متفق ہیں اور نہ یہ موجباتِ ضرورت سے ہے تو ہم بھی اس کے قائل نہیں۔

عدل اور اہل سنت وجماعت

اہل سنت وجماعت کے نزدیک صفت عدل کا بیان چھ چیزوں میں ہے:

(۱) ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ بندے کی نیکیوں میں ذرہ برابر بخس (کمی) نہیں کرتا۔

(۳) تیسرے یہ کہ بغیر گناہ کیے کسی کو عذاب نہیں دیتا۔

(۴) چوتھے یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دکھ نہیں دیتا بغیر غرض صحیح کے اور بہت بڑے عوض کے بھی۔

(۵) پانچویں یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو معصیت پر مجبور نہیں کرتا۔

(۶) چھٹی یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

سوال: اگر کہا جائے کہ کیا یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ جہنم میں ایک مخلوق پیدا کرے اور اس کو بغیر معصیت کے عذاب دے؟

جواب: ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے بلند و برتر اور ارفع و اعلیٰ ہے کہ کسی شخص کو بغیر جرم و خطاء اور بغیر گناہ کے عذاب دے اور اگر کوئی مخلوق جہنم میں پیدا کرے تو جہنم اس کے لئے عذاب نہ ہو گا اور اگر بغیر جرم و گناہ اس کو عذاب دے تو عدل نہ ہو گا اور اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے فضل و عدل سے کرتا ہے، دلیل اس کی یہ ہے کہ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (۳۸) ہر جان اپنی کرنی میں گِروی ہے۔ "جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الاحقاف ۱۴)" ان کے اعمال کا انعام۔"

معتزلہ عدل کسے کہتے ہیں؟

معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عدل یہ ہے کہ وہ کفر و شرک کو پیدا نہ کرے اور ضرر کو بھی پیدا نہ کرے اور نہ ان چیزوں کی قضاء (فیصلہ) کرے اور وہ مصالح (بھلائی اور بہتری) جن کے بندے محتاج ہیں اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور اگر مصالح عباد کو منع کرے تو عدل نہ ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ صفت عدل یہی ہے، یہاں تک کہ اگر اللہ تعالیٰ کفر و شرک کو پیدا کرے اور پھر بندوں کو عذاب دے تو یہ ظلم و جور ہو گا۔ سنو! یہ اعتقاد کفر ہے، اس لئے کہ بندہ جب اپنے لئے کفر کا ارادہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بندے سے توحید کا ارادہ کرتا ہے تو جس چیز کا بندہ نے ارادہ کیا ہو گا اور خدا نے جس چیز کا ارادہ کیا وہ نہ

ہوا تو بندہ کا ارادہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ پر غالب ہو گیا اور یہ محال ہے اور ہمارا اس پر اجماع ہے کہ کفر اللہ تعالیٰ کے علم سے ہے، وہ جانتا ہے اور قادر ہے کہ اس کو منع کر دے جبراً اور اگر منع نہ کرے تو یہ معتزلہ کے نزدیک عدل نہ ہو گا اس لئے کہ جو چیز بندوں کے حق میں اصلح اور اصوب ہو، اللہ تعالیٰ پر اس کا پیدا کرنا واجب ہے اور کفر میں نہ فلاح ہے نہ صواب ہے اور اور ایسے ہی ان کے زعم میں اصلح واصوب اللہ تعالیٰ کے حق میں اولیٰ ہے کہ اس پر واجب ہو اور بندہ جب ترک کر دے اس چیز کو جو بندوں کے حق میں برائی ہے اور عدل نہ ہو گا، اس بندہ کی طرف سے اور عیب لوٹے اس کی طرف اور ایسے ہی اللہ تعالیٰ کے حق کہ جب جانتا ہے کہ بندہ کفر و شرک کرے گا اور اس نے اصلح واصوب کو ترک کیا اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور جبراً منع کرنے پر قادر ہے اور منع نہ کرے تو عیب اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عدل نہیں ہو گا اور یہ جائز نہیں۔ پھر ہمارا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو بغیر نہی کے کفر اور قبائح سے جبراً منع نہیں کرتا باوجودیکہ اس کو علم وقدرت ہے اور صفت قبح بندے کی طرف لوٹے گی اور ایسے ہی اگر اللہ تعالیٰ کفر و شرک اور قبح کے پیدا کرنے کا ارادہ کرے تو عیب بندے کی طرف لوٹے گا جیسے علم میں۔[13]

سوال: اگر کہا جائے کہ ازروئے حکمت یہ کیسے جائز ہے کہ کفر و شرک کا ارادہ اپنے حق کرلے اور شر و قبح اپنے نفس کے لئے ارادہ کرے؟

جواب: ہم کہتے ہیں: جیسے جائز ہے ازروئے حکمت کہ کسی نفس کو پیدا کرے اور جانتا ہے کہ یہ کفر و شرک کرے گا اور برا کام کرے گا باوجود اس کے کہ اسے علم ہو، اس کو پیدا کرنے کا ارادہ

[13] اللہ تعالیٰ جانتاھے کہ فلاں بندہ کفر کرے گا تو یہ عیب صرف بندے کی طرف راجع ھو گا۔

کرتا ہے تو ایسے ہی یہ مسئلہ ہے، اس لئے کہ جائز ہے کہ شرک اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہو عیب بندے کی طرف لوٹے جیسے علم میں۔

آٹھواں قول

تکوین و مکون کا بیان

امام ابوالحسن اشعری اور کرامیہ کہتے ہیں کہ تکوین و مکِوّن ایک ہی چیز ہے اور اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ تکوین مُکَوّن کا فعل ہوتا ہے اور مُکوّن (واؤ کی زبر کے ساتھ) تکوین کی صورت مسئلہ یہ ہی ہے کہ ان کے نزدیک مُکوّن (پیدا کرنے والا) جب کسی شئے کو پیدا کرتا ہے تو فعل اس سے زائل (جدا) ہو کر مُکَوّن (مفعول) میں حلول کرتا ہے اور اس میں سما جاتا ہے اور اہل سنت وجماعت کے نزدیک فعل فاعل سے جدا ہو کر مفعول میں حلول و سرایت نہیں کرتا اور تکوین (تخلیق) مکوِّن (خالق) سے جدا نہیں ہوتی اور یہ مسئلہ دراصل ایک دوسرے مسئلہ کی فرع ہے، وہ (اصل) مسئلہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی صفات حادث و محدث ہیں اور اہل سنت کے نزدیک صفاتِ باری ہونا جائز نہیں ہے، جیسا کہ پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں، تو جب ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی صفات و افعال حادث ہیں تو انہوں نے کہا: فعل، صنع اور تخلیق و تکوین اس سے شروع ہوتے ہیں، پھر اس سے زائل (جدا) ہو جاتی ہیں یعنی تفعیل و تکوین اور تخلیق کے وقت اس سے جدا ہو کر مکوّن و مفعول میں حلول کر جاتی ہیں اور یہ کفر ہے۔

اس لئے کہ یہ دو حال سے خالی نہیں یا یہ فعل و صنع حادث ہوں گے یا غیر حادث؟ اگر کہیں کہ حادث ہیں تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے محل حوادث ہونے کا اعتقاد کیا اور اس پر تغیر و تکوین اور تحویل جائز ہو گا اور یہ کفر ہے۔

اوراگر کہیں: فعل غیر محدث ہے بلکہ صفت قدیم ہے تو محدث میں صفت قدیم کے حلول کا اعتقاد کیا، اب قدم اور بقائے دہران کا عقیدہ ٹھہرا، اس لئے کہ ان کے نزدیک دہر، قدیم کا محل ہوگا اور قدیم کا محل قدیم ہونا ضروری ہے اور یہ کفر ہے۔

متصوفین کا مسلک

بعض متصوفین کہتے ہیں کہ ہر شئے علت اس کی صنعت ہے اور یہ بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ صنع علت ہے تو وہ معلول میں حلول کرے گی تو یہ اور پہلا مسئلہ برابر نہیں۔

سوال: پھر اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ آیا اپنی صفت کو بدلنے پر قادر ہے؟

جواب: تو ہم کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے کمال پر، لیکن تغیر جائز نہیں اللہ تعالیٰ کی صفات میں اس کا وجود محال ہے اور اللہ تعالیٰ محال سے منزہ ہے۔

صفت الٰہی کا بدلنا محال ہے اور محال تحت قدرت نہیں کہ یہ مقدور بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا (تو قابل کا نقص ہے فاعل کا نہیں) اور اس کا سوال کرنا کفر ہے، اس لئے کہ اس نے صفاتِ باری میں تغییر کو جائز مانا اور یہ کفر ہے۔

نواں قول

باری تعالیٰ کی کتنے صفات ہیں؟

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات نہ مکرّر ہیں اور نہ وہ متعدد ہیں، بیان اس کا یہ ہے کہ اللہ عزوجل فعل واحد کا فاعل ہے اور جمیع مفعولات کو ایک فعل سے کرتا ہے۔

اور وہ ”حی“ ہے حیاتِ واحد سے، سمیع ہے سمع واحد ہے، جمیع مسموعات کو سنتا ہے اور وہ ایک کلام سے متکلم ہے، تمام صفات کو اسی طرح سمجھ لو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات قدیمہ ہیں اور عدد و تکرار محدثات کی صفت ہے اور اگر ہم کہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفت حد تکرار میں داخل ہیں تو پہلی صفت زائل ہو گی اور دوسری صفت پیدا ہو گی، یہاں تک کہ مکرر ہو جائیں گی اور یہ کفر ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور یہ معنی تمام صفات میں موثر ہوں گے۔

اعتراض: اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات سب کی سب صفت واحدہ ہیں یا ہر صفت علیحدہ علیحدہ پہلی صفت کے علاوہ ہے؟

جواب: تو ہم کہیں گے کہ ہمارے بعض اصحاب فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صفت حیات، صفت قدرت اور علم سے موصوف ہے اور اسی طرح باقی تمام سے ہر صفت سے موصوف ہے۔

اور ہمارے اصحاب میں سے بعض کہتے ہیں کہ سب کی سب صفات صفت واجب ہیں اور اصل یہ ہے کہ جو ہم کہتے ہیں کہ صفات الٰہی حقیقت میں ایک ہیں وہ ادب کے تحت داخل نہیں ہیں لیکن اس کی تاثیر اور اسماء محدودہ ہیں اس لئے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت کا انکار کیا تو وہ کافر ہو جائے گا اور کسی صفت کو زیادہ کیا تو کافر ہو جائے گا تو صفات باری تعالیٰ جل مجدہ تاثیر اور اسم کے اعتبار سے محدودہ ہیں اور ایمان کل پر واجب ہے اور صفات در حقیقت ایک ہیں اگر کہا جائے کہ قدرت اور حیات دو شئے ہیں یا دو عدد ہیں یا اثنان ہیں تو کافر ہو جائے گا تو ہم کہتے ہیں کہ حیات اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور قدرت بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور قدرت حیات نہیں اور نہ وہ غیر حیات تو یوں کہیں گے۔ ”**لاھی ولاھی غیرھا**“ اور ایسے ہی علم مع الارادہ اور سمع مع البصر ہر صفت کے ساتھ ہم کہیں گے ”**لاھی ھی ولاھی غیرھا**“ جیسے صفات ذات میں اس لئے کہ صفات معدودات سے نہیں

ہم کہیں گے کہ اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد بصفاتہ ہے جب ہم نے ثابت کر دیا کہ صفات باری مکرر اور معدودہ نہیں تو ایسے ہی واجب ہے کہ متضاد اور متناقض بھی نہ ہوں۔

جیسے ہم سخط (ناراضی) اور رضا (خوشنودی) کے بارے میں کہتے ہیں ، اللہ تعالیٰ کی رضا اس کی سخط (ناراضی) نہیں اور نہ ضد سخط ہے اور اس کا سخط اس کی رضا نہیں اور نہ ضد رضا تو ہم کہیں گے کہ "**لاھی ھی ولاھی غیرھا**" اور وہ رضا و سخط کے ساتھ موصوف ہے اور یہ جو کہا کہ رضا ضد سخت نہیں اس لئے کہ رضا سخط سے زائل نہیں ہوتی اور نہ مشغول کر کے سخط سے اور اس کا سخط اس کی رضا کو زائل نہیں کرتا اور نہ اس کو مشغول کرتا ہے اور اس کی صفت کسی حال میں اس سے زائل نہیں ہوتی اور تضاد و تناقض اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب ایک صفت دوسری سے مشغول کرے یا اس کی ضد اس سے زائل ہو اور اثباتِ شغل بھی صفات باری میں جائز نہیں اور کوئی صفت اس سے زائل نہیں ہوتی اور اس کی صفت میں نفی کی اضافت نہیں ہو سکتی اور اثبات کی اضافت بھی نہیں ہو سکتی تو ثابت ہوا کہ اس کی صفات میں تناقض و تضاد نہیں۔

سوال: یہ ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ کی صفات میں مکر اور مخادعہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ہم کہیں گے کہ یہ معانی ردیہ ہیں اور صفاتِ قبیحہ تو قبیحہ اور ردیہ صفات نہیں سکتیں، لیکن بہ طریقِ مکافات (بدلے) و مجازات (جزاء) جائز ہے، اپنے دشمنوں کو ان کے مکر و مخادعت اور استہزاء بمثل افعالھم یعنی جیسا ان کا فعل ویسا اس کو بدلہ دینا اور یہی معنی ہیں ۔ **اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ**۔(البقرۃ۱۵) للہ ان سے استہزاء فرماتا ہے (جیسا اس کی شان کے لائق ہے)۔"**وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا مَكْرًا**۔(النمل ۵۰) اور اُنہوں نے اپنا سا مکر کیا اور ہم نے اپنی خفیہ تدبیر فرمائی۔"اور

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ (البقرۃ ۹) فریب دیا چاہتے ہیں اللہ کو۔" وَ هُوَ خَادِعُهُمْ۔(النساء ۱۴۲) اور وہی انہیں غافل کرکے مارے گا۔" تو ان آیتوں میں ان کے افعال کی جزاء مراد ہے۔

دسواں قول

آیاتِ متشابھات پر ایمان لانے کا بیان

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں: متشابہات پر ایمان لانا واجب ہے اوراس کی تفسیر جائز نہیں اوراس کی تاویل واجب نہیں اور یہ کہنا جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس صفت سے موصوف ہے بلکہ یہ کہیں گے کہ یہ کلام اللہ ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا، اس سے جو ارادہ فرمایا اس پر ہمارا ایمان ہے۔

جیسا کہ حضوراقدس ﷺ سے مروی ہے کہ فرمایا: "ان للہ یدین کلتاھمایمینان"[14] اوراللہ تعالیٰ نے فرمایا: بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ (المائدۃ ۶۴) "بلکہ اس کے ہاتھ کشادہ ہیں۔" اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (طٰہٰ ۵) وہ بڑی مہر (رحمت) والا اس نے عرش پر استواء فرمایا جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔" اوراس قسم کی جو آیات واحادیث ہیں ان پر اس طرح ایمان لانا واجب ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اوراس کے رسول کا کلام ہے اوراس میں تاویل واجب نہیں ہے۔

معتزلہ اور جہمیہ کا مذہب

معتزلہ اور جہمیہ کہتے ہیں کہ ان آیات واحادیث کی تاویل واجب ہے، انہوں نے کہا کہ "ید" کے معنی قوت ونعمت ہے اوریہ درست نہیں ، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بَلْ يَدٰهُ

---

[14] عن عبداللہ بن عمرو: إنَّ المُقْسِطِينَ عِنْدَ اللهِ على مَنابِرَ مِن نُورٍ، عن يَمِينِ الرَّحْمَنِ عزَّ وجلَّ، وكِلْتا يَدَيْهِ يَمِينٌ، الَّذِينَ يَعْدِلُونَ في حُكْمِهِمْ وأَهْلِيهِمْ وما ولوا.(مسلم(ت ۲۶۱)، صحیح مسلم ۱۸۲۷]•صحیح•[شعیب الأرنؤوط(ت ۱۴۳۸)، تخریج العواصم والقواصم ۷/۲۱۳•حدیث صحیح•)

مَبۡسُوۡطَتٰنِ۔(المائدۃ ٦٤) ”بلکہ اس کے ہاتھ کشادہ ہیں۔“ اور جائز نہیں کہ ہم کہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے دو قوتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لِمَا خَلَقۡتُ بِيَدَيَّ اَسۡتَكۡبَرۡتَ۔(ص ٧٥) جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ کیا تجھے غرور آگیا۔“ اور اگر ”ید“ سے مراد قوت ہوگی تو ابلیس یہ کہے گا کہ میں تیری قوت ونعمت سے مخلوق وپیدا شدہ ہوں تو ثابت ہوا کہ ”ید“ سے مراد قوت نہیں اور اس لئے بھی کہ اگر تاویل واجب ہوتی تو اوّل حضوراقدس ﷺ پر تاویل واجب ہوتی، اس لئے کہ حضور ﷺ مُبیّن بناکر مبعوث ہوئے ہیں اور جب حضور ﷺ نے اس کے معنی بیان نہیں کیے اور تاویل نہیں کی تو معلوم ہوا کہ تاویل واجب نہیں، اس لئے کہ تاویل تفسیر سے اقویٰ وواضح ہے، اس لئے کہ تاویل وہ ہے جو مراد کی طرف لوٹتی ہے اور اگر تاویل واجب ومشروع ہوتی تو وہ تاویل ہم تک منقول ہوتی، جیسے قرآن اور تفسیر وقرأتیں منقول ہوئی ہیں اور جب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے تاویل منقول نہیں تو ثابت ہوا کہ تاویل واجب نہیں۔

اورابوالحسن اشعری اور متقدمین مشائخِ بخارا نے کہا: متشابہات اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں بغیر تفصیل وتشریح وکیفیت کے اور انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ صفتِ ید، صفتِ وجہ، صفتِ نزول وقدم سے موصوف ہے، آیات واحادیث میں جو جو صفات ذکر ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب صفات سے بلاکیف موصوف ہے۔ یہ بھی درست نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ۔ ”اور دوسری وہ ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے۔“ یعنی اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ لوگوں پر اس کے معانی مشتبہ ہوگئے ہیں۔

اگر ہم کہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں تو حد اشتباہ سے نکل کر مفسر ہو جائے گی۔

امام محمد ابن حسن سے مروی ہے کہ ان سے اسی قسم کی آیات واحادیث کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا کہ جس طرح نازل ہوئی ہیں اور جو ان سے اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے اس پر ایمان لاؤ اور حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ تعالیٰ ، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ علم قرآن چار قسم کا ہے:

(۱) ایک قسم وہ ہے جس سے جاہل رہنا جائز ہے اور وہ حلال و حرام کا علم ہے۔

(۲) اور ایک قسم علم کی وہ ہے جس کو عرب جانتے ہیں، وہ علم اسماء ہے اور علم تفسیر وہ علم قصص اور شانِ نزول۔

(۳) اور ایک علم وہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جیسا کہ فرمایا: وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللهُ (ال عمران ۷) اور اس کا ٹھیک پہلو اللہ ہی کو معلوم ہے۔"

اور مشائخ سمرقند رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ متشابہ وہ ہیں جن کے معنی ہم پر مشتبہ ہیں تو ہم ان پر ایمان لائے اور اقرار کرتے ہیں یہ کلام اللہ تعالیٰ ہے اور خبر رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کے کلام پر اور اس کے رسول ﷺ کے کلام پر ایمان لائے اور جو انہوں نے ارادہ فرمایا اس پر ہمارا ایمان ہے۔

سوال: اگر کہا جائے کہ آیا ازروئے حکمت یہ جائز ہوگا کہ مثلاً اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو بھیجے اور اس پر کتاب نازل کرے اور احکام اتارے، پھر بعض چیزیں اپنے رسول ﷺ پر مخفی و پوشیدہ رکھے جس کے معنی وہ نہ جانتا ہو؟

جواب: ہم کہتے ہیں: بمقتضائے حکمت جائز ہے کہ علم الٰہی پر کوئی علیٰ وجہ الاتم مطلع نہ ہو، دلیل اس پر یہ ہے کہ احادیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قلم کو حکم دیا کہ لکھے لوح محفوظ میں کہ

فلاں سعید ہے۔"ان شئت"یعنی اگر میں چاہوں تو فلاں سعید ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ لوح و قلم اور فرشتے جو لوح میں دیکھ رہے ہیں وہ بھی جمیع علوم الٰہی کو نہیں جانتے تو یہ راز ہے تو جب یہ لوحِ محفوظ میں ہے تو دیگر کتب میں بھی جائز ہے،جو احکام اور جن چیزوں کی مخلوق جو حاجت ہے وہ واضح کر دیئے جائیں اور جس چیز کی مخلوق محتاج نہیں ہے تو جائز ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا راز ہو۔

معتزلہ کا مسلک

پھر معتزلہ کے نزدیک متشابہات کی تاویل واجب ہے اور اہل سنت کے نزدیک غیر واجب ہے،لیکن جائز ہے کہ متشابہ میں تاویل کریں اس لئے کہ مشبہہ نے ظاہر آیتوں کو لے کر کہا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ید(ہاتھ)اورانگلی دیگر مخلوقات کی طرح ہیں اوراس کا انہوں نے اعتقاد کیااور یہ کفر ہے تو تاویل جائز ہے،تشبہ کے وقت نفی خطاء اورزوالِ شبہ کے لئے،لیکن ساتھ ہی ہم یہ نہیں کہتے کہ جو تاویل کی ہے یہی مراد متکلم ہے بلکہ یوں کہیں گے،ممکن ہے اس سے مراد یہ ہو لیکن حقیقی مراد اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

صفات باری تعالیٰ میں مفصل و مدلل بیان تفصیل کیا مولوی عزیز الرحمٰن صاحب نے۔

صفات باری تعالیٰ

باری تعالیٰ کے لئے خاص صفات ہیں۔

سوال:اگر باری تعالیٰ کے لئے صفات ثابت ہیں تو ہمارے لئے بھی ثابت ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کے لئے صفت علم ہے اس طرح ہمارے لئے بھی ہے وغیرہ؟

جواب: یہ ہے کہ باری تعالیٰ کے لئے خاص صفات ہیں جو مخلوق میں نہیں پائی جاتیں، یعنی مخلوق تو صرف نام ہی میں مشترک ہے، صفات الٰہی کی شان ہی کچھ اور ہے۔

ثبوت صفات کے دلائل

پہلی دلیل:

عقل و شرع دونوں کے اعتبار سے یہ بات ثابت ہے کہ باری تعالیٰ عالم، قادر، حی وغیرہ ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لئے صفات ثابت ہوئیں۔

دوسری دلیل:

عرف اور لغت سے یہ بات معلوم ہے کہ ان اسماء مشتقہ میں سے ہر ایک ایسے معنیٰ پر دلالت کرتا ہے جو واجب کے مفہوم سے زائد خارج ہے اور وہ معنیٰ جو واجب کے مفہوم سے زائد ہو باری تعالیٰ کی صفات ہیں۔

سوال: یہ ہے کہ دعویٰ ثبوت صفات ہے باری تعالیٰ کے لئے اور دلیل اس پر پیش کی جاتی ہے کہ یہ واجب کے مفہوم سے زائد ہے لہٰذا آپ کی دلیل دعوے کے مطابق نہیں؟

جواب: یہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں جو لوگ صفات کو مفہوم واجب سے زائد ہونے سے انکار کرتے ہیں اور اس کو عین مانتے ہیں تو گویا وہ صفات کے ثبوت سے انکار کرتے ہیں۔

تیسری دلیل:

یہ کہ وہ صفات آپس میں مترادف نہیں اس لئے کہ اگر وہ آپس میں مترادف ہو جائیں تو پھر وہ ایک ہی صفت بن کر صفات کیسے بن جائیں گی۔

چوتھی دلیل:

یہ ہے کہ جس چیز پر اسم مشتق صادق ہو جائے وہ اس کے لئے ماخذ اشتقاق کے ثبوت کا تقاضا کرتا ہے "عالم کا ماخذ""علم" ہے تو عالم اس کو کہا جاتا ہے جس کے لئے علم ثابت ہو، اسی وجہ سے تو اس کو عالم کہا جاتا ہے ایسا نہیں ہے کہ عالم ہے اور اس کے لئے علم ثابت نہ ہو جس طرح معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عالم ہے لیکن اس کے لئے علم ثابت نہیں، قادر ہے لیکن قدرت ثابت نہیں یہ تو ظاہراً باطل ہے یہ ہمارے اس قول کی طرح ہے کہ "فلاں چیز سیاہ ہے لیکن اس میں سیاہی نہیں یا سفید ہے لیکن اس میں سفیدی نہیں"۔

پانچویں دلیل:

نصوص باری تعالیٰ کے لئے علم قدرت وغیرہ کے ثبوت پر ناطق ہیں۔ مثلاً:

اللّٰہُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ (طٰہٰ ۸)

ترجمہ: اللہ کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں اسی کے ہیں سب اچھے نام۔

علیم، قدیر، یا العلیم القدیر یا العزیز العلیم یا الخلاق العلیم یا علیم حلیم یا علیما حلیما یا شاکرا علیما یا لطیف خبیر وغیرہ۔

اسی طرح محکم افعال اور مشتمل بر عجائب ایجادات باری تعالیٰ کے لئے علم، قدرت وغیرہ صفات کے ثبوت پر دلالت کرتے ہیں۔

چھٹی دلیل:

ذات خداوندی باوجود ایک ہونے کے پھر سب کمالات کے ساتھ موصوف ہے۔ ایک شخص ملکڑی او مجسٹریٹ دونوں کے کام کرتا ہے اس لئے دو نام ہو گئے ورنہ حقیقت میں وہ ایک ہی ذات ہے۔ ایسے ہی ذات خداوندی بھی بسبب جدا جدا کاموں کے خالق، رازق، سمیع و بصیر کہلاتی ہے۔ غرض یہ کہ صفات کا متعدد ہونا اس کی وحدانیت کے کسی طرح منافی نہیں۔

اور جس طرح ذات خداوندی تمام موجودات کے لئے اصل ہے اسی طرح کمالات خداوندی کمالات مخلوق کے لئے اصل ہیں۔ اور مخلوق میں جو کمال ہے وہ اسی کے کمال کا پرتو اور عکس ہے جیسا کہ مخلوقات کا وجود اسی کے وجود کا پرتو اور عکس ہے۔ آفتاب میں اگر نور نہ ہوتا تو زمین کیسے منور ہوتی۔ آتش میں اگر حرارت نہ ہوتی تو پانی کیسے گرم ہوتا علی ھذا اگر خالق میں کمال نہ ہوتا تو مخلوق میں کہاں سے کمال آجاتا۔

بندوں میں حیات بھی ہے۔ علم و قدرت بھی ہے ارادہ و اختیار بھی ہے۔ سمع و بصر اور کمال بھی ہے اور یہ ساری باتیں باتفاق خوبی و کمال کی سمجھی جاتی ہیں۔ یہ کمالات اگر خالق میں نہ تھے تو مخلوق میں کہاں سے آئے۔ نیز اگر خداوند کریم ان صفات کمالات کے ساتھ موصوف نہ ہو تو مخلوق کا خالق سے اور ممکن کا واجب سے افضل ہونا لازم آتا ہے اس لئے کہ مخلوق میں حیات، علم، قدرت، سمع، بصر سب موجود ہے۔ اب اگر خدا ان صفات سے عاری ہو تو یقیناً مخلوق کو خالق سے افضل کہنا پڑے گا۔ کیونکہ زندہ کو مردہ سے اور عالم کا غیر عالم سے اور قادر کا غیر قادر سے افضل ہونا بالکل ظاہر ہے۔

خشک ابرے کہ بود از آب تہی　　　　نایداز وے صفت آبدہی [15]

[15] (اشرف الفوئد شرح شرح العقائد، ص ۲۴۶، ۲۴۷، علم الکلام مولانا محمد ادریس کاندھلوی علیہ الرحمۃ)

بندوں کے کمالات اور اللہ تعالیٰ کے کمالات میں فرق

لیکن بندوں کے کمالات اور اللہ تعالیٰ کے کمالات میں دو طرح کا فرق ہے۔

پہلا فرق:

پہلا فرق یہ ہے کہ بندوں کی جتنی بھی کمال والی صفات ہیں اور جتنے بھی کمالات ہیں وہ ان کے اپنے نہیں ہیں بلکہ کسی دیئے ہوئے ہیں، خوبصورت ہونا، مالدار ہونا، سائنسدان ہونا، حیرت انگیز ایجادات کا موجد ہونا، انجینئر ہونا، عجیب و غریب چیزیں بنانا، یہ تمام کمالات کسی بھی انسان میں ہوں گے وہ اس کے اپنے نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کے دیئے ہوئے ہیں۔

مال اللہ تعالیٰ نے دیا، حسن و جمال اللہ تعالیٰ نے دیا اقتدار اللہ تعالیٰ نے دیا، سائنس دانوں کو عقل و دماغ اللہ تعالیٰ نے دیا، پھر اس کو استعمال کر کے اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے مادے اور میٹیریل کو استعمال کر کے ایک چیز بنا دیتے ہیں تو واہ واہ ہو جاتی ہے، یہ کمال ان کو کس نے دیا؟ اللہ تعالیٰ نے دیا، اس لئے قرآن نے کہا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (الفاتحة ١)" دنیا میں جتنی تعریفیں ہوتی ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں، خداوند کے سوا کسی کی تعریف نہیں ہو سکتی، آپ جس کی بھی تعریف کریں گے، کسی کمال کی بنیاد پر کریں گے اور وہ کمال اس کو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، تو کمال دینے والے کی تعریف ضرور ہو گی۔

تو بندوں کے سارے کمالات اپنے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے ہیں، مگر خدا تعالیٰ کی ساری صفات کمالیہ اپنی ذاتی ہیں کسی کی دی ہوئی نہیں، وہ اپنی کمال والی صفت میں مخلوق کا محتاج نہیں بلکہ وہ اپنے کمال میں مخلوق کے ماننے کا بھی محتاج نہیں کوئی مانے تب بھی وہ خالق ہے نہ مانے تب بھی وہ خالق ہے، کوئی مانے تب بھی وہ رازق ہے اور کوئی نہ مانے تب بھی وہ رازق ہے۔ تو بندوں کے

سارے کمالات اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سارے کمالات ذاتی ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔

دوسرا فرق:

بندوں کے کمالات اور اللہ تعالیٰ کے کمالات میں دوسرا فرق یہ ہے کہ بندوں کے پاس جتنی خوبیاں ہیں وہ ساری عارضی ہیں، جتنے کمالات ہیں وہ سارے عارضی ہیں، چند دنوں کے لئے ہیں یا تو وہ خوبی دنیا ہی میں چھن جائے گی ورنہ موت آکر چھین لے گی، مال ہے، اقتدار ہے، حسن و جمال ہے، عزت ہے وہ چند دن کے لئے۔

(صدائے منبر، مولانا مفتی محمد امین صاحب)

لہٰذا عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے صفات ثابت ہو گئیں پھر ان صفات میں بعض ذاتی صفات ہیں اور بعض صفات افعال ہیں، صفات ذاتی اشاعرہ کے نزدیک سات اور ماتاتریدیہ کے نزدیک آٹھ ہیں، جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

اقسام صفات

صفات باری تعالیٰ کی دو اقسام ہیں:

(۱) صفات سلبیہ (۲) صفات وجودیہ ثبوتیہ

صفات سلبیہ:

وہ صفات ہیں جن کی باری تعالیٰ سے سلب اور نفی کی جائے جیسے کہا جاتا ہے "اللہ لیس بجوھر ولا بعرض والا بممکن" یہ صفات سلبیہ ہیں۔

صفات وجودیہ:

وہ صفات ہیں جن کا ذات باری تعالیٰ کے لئے اثبات کیا جائے۔

صفات وجودیہ کی اقسام:

پھر صفات وجودیہ کی دو اقسام ہیں:

(۱) صفات حقیقیہ (۲) صفات غیر حقیقیہ

صفات حقیقیہ کا دوسرا نام صفات ذاتیہ، جمالیہ اور صفات جلالیہ ہے۔ صفات غیر حقیقیہ کو صفات اضافیہ افعالیہ بھی کہا جاتا ہے۔

امام ابوالحسن اشعری اللہ تعالیٰ کی دو قسمیں ذکر کرتے ہیں۔ ایک صفات ذاتیہ اور دوسری صفات فعلیہ۔

صفات ذاتیہ:

ان صفات کو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان کی ضد کے ساتھ موصوف نہ ہو سکے۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتیہ حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر اور کلام ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ تو متصف ہے ان کی ضد یعنی موت، جہل، عجز وغیرہ کے ساتھ متصف نہیں ہو سکتا۔ یہ امھات الصفات یعنی بنیادی صفات بھی کہلاتی ہیں کیونکہ یہ صفات فعلیہ اور دیگر صفات کے لئے بمنزلہ بنیادی صفات بھی کہلاتی ہیں اس لئے کہ اگر حیات ہی نہ ہو تو خدا ہی نہ رہے اور علم و ارادہ نہ ہو تو کوئی فعل وجود میں نہ آئے۔[16]

---

16 (اسلامی عقائد، ص ۲۰)

امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک صفات ذاتیہ کی اقسام

امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک صفات ذاتیہ سات ہیں:

۱۔ حیات ۲۔ علم ۳۔ قدرت

۴۔ سمع

۵۔ بصر ۶۔ ارادہ ۷۔ مشیت

یہ صفات نہ اللہ کی ذات میں داخل ہیں اور نہ ہی خارج ہیں، مفہوم ایک بھی نہیں، غیر بھی نہیں۔ اسی کو اہل علم لا عین ولا غیر سے تعبیر کرتے ہیں۔[17]

صفات فعلیہ:

ان صفات کو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان کی ضد کے ساتھ موصوف ہو سکے اور اللہ تعالیٰ کے لئے کمال ہو اور ان کا تعلق غیر کے ساتھ ہو۔ جیسے مارنا اور جلانا، عزت دینا، ذلت دینا، رزق دینا اور نہ دینا وغیرہ۔ امام اشعری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سب صفات فعلیہ کو بنیادی صفت قدرت کے ماتحت اور اس سے متعلق مانتے ہیں۔

امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک صفات ذاتیہ کی اقسام

امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ آٹھ صفات کو بنیادی قرار دیتے ہیں، جن میں سے سات تو وہ ہیں جو اوپر صفات ذاتیہ میں مذکور ہوئیں اور آٹھویں تکوین ہے۔[18]

---

17 (عقائد اہل سنت والجماعۃ، ص ۷۱)

18 (اسلامی عقائد، ص ۲۰، ۲۱)

متکلمین اور فلاسفہ کے درمیان صفات میں اختلاف کی نوعیت

سوال: یہ ہے کہ آپ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے صفات ثابت ہیں اور صفات تو مستحیل البقاء (یعنی زائل ہوتی ہیں) ہونے کی وجہ سے حادث ہیں جس طرح انسان کے ساتھ پہلے علم نہیں تھا اب ہے اور کچھ عرصہ بعد یہ ختم ہو جائے گا لہٰذا صفات حادث ہیں؟

جواب: ہمارا انزاع اس میں نہیں ہے کہ وہ صفات باری تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں جو کیفیات اور عوارض ہیں کیونکہ صفات باری تعالیٰ تو ازلی ہیں ہم ان کیفیات اور عوارض پر بحث نہیں کرتے کیونکہ جو علم کیفیات اور عوارض کی جنس سے ہے باری تعالیٰ سے اس کی نفی پر ہمارا اور معتزلہ کا اتفاق ہے۔

سوال: پھر آپ کس چیز سے بحث کرتے ہیں جس میں آپ کا اور معتزلہ کا اختلاف ہے؟

جواب: یہ ہے کہ ہماری نزاع اس بات میں ہے کہ جیسے ہم میں سے کسی کے عالم ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے لئے علم نام کی صفت ثابت ہے جو کہ اس کی ذات سے زائد ہے اور عرض ہے اور حادث ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لئے علم نام کی ایک صفت ثابت ہے جو اس سے زائد اور اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور قدیم ہے تو اس میں ایک رائے فلاسفہ کی ہے اور ایک متکلمین کی۔

فلاسفہ کے نزدیک صفات عین ذات واجب ہے

فلاسفہ اس سے منکر ہیں، ان کے نزدیک صفات عین ذات واجب ہیں ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی ایسی صفت نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے زائد اور اس کے ساتھ قائم ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کا عالم ہونا اور قادر وغیرہ ہونا ایک اضافی چیز ہے معلومات کے ساتھ تعلق ہونے کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ عالم

اور مقدورات کے ساتھ تعلق ہونے کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ قادر ہیں، لہٰذا ذات باری تعالیٰ من کل الوجوہ واحد ہے۔

فلاسفہ کی یہ رائے اس لئے ہے کہ تعدد قدماء اور تعدد وجباء لازم نہ آئے۔ فلاسفہ کا کہنا ہے کہ اگر صفات ذات باری تعالیٰ سے زائد لئے جائیں چونکہ صفات قدیم ہیں تو تعدد قدماء لازم آتا ہے، اور یہ تعدد وجباء کو مستلزم ہے۔

متکلمین

متکلمین کے نزدیک صفات باری تعالیٰ ذات باری تعالیٰ سے زائد اور اس کے ساتھ قائم ہیں اور قدیم ہیں، اس سے تعدد قدماء لازم آتا ہے اور یہ تعدد وجباء کو مستلزم نہیں، کیونکہ یہاں دو چیزیں ہیں:

(۱) ذوات قدیم کا تعدد (۲) صفات قدیم کا تعدد

ذوات قدیم کا تعدد محال ہے نہ کہ صفات قدیم کا تعدد اور صفات کو زائد علی الذات لینے میں ذوات قدیم کا تعدد لازم نہیں آتا جو کہ محال ہے بلکہ صفات قدیمہ کا تعدد لازم آتا ہے اور یہ جائز ہے۔

متکلمین کی طرف سے فلاسفہ اور معتزلہ پر چند اعتراضات

اعتراض یہ ہے کہ فلاسفہ کی رائے سے بہت سارے محالات لازم آئیں گے، مثلاً صفات عین ذات باری تعالیٰ ہوں گی تو ذات باری تعالیٰ بھی ہر صفت کی عین ہو گی مثلاً علم عین ذات باری تعالیٰ ہے اور ذات باری تعالیٰ عین حیات ہے لہٰذا علم عین حیات ہے۔ اسی طرح علم عین ذات باری تعالیٰ ہے اور ذات باری تعالیٰ قادر ہے لہٰذا علم قادر ہو گا۔ اسی طرح ذات باری تعالیٰ عین علم ہے اور علم غیر

قائم بالذات ہے لہٰذا ذات باری تعالیٰ بھی غیر قائم بالذات ہو گی۔ لہٰذا صفات کو عین ماننے سے یہ تمام نقصانات لازم آئیں گے تو صفات کا عین ذات ہونا محال ہے۔[19]

اسماء الٰہیہ کی حیثیت

اسماء الٰہی (یعنی اللہ تعالیٰ کے ناموں) میں سے صرف لفظ اللہ ذات نام ہے بقیہ تمام نام صفتوں کی وجہ سے ہیں اور یہ صفاتی نام بھی توفیقی ہیں یعنی حضور اکرم ﷺ سے سنے جانے اور بتائے جانے پر موقوف ہیں عربی میں انہی ناموں سے اللہ تعالیٰ کو پکارنا جائز ہے کہ جو شریعت نے بتا دیئے ہیں اپنی طرف سے کسی عربی لفظ سے اللہ کو پکارنا جائز نہیں چاہیئے خواہ اس عربی لفظ کا معنیٰ کتنا ہی عمدہ و اعلیٰ کیوں نہ ہو مثلاً طبیب عاقل وغیرہ۔

لیکن عربی کے علاوہ ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کے ساتھ جن ناموں سے بھی پکارا جائے وہ جائز ہے ان کو رد نہ کیا جائے ہو سکتا ہے کہ بے تعظیمی ہو جائے۔

اور حدیث میں جن ننانوے ناموں کے یاد کرنے اور محفوظ کرنے پر جنت ملنے کا وعدہ ہے وہ ننانوے اصلیں اور بنیادیں ہیں بقیہ تمام صفاتی نام انہی کی جزئیات ہیں جن کی مجموعی تعداد جو انسانی علم میں آ سکی ہے، اس میں کئی اقوال ملتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار کا قول ملتا ہے۔[20]

---

19 (اشرف الفوائد شرح شرح العقائد، ص ۲۴۸، ۲۵۰)

20 (عقائد اهل السنة والجماعة، مفتی زین العابدین، ص ۷۳)

معنی اور مفہوم کے اعتبار سے صفات کی اقسام

پھر معنی اور مفہوم کے اعتبار سے صفات کی دو قسمیں ہیں:

(۱) محکمات (۲) مشابہات

(۱) صفات محکمات:

صفات محکمات وہ ہیں کہ جن کا معنی ظاہر اور واضح ہے اور سمجھ میں آنے والا ہے ان کو واضحات بھی کہتے ہیں، مثلاً سمع، بصر، علم قدرت اور ارادہ وغیرہ۔

حکم:

ان کا حکم یہ ہے کہ ان کے ظاہر پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے اور اس کی تاویل نہ کی جائے گی۔

(۲) صفات متشابہات:

وہ صفات ہیں کہ جن کے معنی غیر واضح اور مبہم ہیں سمجھ کی وہاں تک رسائی نہیں یہ اللہ تعالیٰ کی وہ صفات ہیں جو قرآن و حدیث میں مذکور ہیں جیسے: وجہ (چہرہ)، ید (ہاتھ)، عین (آنکھ)، ساق (پنڈلی) اور عرش پر مستوی ہونا ان صفات کو متشابہات کہتے ہیں کیونکہ اگر ان کے ظاہری معنی مراد لیں تو اللہ تعالیٰ کا عاجز اور محتاج ہونا لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اپنے کام میں ان اعضاء کے محتاج ہیں۔ کیونکہ انسان دیکھنے کے لئے آنکھ کا، کام کے لئے ہاتھ کا، چلنے کے لئے پنڈلی کا محتاج ہے، اگر انہی چیزوں کو ان کے ظاہری معنی پر ہی مان لیں تو معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ بھی بندوں کی طرح ان اعضاء کے محتاج ہیں۔ کیونکہ انسان دیکھنے کے لئے آنکھ کا، کام کے لئے ہاتھ کا، چلنے کے لئے پنڈلی کا محتاج ہوتا ہے اگر انہی چیزوں کو ان کے ظاہری معنی پر ہی مان لیں تو معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ بھی بندوں کی طرح ان اعضاء کے محتاج ہیں جو بالکل ہی غلط ہے لہٰذا یہ صفات متشابہات میں سے ہے۔

حکم:

اہل سنت والجماعت کے ہاں صفات متشابہات کو جوں کا توں سچ تسلیم کر لیں گے اور اس کے صحیح حقیقی معانی کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دیں گے۔

فضول تاویلات سے احتراز کریں گے اور ان کو ناقص بتانے کی بجائے اپنی عقل کے ناقص ہونے کا اقرار کریں گے اور یہ ذہن میں رکھیں گے کہ جو اعضاء اللہ نے قرآن کریم میں ذکر فرمائے ہیں وہ اسی کی شان کے لائق ہیں نہ وہ اعضاء مخلوق ہیں نہ مخلوق کی طرح کے ہیں۔[21]

اللہ تعالیٰ کی تمام صفات قدیم ہیں

اللہ تعالیٰ کی تمام صفات قدیمی یعنی ازلی اور ہمیشہ ہمیشہ سے ہیں۔ جب مخلوق ابھی پیدا بھی نہیں کی گئی تھی اللہ تعالیٰ اس وقت بھی خالق تھے کیونکہ تخلیق کی بنیاد جو کہ امام اشعری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک صفت قدرت ہے اور امام ماتریدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک صفت تکوین ہے ازل سے موجود ہے۔ اس وجہ سے خالق اس کی صفت قدیم ہے۔ اس کا خالق ہونا مخلوق کے پیدا ہونے پر موقوف نہیں بلکہ مخلوق کا پیدا ہونا اس کے خالق ہونے پر موقوف ہے۔ اگر اس میں پیدا کرنے کی صفت نہ ہوتی تو یہ مخلوق کیسے پیدا ہوتی۔[22]

---

21 (عقائد اہل السنۃ والجماعۃ، مفتی زین العابدین صاحب، ص ۷۲)

22 (اسلامی عقائد، ص ۲۱)

کرامیۃ

کرامیۃ:

کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے صفات ہیں لیکن یہ صفات حادث ہیں۔

کرامیہ کی دلیل:

یہ ہے کہ صفات میں تغیر و تبدل آتا ہے مثلاً زید کی پیدائش سے پہلے اس پر علم الٰہی ایک اعتبار سے تھا پھر پیدائش کے بعد دوسرے اعتبار سے پھر مرنے کے بعد تیسرے اعتبار سے اس کے ساتھ علم الٰہی متعلق ہوگیا تو یہاں پر علم کے بارے میں تغیر و تبدل آیا ہے اور جس چیز میں تغیر آتی ہے وہ حادث ہے لہٰذا صفات باری تعالیٰ بھی حادث ہیں۔

جواب:

اور ہم کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے لئے صفات ثابت کی جائیں اور وہ صفات حادث ہوں تو نعوذ باللہ ذات باری تعالیٰ کا محل حوادث ہونا لازم آجائے گا، اور آپ جو صفات ثابت کرتے ہیں اس کے متعلقات حادث ہیں اور صفت وہی ایک ہے لہٰذا متعلقات کے حادث ہونے سے متعلقہ صفات کا حادث ہونا لازم نہیں آتا۔

صفات باری تعالیٰ کی چار قسمیں اور ان کی مثالیں

صفات باری تعالیٰ کی چار قسمیں ہیں:

(ا) صفات حقیقیہ محضہ جس طرح حیوۃ۔

(۲) صفات حقیقیہ ذات الاضافۃ جیسے سمع، بصر، قدرت، ارادہ، علم اور تکوین۔ ماتریدیہ کے نزدیک۔

(۳) اضافیہ محضہ جیسے معیت، قبلیت اور بعدیت۔

(۴) صفات سلبیہ جس طرح لیس بعرض و الجوھر۔

صفات حقیقیہ محضہ اور سلبیہ میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں آتا اور صفات حقیقیہ ذات الاضافۃ میں باعتبار متعلق کے فرق آتا ہے اور اضافیہ محضہ میں تغیر آتا رہتا ہے کبھی قبلیت ثابت ہو گی تو کبھی بعدیت۔

خلاصہ کلام:

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہیں کیونکہ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ جب کسی شئی کی کوئی صفت ہو گی تو وہ اس کے علاوہ کسی اور کے ساتھ قائم نہیں ہو سکتی۔

معلوم ہوا کہ صفات باری تعالیٰ لازمی اور قطعی طور پر باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہیں جبکہ معتزلہ کہتے ہیں کہ صفت تو ہے مگر اس صفت کا قیام ذات باری تعالیٰ کے ساتھ نہیں بلکہ غیر کے ساتھ ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ متکلم ہیں مگر یہ صفت کلام باری تعالیٰ کی جگہ غیر کے ساتھ قائم ہے گو کہ لوح محفوظ یا جبرئیل علیہ السلام ہے یا حضرت محمد ﷺ ہے۔

سوال: یہ ہے کہ معتزلہ تو صفات باری تعالیٰ کو عین ذات مانتے ہیں علیحدہ نہیں مانتے ہیں مگر آپ کی بات سے تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ معتزلہ کے نزدیک ذات اور صفات غیر ہیں اور یہ صفت ذات کے علاوہ کسی غیر کے ساتھ قائم ہے؟۔

جواب: یہ ہے کہ ان کا مقصد صفت کلام کے اللہ تعالیٰ کی صفت ہونے کا انکار کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیئے یہ صفت ثابت نہیں بلکہ وہ موجد کلام ہے جو کسی غیر کے اندر موجود کر کے اس کے ساتھ قائم کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے صفت کلام ثابت نہیں کیونکہ وہ اس کو حادث مانتے ہیں اور وہ کلام کی تقسیم لفظی اور نفسی کی طرف نہیں کرتے بلکہ صفر لفظی مانتے ہیں اور وہ حادث ہے البتہ ہمارے نزدیک کلام لفظی حادث اور نفسی قدیم ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ متکلم بمعنی موجد کلام لینے سے ہمارا جواب یہ ہے کہ مشتق کا اطلاق مأخذ اشتقاق کے موصوف پر ہو گا نہ کہ اس کے موجد پر۔ مثلاً: اسود کا اطلاق مأخذ اشتقاق یعنی سواد کے ساتھ موصوف چیز پر ہو گا نہ کہ اس چیز کے ایجاد کرنے والے پر۔ [23]

اللہ تعالیٰ کی صفات نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات بلکہ لازم ذات ہیں

اس بات پر تمام اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ واجب تعالیٰ کے لئے ایسی صفات ثابت ہیں جو واجب الوجود کے مفہوم سے زائد ہیں عین ذات واجب نہیں ہیں اس کے بر خلاف معتزلہ صفات کی نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صفات عین واجب ہیں اور صفات کے عین واجب ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جن افعال کے لئے صفات ثابت کی جاتی ہیں ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی ذات کافی ہے اس کی ذات سے زائد کوئی چیز اس کے لئے ثابت نہیں ہے۔

صفات کی نفی پر معتزلہ کی دلیل:

صفات کی نفی پر معتزلہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اگر باری تعالیٰ کے لئے ایسی صفات ہوں جو اس کی ذات کا عین نہ ہوں بلکہ اس کی ذات سے زائد چیز ہوں تو وہ اس کا غیر ہوں گی، اب وہ حادث تو

---

[23] (اشرف الفوائد شرح شرح العقائد، ص ۲۴۵،۲۵۳)

ہو نہیں سکتیں، ورنہ ان کے موصوف یعنی واجب تعالیٰ کا حادث ہونا لازم آجائے گا۔ لا محالہ وہ قدیم ہوں گی لہٰذا غیر اللہ کا قدیم ہونا لازم آجائے گا۔

نیز یہ صفات بہت سی ہیں تو تعدد قدماء بھی لازم آجائے گا نیز قدیم اور واجب مترادف ہیں تو تعدد واجب لذاتہ بھی لازم آئے گا۔ اور غیر اللہ کا قدیم ہونا اور تعدد قدماء و تعدد وجباء یہ سب توحید کے منافی ہیں۔

پھر یہ کہ قائلین بالصفات میں بعض سات صفات بعض آٹھ اور بعض اس سے زائد مانتے ہیں، حالانکہ نصاریٰ صرف تین قدماء یعنی اب، ابن اور روح القدس کے قائل ہونے سے کافر قرار دیئے گئے تو پھر ساتھ یا آٹھ یا اس سے زائد قدماء ثابت کرنے والوں کے کفر کا کیا ٹھکانا ہو گا۔

جواب (صفات کی نفی پر معتزلہ کے دلائل کا جواب)

صفات باری تعالیٰ "لا ھو و لا غیرہ" ہیں یعنی صفات باری تعالیٰ نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات بلکہ لازم ذات ہیں۔ یہاں صفت عینیت اور غیریت کی نفی ہے کیونکہ جب صفات باری تعالیٰ، اللہ تعالیٰ کا غیر نہیں ہیں تو ان کے قدیم ہونے سے غیر اللہ کا قدیم ہونا لازم نہیں آئے گا۔

نیز تعدد اور تکثر اشیاء متعددہ اور متکثرہ کے درمیان تغائر بمعنی ایک کا دوسرے سے انفکاک اور انتقال ممکن ہونے پر موقوف ہے اور جب صفات باری تعالیٰ، اللہ تعالیٰ کا اسی طرح آپس میں بھی ایک دوسرے کا غیر بایں معنی نہیں ہیں کہ ایک کا دوسرے سے انفکاک اور انتقال ہو سکے تو تعدد اور تکثر متحقق نہیں ہو گا لہٰذا ان کے قدیم ہونے سے تعدد قدماء یا تکثر قدماء لازم نہیں آئے گا۔

حاصل یہ کہ مطلق تعدد قدماء محال نہیں ہے بلکہ قدماء متغائرہ کا تعدد محال ہے اور ہم جن صفات کو قدیم کہتے ہیں وہ متغائر نہیں ہیں نہ ذات واجب کا غیر ہیں اور نہ آپس میں ایک دوسرے کا غیر ہیں۔

"**لاھم**" میں معتزلہ اور فلاسفہ کی تردید ہے اور "**لاغیرہ**" میں کرامیہ کی تردید ہے۔ فریق اول عینیت اور فریق ثانی غیریت کا قائل ہے اور ہم دونوں کا انکار کرتے ہیں۔

سوال: یہ ہے کہ نصاریٰ جن تین قدماء کے قائل ہیں انہیں باہم متغایر نہیں کہتے ہیں، اس کے باوجود وہ کافر قرار دیئے گئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلقاً تعدد قدماء توحید کے منافی ہے خواہ ان میں باہم تغائر ہو یا نہ ہو لہٰذا تمہارا یہ کہنا کہ مطلق تعدد قدماء محال نہیں بلکہ قدماء متغائرہ کا تعدد محال ہے یہ درست نہیں۔

جواب: جواب کا حاصل یہ کہ نصاریٰ جن تین قدماء کے قائل ہیں ان کے درمیان تغایر کی اگرچہ انہوں نے صراحت نہیں کی ہے مگر ایسی بات کہی ہے جس سے ان تینوں قدماء کے درمیان متغائرات لازم آتی ہیں، اور وہ بات یہ ہے کہ انہوں نے تین اقانیم ثابت کئے ایک وجود جس کو لفظ "**اب**" سے تعبیر کرتے ہیں دوسرے علم جس کو لفظ "**ابن**" سے تعبیر کرتے ہیں اور تیسرے حیات جس کو "**روح القدس**" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اقنوم علم اللہ تعالیٰ کی ذات سے عیسیٰ علیہ السلام کے بدن کی طرف منتقل ہو گیا اس طرح انہوں نے انفکاک اور انتقال کو جائز قرار دیا اور انفکاک اور انتقال جس کا نام غیریت اور تغائر ہے ذوات میں ہوتا ہے لہٰذا یہ اقانیم ثلاثہ متغائر ذوات ہوئے تو جواب کہ خلاصہ یہ نکلا کہ تکثر قدماء کے قول کا الزام عائد ہو گا کیونکہ وہ جن تین قدماء کے قائل ہیں ان میں انفکاک اور انتقال جائز قرار دیتے ہیں اور اشاعرہ چونکہ صفات کو ذات واجب کا اسی

طرح ایک صفت کو دوسرے کا غیر نہیں مانتے یعنی صفات کا ذات واجب سے اسی طرح ایک صفت کا دوسری صفت سے انفکاک اور انتقال جائز نہیں قرار دیتے لہٰذا صفات کو قدیم کہنے سے ان پر تعدد قدماء کے قول کا الزام عائد نہیں ہو گا۔

اقنوم اقانیم کی جمع ہے یہ سیریانی زبان کا کلمہ ہے بعض علماء کے نزدیک اس کے معنی صفت کے اور بعض کے نزدیک بمعنی اصل ہے۔

صفات کی نفی پر معتزلہ کے استدلال کا مذکورہ جواب **"ولا غیرہ"** کو محمول کیا تھا تعدد اور تکثر کے تغائر بمعنی امکان انفکاک پر مبنی تھا کہ صفات قدیمہ ذات واجب کا اسی طرح باہم ایک دوسرے کا غیر نہیں کہ ان کا دوسرے سے انفکاک ممکن ہو لہٰذا تعدد اور تکثر متحقق نہیں ہو گا اور صفات کے قدیم ہونے سے تعدد قدماء لازم نہیں آئے گا۔

علامہ تفتازنی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ فریق مخالف کو تعدد اور تکثر کے تغائر بمعنی امکان انفکاک پر موقوف ہونے کا انکار کرنے کی گنجائش ہے کیونکہ مراتب اعداد میں سے بعض دوسرے بعض کے لئے جزہیں، اور جزء کل کے درمیان مغائرت نہیں ہے مثلاً: آٹھ اور دس کہ ان میں سے اول ثانی کے لئے جزء اور ثانی اول کے لئے کل ہے مگر ان دونوں میں مغائرت بمعنی انفکاک نہیں ہے کیونکہ آٹھ کا جو کہ جزء ہے اپنے کل یعنی دس سے انفکاک ممکن نہیں ہے ورنہ دس نہیں رہے گا بلکہ دو ہی رہ جائے گا اس کے باوجود آٹھ اور دس دونوں متعدد اور متکثر ہے تو معلوم ہوا کہ تعدد اور تکثر بمعنی امکان انفکاک پر موقوف نہیں ہے۔

جو لوگ عدد کم منفصل قرار دیتے ہیں وہ واحد کو عدد ہی نہیں مانتے کیونکہ کم وہ عرض ہے جو بالذات قابل تقسیم ہو یعنی جس کے لئے اجزاء ہوں اور واحد بسیط ہے اس کے لئے اجزاء نہیں جن کی

طرف اس کی تقسیم ہو سکے لہٰذا وہ عدد بھی نہیں ہو گا، مگر جو لوگ عدد کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ جو شمار کیا جائے ان کے نزدیک واحد بھی عدد ہے علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا کلام اسی مذہب پر مبنی ہے۔

اور اہل سنت میں سے بعض صفات حقیقیہ کی تعداد سات بتاتے ہیں یا آٹھ قرار دیتے ہیں اور بعض اس سے بھی زائد مانتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ صفات کے متعدد اور کثیر ہونے میں اہل سنت والجماعت کے درمیان کوئی نزاع نہیں ہے خواہ ان میں تغائر مانا جائے یا نہ لہٰذا صفات کو قدیم ماننے سے تعدد قدماء بہرحال لازم آئے گا۔

فالاولی فی الجواب:

جب اہل سنت والجماعت کا صفات کے متعدد اور کثیر ہونے میں کوئی نزاع نہیں تو پھر معتزلہ کے استدلال کا وہ جواب نہ دیا جائے جو تعدد صفات کے انکار پر مبنی ہے بلکہ صفات قدیمہ کا تعدد اور تکثر تسلیم کیا جائے اور کہا جائے کہ صفات کو قدیم ماننے سے ایک ذات مع اس کی صفات کا تعدد لازم آتا ہے اور یہ محال نہیں ہے بلکہ محال تو ذوات قدیمہ کا تعدد ہے جو ہم پر لازم نہیں آرہا ہے کیونکہ ہم صفات کو معتزلہ کی طرح عین ذات نہیں کہتے کہ صفات قدیمہ کے متعدد اور کثیر ہونے سے ذوات قدیمہ کا تعدد اور تکثر لازم آئے "وھی لا ھو" سے عینیت کی نفی کر کے اسی جواب کی طرف اشارہ ہے۔

معتزلہ نے اپنے استدلال میں کہا تھا کہ صفات کو قدیم ماننے کی صورت میں تعدد قدماء لازم آئے گا اور قدیم اور واجب کے درمیان ترادف کے قول کی بنیاد پر صفات واجب لذاتہ بھی ہو گی تو تعدد واجب لذاتہ بھی لازم آئے گا جو توحید کے منافی ہے۔

بعض لوگوں نے معتزلہ کے اس استدلال کا جواب صفات کا واجب لذاتہ ہونا تسلیم کر کے دیا ہے کہ صفات واجبہ کا تعدد محال نہیں، بلکہ ذوات واجبہ کا تعدد محال ہے۔

علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ توحید کے دلائل ذات اور صفات کی تفریق کے بغیر مطلقاً واجب الوجود کی وحدانیت پر دلالت کر رہے ہیں اس لئے صفات کو واجب الوجود لذاتہ کہنے کی جرأت نہیں کرنی چاہیئے اور یہ کہنا چاہیئے کہ صفات واجب بمعنی ثابت ہیں اس ذات کے لئے جو عین صفات ہے اور نہ غیر صفات ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے اور جن لوگوں نے صفات کو واجب الوجود لذاتہ کہا ان کی بھی یہی مراد ہے یعنی واجب بمعنی ثابت ہے اور لذاتہ کا مطلب لذات اللہ تعالیٰ ہے۔

رہی یہ بات کہ صفات نفس الامر کے اعتبار سے کیا ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ممکن ہیں باوجود یہ کہ قدیم ہیں کیونکہ وہ باری تعالیٰ کی قدیم ذات کے ساتھ قائم ہیں اور جب ممکن کسی قدیم ذات کے ساتھ قائم ہو تو اس کے قدیم ہونے میں کوئی استحالہ نہیں اس تقریر کی رو سے مشہور کلیہ "کل ممکن حادث" میں ممکن سے وہ ممکن مراد ہو گا جو قدیم ذات کے ساتھ قائم نہ ہو۔

جب صفات قدیم ہونے کے باوجود ممکن ہیں تو ہر قدیم الٰہ نہیں ہو سکتا کہ متعدد صفات قدیمہ کے وجود سے متعدد الٰہ کا وجود لازم آئے کیونکہ الٰہ کا واجب الوجود ہونا ضروری ہے۔

احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ کہا جائے کہ باری تعالیٰ اپنی صفات کے ساتھ قدیم ہیں یہ نہ کہا جائے کہ اس کی صفات قدیم ہیں تاکہ عامۃ الناس جو ہر قدیم الٰہ سمجھتے ہیں ان کو یہ وہم نہ ہو کہ ان صفات میں سے ہر صفت قائم بالذات اور صفات الوہیت کے ساتھ متصف ہے۔

عینیت اور غیریت دونوں کی نفی ارتفاع نقیضین اور اجتماع نقیضین کو مستلزم ہے؟

سوال: یہ اعتراض "**لاھو ولاغیرہ**" قول پر ہے اور اعتراض کی بنیاد عینیت اور غیریت کے درمیان تناقض ہونے اور دونوں کے درمیان واسطہ نہ ہونے پر ہے۔

حاصل اعتراض یہ ہے کہ عینیت اور غیریت ایک دوسرے کی تنقیض ہیں کیونکہ دونوں چیزوں کے مفہوم کا ایک ہونا عینیت ہے اور دونوں کے مفہوم کا ایک نہ ہونا غیریت ہے ان دونوں کے درمیان کوئی واسطہ نہیں لہٰذا عینیت اور غیریت نقیضین ہوئے سو اس قول "**لا ھو و لا غیرہ**" ظاہر سے عینیت اور غیریت دونوں کی نفی ہوتی ہے یہ ارتفاع نقیضین ہے اور چونکہ نقیضین میں سے ایک کی نفی دوسرے کے ثبوت کو مستلزم ہوتی ہے اس بناء پر جب کہا کہ صفات عین ذات نہیں اس سے معلوم ہوا کہ غیر ذات ہے پھر جب کہا کہ غیر ذات نہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ عین ذات ہیں، لہٰذا عینیت اور غیریت دونوں کا ثبوت ہوا یہ اجتماع نقیضین ہے۔

مشائخ اشاعرہ کے نزدیک غیریت کا معنی اور عینیت اور غیریت کے درمیان تناقض نہیں

جواب: یہ ہے کہ عینیت اور غیریت ایک دوسرے کی نقیض نہیں ہیں، لہٰذا دونوں کی نفی ارتفاع نقیضین نہیں کہلائے گی اور نہ ہر ایک کی نفی دوسرے کے ثبوت کو مستلزم ہو گی کہ اجتماع نقیضین لازم آئے اور دونوں کے درمیان تناقض نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ نقیضین کے درمیان واسطہ نہیں ہوتا اور عینیت اور غیریت کے درمیان واسطہ ہے کیونکہ مشائخ اشاعرہ نے عینیت کا تو وہی معنی ذکر کیا ہے جو معترض نے بیان کیا ہے یعنی دو چیزوں کے مفہوم کا ایک ہونا۔ مگر غیریت کا

دوسرا معنی ذکر کیا ہے، وہ یہ کہ دو چیزوں کے درمیان غیریت کا مطلب یہ ہے کہ ایک کے وجود کا دوسرے کے عدم کے ساتھ تصور ممکن ہو یعنی دونوں میں سے ایک کا دوسرے سے انفکاک اور زوال ممکن ہو سکتا ہے۔ مثلاً: دو چیزیں اس طرح کی ہوں کہ ان کا مفہوم ایک نہ ہو اور ان دونوں میں سے ایک کا دوسرے کے بغیر وجود نہ ہو۔ تو اتحاد فی المفہوم نہ ہونے کے سبب ان دونوں کے درمیان عینیت نہ ہو گی، اور ایک دوسرے سے زوال و انفکاک نہ ہونے کے سبب غیریت بھی نہ ہو گی۔ مثلاً: باری تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات ہیں کہ دونوں کا مفہوم ایک نہ ہونے کی وجہ سے عینیت نہیں اور چونکہ دونوں ازلی ہیں عدم اور زوال دونوں کا محال ہے۔ لہٰذا ایک کا دوسرے سے زوال ممکن نہ ہونے کے سبب غیریت بھی نہیں لہٰذا صفات نہ عین ذات ہے نہ غیر ذات ہیں۔

اسی طرح صفات باری تعالیٰ میں سے ایک صفت کا دوسری صفت کے ساتھ معاملہ ہے کہ دونوں کا مفہوم ایک نہیں اور ازلی ہونے کے سبب ایک کا دوسرے سے زوال ممکن نہیں، لہٰذا کوئی صفت دوسری صفت کی عین ہو گی نہ غیر ہو گی۔

اسی طرح جزء اور کل کا معاملہ ہے کہ دونوں کا مفہوم ایک نہیں لہٰذا دونوں کے درمیان عینیت نہ ہو گی اور ایک دوسرے کے بغیر موجود نہیں ہو سکتا لہٰذا غیریت بھی نہیں ہو گی اور دونوں کا مفہوم ایک نہ ہونا تو ظاہر ہے کہ کیونکہ جزء کا مفہوم یہ ہے کہ جس سے کوئی چیز مرکب ہو اور کل کا مفہوم یہ ہے کہ جو دوسری چیزوں سے مرکب ہو، اور ایک کا دوسرے سے زوال و انفکاک ممکن نہ ہونے کی مثال واحد کا جو عشرہ کا جزء ہے کہ واحد جزء ہے عشرہ کا اور عشرہ اس کے لئے کل ہے اور واحد من العشرۃ یعنی واحد کا جو عشرہ کا جزء ہے عشرہ کے بغیر وجود محال ہے کیونکہ اگر عشرہ نہ رہے بلکہ اس میں سے مثلاً تین کم ہو جانے کی وجہ سے سبعہ رہ جائے، اگرچہ اس میں بھی واحد موجود ہے مگر یہ "واحد

من العشرة" یعنی وہ واحد نہیں ہے جو عشرہ کا جزء تھا بلکہ یہ "واحد من السبعة" کہلائے گا اسہ طرح عشرہ جو کل ہے اس کا وجود "واحد من العشرة" کے بغیر نہیں ہو سکتا کیونکہ واحد کے زوال و انفکاک سے عشرہ نہیں رہے گا بلکہ تسعہ رہ جائے گا۔ اسی طرح ہر جزء اور کل کا یہی حال ہے کہ ایک دوسرے سے زوال و انفکاک ممکن نہ ہونے کی وجہ سے ان کے درمیان غیریت نہیں۔ جس طرح دونوں کا مفہوم ایک نہ ہونے کی وجہ سے عینیت نہیں ہے۔

اوپر جس ذات اور اس کی صفات کے درمیان غیریت بمعنی امکان انفکاک کی نفی کی گئی تھی اس ذات سے ذات واجب اور ان کی صفات سے صفات واجب مراد تھیں، برخلاف ہماری ذات اور ہماری صفات کے کہ یہ چونکہ حادث ہیں ان پر زوال اور عدم طاری ہوتا ہے۔ مثلاً آج ہم صحت کے ساتھ متصف ہیں کل کو یہ صفت باقی نہیں رہتی ہم سے اس کا زوال اور انفکاک ہو جاتا ہے ہم بیمار ہو جاتے ہیں اس کے باوجود ہماری ذات موجود رہتی ہے، جب صفات مبینہ حادثہ کا اپنے موصوف ذات سے زوال اور انفکاک ممکن ہے تو پھر صفات حادثہ اپنے موصوف کا غیر ہوں گی۔

مشائخ اشاعرہ کی ذکر کردہ غیریت کی تفسیر پر اعتراض

سوال: اشاعرہ نے غیریت کی جو تفسیر کی ہے وہ معتزلہ کے نزدیک محل نظر ہے۔ معتزلہ کی طرف سے اس پر اعتراض وارد ہے کہ آپ نے غیریت کی تفسیر جو انفکاک سے کی ہے تو آپ کی مراد:

(۱) انفکاک من الجانبین ہے۔

(۲) یا جانب واحد سے انفکاک کافی ہے؟

اگر آپ کہیں کہ ہماری مراد انفکاک سے انفکاک من الجانبین ہے تو پھر جہاں جانبین سے انفکاک نہ ہو وہاں غیریت نہیں ہونی چاہیئے جیسے عالم اور صانع علم کہ صانع کا عالم سے انفکاک درست ہے اور عالم کا صانع علم سے انفکاک محال ہے۔ اسی طرح محل کا عرض سے انفکاک درست ہے مگر عرض کا محل سے انفکاک درست نہیں جب آپ جانبین مراد لیتے ہو تو پھر مذکورہ دونوں مثالوں میں غیریت نہیں ہونی چاہیئے۔

اور اگر مراد غیریت سے یہ ہے کہ انفکاک من جانب واحد ہو تو پھر آپ کو کل اور جز اور اسی طرح ذات اور صفات کے درمیان مغایرت ثابت کرنا پڑے گی حالانکہ آپ یہاں مغایرت ثابت نہیں کرتے کیونکہ کل بغیر جز کے نہیں پایا جاتا مگر جز تو بغیر کل کے پایا جاتا ہے تو انفکاک من جانب واحد آیا اور اس کو آپ مغایرت کے لئے کافی سمجھتے ہیں لہٰذا ان کے درمیان مغایرت ثابت کر لو۔ ایسے ہی ذات اور صفات کے درمیان کہ ذات بغیر صفات کے پائی جاسکتی ہے مگر صفات بغیر ذات کے نہیں پائی جاسکتی تو انفکاک من جانب واحد آیا لہٰذا ان دونوں کے درمیان مغایرت کو ثابت کر لو۔

(اور ماسبق میں جزء اور کل کے درمیان غیریت بمعنی امکان انفکاک نہ ہونے کی مثال میں کہا تھا کہ جس طرح عشرہ کا بقاء بغیر واحد کے محال ہے اسی طرح **واحد من العشرہ** کا بقاء بغیر عشرہ کے محال ہے)۔

اور معتزلہ اس کو دفع کر رہے ہیں کہ **واحد من العشرۃ** کا بقاء بغیر عشرہ کے محال ہونا فاسد ہے کیونکہ اگر عشرہ نہ رہے مثلاً تسعہ ہی رہ جائے تو تسعہ میں بھی واحد موجود ہے۔

اشاعرہ کی طرف سے معتزلہ کا جواب

جواب: یہ ہے کہ ہمارا مقصد ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بلکہ ہم تو یوں کہتے ہیں کہ غیریت کا مفہوم یہ ہے کہ دو چیزیں ایسی ہوں کہ ان میں سے ایک کا تصور دوسرے کے بغیر ممکن ہو خواہ نفس الامر میں ان کا انفکاک نہ ہو لیکن تصور ایک کا دوسرے کے بغیر ہو جائے تو پھر اعتراض وارد نہ ہو گا۔ کیونکہ عالم اگرچہ نفس الامر میں صانع عالم سے منفک نہیں ہے لیکن بغیر صانع کے عالم کا تصور ہو سکتا ہے اور بارہا ایسا ہوتا ہے کہ عالم کا تصور ہمارے ذہن میں ہوتا ہے اور صانع کا نہیں ہوتا اور اگر عالم کے تصور سے صانع کا تصور بھی لازم آتا ہو تو پھر صانع عالم کے وجود پر دلائل پیش کرنا لغو فعل ہوتا حالانکہ اس کے اثبات پر دلائل پیش کئے جاتے ہیں لہٰذا عالم اور صانع کے درمیان ثابت ہو گئی۔

سوال: اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر یہی بات ہے تو دس میں سے ایک کا تصور بھی بغیر دس کے ہو سکتا ہے اور واحد کے تصور کے بعد دس کو دلیل سے ثابت کیا جا سکتا ہے تو پھر واحد اور دس کو بھی غیر کہو حالانکہ آپ ان میں مغایرت کے قائل نہیں؟

جواب: یہ ہے کہ دس میں ایک کا تصور بھی بغیر دس کے نہیں ہو سکتا اور دس کا تصور بھی ایک کے بغیر نہیں ہو سکتا کیونکہ یہاں پر وصف اضافت معتبر ہے یعنی وہ ایک جو دس میں ہے اور وہ دس جو کہ ایک بھی اس کا جزء ہے لہٰذا اس تقریر سے معلوم ہوا کہ جزاور کل کے درمیان اور عالم اور صانع کے درمیان مغایرت ہے۔

علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف سے اس جواب پر تین اعتراضات

علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جواب غلط ہے اس پر تین اعتراضات وارد ہیں:

(۱) اس جواب کی صورت میں مشائخ کے قول کی غلط ترجمانی ہو گی کیونکہ مشائخ اشاعرہ اس بات پر متفق ہیں کہ صفات باری تعالیٰ آپس میں مغایر نہیں اس لئے کہ سب ازلی ہیں اور غیریت کی اس تفسیر سے مغایرت لازم آتی ہے۔

(۲) اور اگر غیریت کی یہی تفسیر لی جائے تو عرض جزئی اور محل جزئی میں مغایرت نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ کسی عرض جزئی کا تصور بغیر محل جزئی کے نہیں ہو سکتا تو غیریت نہ ہوئی حالانکہ عرض اور محل بالاتفاق مغایر ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ یہ تفسیر غلط ہے۔

(۳) اگر اضافت کا اعتبار کیا جائے جیسے واحد من العشرۃ تو اس میں دو خرابیاں لازم آتی ہیں پہلی خرابی یہ ہے کہ ہر دو متضائفین کے درمیان مغایرت نہ ہو کیونکہ ایک کا تصور دوسرے کے بغیر ممکن نہیں جیسے اب اور ابن یا جیسے علت اور معلول کہ ان سب کے درمیان علاقہ تضائف ہے حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں بہرحال اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان سب کے درمیان علاقہ تضائف ہے حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں بہرحال اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اگر غیریت کی مذکورہ تعریف کی جائے تو اس سے یہ تمام خرابیاں لازم آتی ہیں لہٰذا یہ باطل ہے۔

صاحب مواقف کی طرف سے اشاعرہ کے قول "لاھو ولا غیرہ" کی ایک عمدہ توجیہہ

علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اشاعرہ کی طرف سے غیریت کی ایک عمدہ توجیہ پیش کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اجزاء محمولہ اور غیر محمولہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

صاحب مواقف نے اشاعرہ کے قول "لاھو ولا غیرہ" کی ایک ایسی توجیہ ذکر کی ہے جس سے ارتفاع نقیضین اور اجتماع نقیضین کے لزوم کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ انہوں نے مواقف میں جو کچھ کہا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ صفات ذات پر محمول ہوتی ہیں اور ذات ان کے لئے موضوع ہوتی ہے اور موضوع اور محمول کے درمیان وجود خارجی کے اعتبار سے اتحاد یعنی خارج میں دونوں کا ایک ہی مصداق ہونا ضروری ہے تاکہ حمل درست ہو اور مفہوم کے اعتبار سے دونوں کا متغایر ہونا ضروری ہے تاکہ حمل مفید ہو۔ جیسے "الانسان کاتب" کہ موضوع اور محمول وجود خارجی میں متحد ہیں خارج میں جو ذات انسان کا مصداق ہے وہی کاتب کا مصداق ہے مگر مفہوم لغوی کے اعتبار سے اتحاد نہ ہونے کی وجہ سے یہ حمل درست ہے اور برخلاف "الانسان انسان" کے کہ موضوع اور محمول کے درمیان مفہوم کے اعتبار سے مغایرت نہ ہونے کی وجہ سے یہ حمل مفید نہیں کیونکہ حمل کے مفید ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لفظ موضوع سے جو معنی سمجھ میں آتا ہے لفظ محمول سے اس سے زائد کوئی بات معلوم ہو اور یہاں ایسا نہیں ہے تو صاحب مواقف کا یہ کہنا ہے کہ جب صفات اپنے موصوف ذات پر محمول ہوتی ہیں اور محمول اپنے موضوع کا وجود خارجی میں عین اور مفہوم میں اس کا غیر ہوتا ہے تو ایسا کیوں نہیں ہوسکتا کہ اشاعرہ کی مراد "لاھو ولا غیرہ" سے یہ ہو کہ صفات مفہوم کے اعتبار سے عین ذات نہیں بلکہ غیر ہیں اور وجود خارجی کے اعتبار سے غیر ذات نہیں بلکہ عین ہیں جس طرح

ہر محمول اپنے موضوع کے مقابلہ میں اسی طرح ہوتا ہے۔اس صورت میں عینیت اور غیریت کی جہتیں بدل جانے کی وجہ سے نہ ارتفاع نقیضین لازم آئے گا اور نہ اجتماع نقیضین۔

علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توجیہ مذکورہ کی تردید

تردید کا حاصل یہ ہے کہ علم، قدرت، سمع، بصر وغیرہ صفات ہیں جو ذات پر محمول نہیں ہوتیں، چنانچہ **"اللہ علم"** یا **"اللہ قدرت"** نہیں کہا جاتا بلکہ ذات واجب پر محمول اسماء صفات عالم، قادر، سمیع و بصیر وغیرہ ہوتے ہیں، جو صفات سے مشتق ہیں، لہٰذا مذکورہ توجیہ اسماء صفات عالم، قادر وغیرہ کے بارے میں تو درست ہوگی صفات مثلاً علم، قدرت وغیرہ کے بارے میں یہ توجیہ درست نہیں ہوگی حالانکہ اشاعرہ کا قول **"ھی لا ھو و لا غیرہ"** صفات کے بارے میں ہے نہ کہ اسماء صفات کے بارے میں۔

اور نہ اجزاء غیر محمولہ مثلاً **واحد من العشرہ** اپنے کل یعنی عشرہ پر اور **ید زید** اپنے کل یعنی زید پر محمول نہیں ہوتا، پس **واحد من العشرہ** اور اس کے کل عشرہ کے درمیان اسی طرح **ید زید** اور اس کے کل زید کے درمیان نہ عینیت ہے اور نہ غیریت ہے اس کے باوجود ان دونوں پر **"لا ھو بحسب المفھوم و لا غیرہ بحسب الوجود"** صادق نہیں ہے۔

واضح رہے کہ مرکبات کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ذہنیہ (۲) خارجیہ

مرکبات ذہنیہ کے اجزاء کا کل پر بھی حمل جائز ہے اور آپس میں اجزاء کے اندر بھی حمل جائز ہے جیسے **"الانسان ناطق یا الانسان حیوان"** ان کو اجزاء محمولہ کہتے ہیں مرکبات خارجیہ میں نہ تو کل

کا جز پر حمل جائز ہے اور نہ اجزاء میں سے بعض کا بعض پر حمل جائز ہے لہٰذا نہیں کہہ سکتے کہ سیمنٹ مکان ہے یا لوہا کمرہ ہے۔ ان کو اجزاء غیر محلولہ کہتے ہیں۔

اب سمجھیئے کہ ایک کا دس پر اور دس کا ایک پر حمل درست نہیں لہٰذا نہیں کہہ سکتے کہ ایک دس ہے یا دس ایک ہے کیونکہ یہ موجودات ذہنیہ میں سے نہیں ہے۔

علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اپنے قول پر سند پیش کرنا:

یہاں علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مقصود اپنی بات پر شیخ ابو المعین کے قول سے سند پیش کرنا ہے۔

ابھی ما سبق میں کہا تھا کہ اجزاء غیر محلولہ نہ اپنے کل کا عین ہیں اور نہ ان کا غیر ہیں اس کے باوجود صاحب مواقف کی توجیہ ”**لا ھو بحسب المفھوم و لا غیرہ بحسب الوجود**“ صادق نہیں ہے اور اب اجزاء غیر محلولہ کا اپنے کل کا غیر نہ ہونے پر شیخ ابو المعین کے قول سے سند پیش کر رہے ہیں شیخ ابو المعین نے اپنی کتاب تبصرہ میں ذکر کیا ہے کہ **واحد من العشرہ** کا عشرہ کے غیر ہونے کا اور ید زید کے زید کے غیر ہونے کا متکلمین میں سے کوئی بھی قائل نہیں ہے حتیٰ کہ معتزلہ بھی اس کے قائل نہیں، صرف جعفر بن حارث معتزلی اس کا قائل ہے جس پر تمام معتزلہ نے اس کی مذمت کی ہے اور اس کی اس بات کو اس کی جہالت پر محمول کیا ہے اس لئے کہ عشرہ ان تمام افراد اور کارروائیوں پر صادق آئے گا کہ وہ باقی نو اکائیوں کے ساتھ مل کر عشرہ ہے پس اگر واحد من العشرہ عشرہ کا غیر ہو گا تو چونکہ اس عشرہ میں خود بھی داخل ہے اس لئے اپنا بھی غیر ہو گا، نیز جب واحد اور عشرہ میں مغایرت ہو گی در آں حالیکہ شی اپنی مغایر کے بغیر پائی جاتی ہے تو عشرہ کا بدوں واحد کے پایا جانا لازم آئے گا۔ اسی طرح اگر ید زید غیر زید ہو گا تو اپنا بھی غیر ہونا لازم آ جائے گا کیونکہ زید میں وہ

بھی داخل ہے اور ''مغايرة الشی لنفسه'' باطل ہے۔ کیونکہ شی کا کسی چیز میں داخل ہونا عدم مغایرت پر دلالت نہیں کرتا نیز عشرہ تمام آحاد کے مجموعہ کا نام ہے ہر واحد کو عشرہ نہیں کہیں گے۔[24]

خلاصہ:

یہ ہے کہ ایک کے دوسرے کے عین ہونے کا مطلب ہے کہ دونوں مفہوموں کا مصداق ہر اعتبار سے ایک ہی ہو اور ہر ایک کے دوسرے کے غیر ہونے کا مطلب ہے ان میں سے ایک دوسرے کے بغیر موجود ہو سکتا ہے۔

اس تفسیر کے مطابق ذات حق اور صفات میں نہ عینیت ہوئی نہ غیریت ہوئی۔ عینیت تو اس لئے نہ ہوئی کہ اس کے معنی ہیں دو چیزوں کا بالکل ایک ہونا اور چونکہ صفات، ذات پر زائد ہوتی ہیں تو دونوں کا مصداق تمام اعتبارات سے ایک نہ ہو لہٰذا صفات الٰہی ذات الٰہی کا عین نہ ہوئیں۔

اور غیریت اس لئے نہ ہوئی کہ یہاں ذات اور صفات دونوں میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں کہ دوسرے کے بغیر اس کا پایا جانا ممکن ہو۔ صفات تو ذات کے بغیر اس لئے موجود نہیں ہو سکتیں کہ صفات تابع ہوتی ہیں اور ذات متبوع ہوتی ہے اور تابع کا وجود متبوع کے بغیر محال ہے۔ اور ذات صفات کے بغیر اس لئے نہیں پائی جاسکتی کہ ذات الٰہی کا صفات کمال سے خالی ہونا لازم آتا ہے اور وہ محال ہے لہٰذا ایک دوسرے کے لئے لازم ہوا۔ اس لئے غیریت بھی نہ ہوئی۔[25]

---

[24] (اشرف الفوائد شرح شرح العقائد؛ نسفی، ص ۲۵۳، ۲۹۶)

[25] (اسلامی عقائد، مفتی عبد الواحد صاحب، ص ۲۲)

الصِّفَةُ لَا عَيْنُ الْمَوْصُوفِ وَلَا غَيْرُهُ. وهَذَا لَهُ مَعْنًى صَحِيحٌ، وَهُوَ: أَنَّ الصِّفَةَ لَيْسَتْ عَيْنَ ذَاتِ الْمَوْصُوفِ الَّتِي يَفْرِضُهَا الذِّهْنُ مُجَرَّدَةً بَلْ هِيَ غَيْرُهَا، وَلَيْسَتْ غَيْرَ الْمَوْصُوفِ، بَلِ الْمَوْصُوفُ بِصِفَاتِهِ وَاحِدٌ غَيْرُ مُتَعَدِّدٍ۔[26]

"وھی لا ھو و لا غیرہ یعنی ان صفات اللہ تعالیٰ لیست عین الذات و لا غیر الذات فلا یلزم قدم الغیر و لا تکثر القدماء تفریع علی عدم المغایرۃ"۔[27]

صفات خداوندی ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ایسی نسبت رکھتی ہیں کہ ان کو نہ عین ذات کہہ سکتے ہیں اور نہ غیر ذات جیسا کہ نور کو نہ آفتاب کا عین کہہ سکتے ہیں نہ غیر بلکہ یہ کہیں گے کہ آفتاب تو معدن نور اور منبع ضیاء کا نام ہے اور نور اس کے لئے لازم ہے جیسا کہ چار کے لئے زوجیت اور پانچ کے لئے فردیت اسی طرح صفات خداوندی ذات باری تعالیٰ کے لئے لازم ذات ہیں کہ ان صفات اور کمالات کا ذات خداوندی سے جدا ہونا ممکن اور محال ہے۔

یہی تمام اہل سنت والجماعت، اشاعرہ اور ماتریدیہ کا مسلک ہے کہ صفات خداوندی لازم ہیں اور اسی کو امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مکتوبات میں اختیار فرمایا ہے اور حکماء اور صوفیہ جو عینیت کے قائل ہوئے ان کا شد و مد کے ساتھ رد کیا ہے۔[28]

تنبیہ:

یہ بات بھی ذہن نشین ہونی چاہیئے کہ اگر صفات میں عینیت کا لفظ آ جائے تو اس سے عینیت حکمی مراد ہوتا ہے اور اگر غیریت کا لفظ آ جائے تو مراد غیریت منطقی ہوتا ہے۔**فافهم۔**

(حضرت مولانا سجاد الحجابی دامت برکاتہم العالیہ)

---

[26] (شرح الطحاویۃ فی العقیدۃ السلفیۃ، ج ۱، ص ۴۹)

[27] (نبراس، ص ۱۲۸)

[28] (علم الکلام، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، ص ۱۷۲، ۱۷۳)

اللہ تعالیٰ کی صفات میں ترتیب نہیں ہے

یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں ترتیب زمانی نہیں ہے (البتہ سمجھنے کے طور پر ترتیب عقلی ہو سکتی ہے) یعنی یہ کہنا درست نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی فلاں صفت (زمانہ کے اعتبار سے) پہلے ہے اور فلاں صفت بعد میں۔ اس کی تمام صفات ازلی اور قدیم ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں کہ اس کا علم اس کی قدرت سے پہلے ہے اس کی قدرت اس کے علم کے بعد ہے یا اس کی حیات اس کے علم سے پہلے ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ سے حی اور علیم اور قدیر ہے۔[29]

اب تک صرف اتنی بات معلوم ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کی بہت ساری صفات ہیں اب ان کی تفصیل بیان کی جارہی ہے۔ اشاعرہ کے نزدیک باری تعالیٰ کی صفات سات ہیں:

(۱) حیات (۲) علم (۳) قدرت (۴) سمع

(۵) بصر (۶) ارادہ (۷) کلام

اور ماتریدیہ کے نزدیک صفات حقیقیہ کی تعداد آٹھ ہے، جن میں سات تو وہی مذکورہ صفات ہیں اور آٹھویں صفت (۸) ''تکوین'' ہے۔ ان سات یا آٹھ کا نام صفات ذاتیہ ہے، ان کے علاوہ کو صفات افعال کہا جاتا ہے۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ تکوین مستقل صفت نہیں جبکہ ماتریدیہ صفت تکوین کو مستقل صفت مانتے ہیں۔

۱۔ صفت حیات

پس ضروری ہے کہ باری تعالیٰ میں صفت حیات اس درجہ کامل اور اکمل ہو کہ واہمہ موت سے بھی پاک ہو اور تمام عالم کی حیات اسی کی حیات کا پرتو اور فیض ہو حیات اس کے لئے ذاتی اور اصلی اور

---

29 (اسلامی عقائد، ص ۲۱)

خانہ زاد ہو اور کیوں نہ ہو اس لئے کہ ایسے بدیع عالم کا ایک میت اور جماد سے صادر ہونا عقل محال سمجھتی ہے اور باقی عالم کی حیات اسی کی بخشش اور عطا کر ثمرہ ہے۔

کماقال اللہ تعالیٰ: اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ (البقرۃ ۲۵۵)

ترجمہ: اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ آپ زندہ اور اوروں کا قائم رکھنے والا۔

وقال اللہ تعالیٰ: الَّذِي أَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ (الحج ٦٦)

ترجمہ: جس نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں جِلائے گا۔

(علم الکلام مولانا محمد ادریس کاندہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

وقال اللہ تعالیٰ: الم (۱) اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ (آل عمران ۲)

ترجمہ: الم اللہ ہے جس کے سوا کسی کی پوجا نہیں (ف ۲) آپ زندہ اوروں کا قائم رکھنے والا۔

وقال اللہ تعالیٰ: هُوَ الْحَيُّ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ (الغافر ٦٥)

ترجمہ: وہی زندہ ہے اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں۔

وقال اللہ تعالیٰ: وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ (الفرقان ۵۸)

ترجمہ: اور بھروسہ کرو اس زندہ پر جو کبھی نہ مرے گا۔

وقال اللہ تعالیٰ: وَعَنَتِ الْوُجُوهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ (طٰہٰ ۱۱۱)

ترجمہ: اور سب منہ جھک جائیں گے اس زندہ قائم رکھنے والے کے حضور۔

عن ابن عباس أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کان یقول: اللھم لک أسلمت و بک آمنت و علیک توکلت و إلیک أنبت و بک خاصمت أعوذ بک لا إلہ إلا أنت أن تضلني أنت الحي الذي لا یموت و الجن و الإنس یموتون۔[30]

---

30 (صحیح ابن حبان، ج۳، ص ۱۸۰)

۲۔صفت علم

اللہ تعالیٰ علم والا ہے جس سے آسمانوں اور زمین میں کوئی ذرہ پوشیدہ نہیں ہے۔

بر و علم یک ذرہ پوشیدہ نیست
کہ پیدا و پنہاں بہ نزدش یکے ست

(اس سے ایک ذرہ کا علم بھی پوشیدہ نہیں ہے کیونکہ کھلی اور چھپی چیزیں اس کے لئے یکساں ہیں)۔

لہٰذا جو کچھ ہو رہا ہے اور ہوا ہے اور ہو گا ان سب باتوں کو پوری تفصیلات کے ساتھ ازل ہی میں جان لیا تھا کہ فلاں وقت فلاں شخص یہ کام کرے گا اور فلاں وقت میں یہ کچھ ہو گا یہاں تک کہ اگر ساتویں آسمان پر یا تحت الثریٰ میں مچھر اپنے پر کو ہلائے یا کوئی شخص اپنے دل میں کسی طرح کا وسوسہ لائے وہ بھی اس کو معلوم ہے۔[31]

اور وہ کیوں عالم نہ ہو جب اسی نے تمام عالم کو پیدا کیا اور وہی اس کو باقی رکھتا ہے اور وہی اس کی تربیت کرتا ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ان چیزوں کا جاننے والا نہ ہو کسی شئ کو وجود دینا یا اس کو باقی رکھنا یا اس کی تربیت کرتے رہنا بغیر علم کے محال ہے۔

(علم الکلام مولانا محمد ادریس کاندہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

(ا) اللہ تعالیٰ علیم کل ہے

کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ اللهَ لَا يَخْفَى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ (آل عمران ۵)

ترجمہ: اللہ پر کچھ چھپا نہیں زمین میں نہ آسمان میں۔

---

31 (اسلامی عقائد، ص ۲۲)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُونَ (الانعام ۳)

ترجمہ: اور وہی اللہ ہے آسمانوں کا اور زمین کا اسے تمہارا چھپا اور ظاہر سب معلوم ہے اور تمہارے کام جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ (الانعام ۷۳)

ترجمہ: ہر چھپے اور ظاہر کا جاننے والا اور وہی ہے حکمت والا خبر دار۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ (۶۹) وَهُوَ اللّٰهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَى وَالْآخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (القصص ۷۰)

ترجمہ: اور تمہارا رب جانتا ہے جو اُن کے سینوں میں چھپا ہے اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ اور وہی ہے اللہ کہ کوئی خدا نہیں اُس کے سوا اسی کی تعریف ہے دنیا اور آخرت میں اور اسی کا حکم ہے اور اُسی کی طرف پھر جاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ (یونس ۶۱)

ترجمہ: کوئی کام کرو ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں جب تم اس کو شروع کرتے ہو اور تمہارے رب سے ذرّہ بھر کوئی چیز غائب نہیں زمین میں نہ آسمان میں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (البقرة ۱۸۶)

ترجمہ: اور اے محبوب جب تم سے میرے بندے مجھے پوچھیں تو میں نزدیک ہوں دعا قبول کرتا ہوں پکارنے والے کی جب مجھے پکارے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (ق ١٦)

ترجمہ: اور بے شک ہم نے آدمی کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں جو وسوسہ اس کا نفس ڈالتا ہے اور ہم دل کی رگ سے بھی اس سے زیادہ نزدیک ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا يَكُونُ مِن نَّجْوَى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَدْنَى مِن ذَٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (مجادلة ٧)

ترجمہ: جہاں کہیں تین شخصوں کی سرگوشی ہو تو چوتھا وہ موجود ہے اور پانچ کی تو چھٹا وہ اور نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ کی مگر یہ کہ وہ ان کے ساتھ ہے جہاں کہیں ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ (النساء ١٠٨)

ترجمہ: آدمیوں سے چھپتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپتے اور اللہ ان کے پاس ہے۔

خلاصہ

(٢) اللہ ظاہر و باطن، خفی و جلی اور عیاں و نہاں سب جانتا ہے

(١) أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ (البقرة ٧٧)

(٢) وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ (النحل ١٩)

(٣) إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَى (الاعلیٰ ٧)

(٤) وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ (المائدة ٩٩)

(۵) إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ (الانبیاء ۱۱۰)

(۶) يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُونَ (الانعام ۳)

(۳) تمہارا پروردگار تم سب کا حال خوب جانتا ہے

(۱) رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ (بنی اسرائیل ۵۴)

(۲) قَدْ يَعْلَمُ مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ (النور ۶۴)

(۳) وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ (النساء ۲۵)

(۴) اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ (یوسف ۵۰)

(۵) وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ (محمد ۱۹)

(۶) وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا (النساء ۳۹)

(۴) اللہ تعالیٰ اگلے پچھلے سب حساب جانتا ہے

(۱) يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (البقرۃ ۲۵۵)

(۲) قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى (۵۱) قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى (طٰہٰ ۵۲)

(۳) وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (البقرۃ ۲۳۴)

(۴) وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (آل عمران ۱۵۳)

(۵) اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (۳۰)

(۶) اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (النساء ۹۴)

(۵) اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں اور ان کے گناہوں کی خبر ہے

(۱) اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا (بنی اسرائیل ۳۰)

(۲) وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا (بنی اسرائیل ۱۷)

(۳) وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا (الفرقان ۵۸)

(٦) اللہ تعالیٰ کسی کے اعمال سے بے خبر نہیں

(۱) وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (البقرۃ ۷۴)

(۲) وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ (البقرۃ ۱۴۴)

(۳) وَمَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (ھود ۱۲۳)

(۴) وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰہَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ (ابراھیم ۴۲)

(۵) وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِالْمُتَّقِیْنَ (آل عمران ۱۱۵)

(٦) ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی (النجم ۳۲)

(۷) وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ (البقرۃ ۹۵)

(۸) فَاِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِالْمُفْسِدِیْنَ (آل عمران ٦۳)

(۹) اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ مَنْ یَّضِلُّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ (الانعام ۱۱۷)

(۱۰) اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِیْنَ (الانعام ۱۱۹)

(۷) اللہ تعالیٰ سب اعمال خیر کو جانتا ہے

(۱) وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ (البقرۃ ۲۱۵)

(۲) وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَۃٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُہٗ (البقرۃ ۲۷۰)

(۸) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے

(۱) یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (الحج ۷۰)

(۲) وَرَبُّکَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (بنی اسرائیل ۵۵)

(۳) قٰلَ رَبِّیْ یَعْلَمُ الْقَوْلَ فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (الانبیاء ۴)

(۴) وَمَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ (ابراھیم ۳۸)

(۵) یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الفرقان ٦)

(٦) یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْھَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْھَا (سبا ۲)

ترجمہ: جانتا ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو زمین سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اُترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے۔

مختصر انداز محض دو الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت علم کو جو بیان فرمایا ہے، اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

(۱) وَاسِعٌ عَلِيْمٌ کا ارشاد کریم قرآن کریم میں تقریباً ۷ مقامات پر ہے۔

(۲) علیم حکیم یا علیماً حکیماً یا العلیم الحکیم یا حکیم علیم یا علیم خبیر یا الحکیم العلیم یا الحکیم الخبیر یا حکیم خبیر کم و بیش ۴۰ مقامات پر ہے۔

(۳) علیم قدیر یا العلیم القدیر یا العزیز العلیم یا الاخلاق العلیم یا علیم حلیم یا علیما حلیما یا شاکرا علیما یا لطیف خبیر۔ وغیرہ ۹ مقامات پر ہے۔

(۴) سمیع علیم یا السمیع العلیم کم و بیش ۲۸ مقامات پر ہے۔ (میزان ۹۴ بار)[32]

(۹) اللہ تعالیٰ کو ذرے ذرے کا علم ہے

بہر حال اللہ تعالیٰ کے علیم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کائنات کے ذرے ذرے کا علم ہے اس کائنات میں جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ قیامت تک ہو گا اور جو کچھ قیامت کے بعد ابد الابد تک ہو گا اللہ تعالیٰ کو ان سارے حالات کا تفصیلی علم پہلے سے حاصل ہے ابھی تک یہ حالات وواقعات دنیا میں پیش بھی نہیں آئے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کو رونما ہونے سے پہلے بھی اسی طرح تفصیلاً جانتے تھے جس طرح رونما ہونے کے بعد جانتے ہیں۔

---

[32] (توحید اور شرک کی حقیقت، ص ۱۷۵، ۱۷۹)

پہلی مثال

ایک درخت کے پتے انسان شمار نہیں کر سکتا پھر ایک باغ میں جتنے درخت ہوتے ہیں ان تمام درختوں کے پتوں کو کمپیوٹر کے ذریعے شمار نہیں کیا جا سکتا پھر پوری دنیا میں جتنے باغ ہیں مختلف قسم کے پھلوں کے الگ الگ باغ ہیں ان کے درختوں کی تعداد کتنی ہو گی اور ان درختوں کے پتوں کی تعداد کتنی ہو گی اسی طرح پوری دنیا میں کتنے جنگل ہیں ہر ہر جنگل میں کتنے کتنے درخت ہیں ان درختوں کی تعداد کتنی ہو گی اور پھر ان درختوں کے پتوں کی تعداد سوچیں، میرے دوستو! دماغ انسانی فیل ہو جائے گا، انسانی دماغ کا بنایا ہوا کمپیوٹر فیل ہو جائے گا سوچیں ان تمام درختوں کی شاخوں پر لگنے والا کوئی بھی پتہ جب حرکت کر رہا ہوتا ہے تو اس کی حرکت کو اللہ تعالیٰ جان رہے ہوتے ہیں، ان تمام درختوں کے پتوں میں سے جب کوئی پتہ زمین پر گرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اور اس کے گرنے کو جانتا ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: وَ مَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَۃٍ اِلَّا یَعۡلَمُهَا (الانعام ۵۹) اور جو پتا گرتا ہے وہ اسے جانتا ہے۔ میرے دوستو! پتے کا گرنا یہ اس کی آخری اور انتہائی حالت کو بیان کیا اور اشارہ کر دیا کہ پیدا ہونے سے لے کر خشک ہو کر گرنے تک اس پتے پر جتنے دور اور حالات گزرتے ہیں وہ سارے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتے ہیں۔ اندازہ کریں اللہ تعالیٰ کے علم کی کتنی وسعت ہو گی۔

دوسری مثال

پوری دنیا میں گندم اور جوار اور چاولوں کے کتنے کھیت ہوں گے اور ان کھیتوں میں کتنے پودے ہوں گے اندازہ کریں کہ انسان صرف ایک کھیت کے پودے نہیں گن سکتا پوری دنیا کے کھیتوں کی تعداد کتنی ہو گی ان کھیتوں کے درمیان میں اگنے والے پودوں کی تعداد کتنی ہو گی اور ان پودوں کے

زمین میں چھپے ہوئے بیجوں کی تعداد کتنی ہوگی اندازہ کریں ان دانوں میں سے کوئی بھی دانہ زمین کی تاریکی میں چھپا ہوا ایسا نہیں ہوتا جس کو اللہ تعالیٰ نہ جانتے ہوں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ لَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (الانعام ۵۹) اور کوئی دانہ نہیں زمین کی اندھیریوں میں اور نہ کوئی تر اور نہ خشک جو ایک روشن کتاب میں لکھا نہ ہو۔

سبحان اللہ! اندازہ کریں اللہ تعالیٰ کیسے وسیع علم والے ہیں۔

تیسری مثال

ایک بالشت زمین میں ریت کے کتنے ذرات ہوں گے۔ صرف ایک بالشت زمین کے دوران کو سارے انسان مل کر شمار کرنا شروع کر دیں تو انسانی دماغ فیل ہو جائیں گے اور انسانی دماغ کے بنائے ہوئے کمپیوٹر فیل ہو جائیں گے مگر ایک بالشت زمین کے ریت کے ذرات شمار کرنے میں نہیں آئیں گے، پھر پوری دنیا میں کتنی زمین ہوگی اور اس پوری زمین کے ریت کے ذرات اور دانے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتے ہیں۔ ان دانوں میں سے کوئی دانہ اور ریت کے ان ذرات میں سے کوئی ذرہ جب بھی حرکت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو جان رہے ہوتے ہیں۔

چوتھی مثال

ایک جانور کے بدن اور جسم پر کتنے بال ہوتے ہیں ان کو شمار کرنا مخلوق کے بس سے باہر ہے پھر پوری دنیا میں کتنے جانور ہیں شہروں میں رہنے والے پالتو جانور اور جنگلوں میں رہنے والے شکاری جانوروں کے بدن پر کتنے بال ہوں گے سارے انسان اور جنات اور انسانوں کے بنائے ہوئے کمپیوٹر مل کر بھی ان بالوں کی تعداد کا اندازہ نہیں کر سکتے پھر ان میں بعض جانور اون والے ہوتے ہیں جن کے بدن پر بال زیادہ ہوتے ہیں۔

پوری دنیا میں جتنے جانور ہیں ان تمام جانوروں کے بدن پر جتنے بال ہوتے ہیں ان تمام بالوں میں سے ہر ہر بال کو پیدا ہونے سے لے کر اس کے گرنے تک کے سارے حالات سمیت اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، اندازہ کریں کہ اللہ تعالیٰ کی وسعت علم کا اور یہ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

مشہور حدیث آپ نے یقیناً سنی ہوگی کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ انسان جو قربانی کا جانور ذبح کرتا ہے اس جانور کے بدن پر جتنے بال ہوتے ہیں ان میں سے ہر ہر بال کے بدلے میں انسان کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کیا اون والے جانوروں کے بالوں کا بھی یہی حکم ہے کہ ان کے ہر ہر بال کے بدلے میں قربانی کرنے والے کو ایک ایک نیکی ملے گی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہاں اون والے جانوروں کا بھی یہی حکم ہے۔ یعنی ان کے ہر ہر بال کے بدلے میں بھی قربانی کرنے والے کو ایک ایک نیکی ملے گی اب میرے دوستو! اندازہ کریں ہر سال پورے عالم اسلام میں کتنے جانور ذبح ہوتے ہوں گے صرف حرم میں ہی حاجی صاحبان لاکھوں جانور ذبح کرتے ہیں اور ہر ہر بال کے بدلے میں ان تمام قربانی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ایک ایک نیکی عطا فرماتے ہیں اور ان کے نامۂ اعمال میں فرشتے لکھ بھی دیتے ہیں۔ تو کیا جانے بغیر ہی ان بالوں کے بدلے میں قربانی کرنے والوں کو نیکیاں عطاء فرمارہے ہیں؟۔

درختوں کے پتے، غلے اور اناج کے دانے، ریت کے ذرات اور جانوروں کے بال یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے تو کیا وہ اپنی پیدا کی ہوئی چیز کو بھی نہ جانے گا؟۔ سورۃ الملک میں یہی بات ارشاد فرمائی: اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ وَ ھُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ (الملک ۱۴) کیا وہ نہ جانے جس نے پیدا کیا اور وہی ہے ہر باریکی جانتا خبردار۔

پانچویں مثال

اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بڑے علم عطاء فرمائے ہیں ایک نبی کو اللہ تعالیٰ نے اتنا زیادہ علم عطاء فرمایا ہوا ہے کہ ساری کائنات کے انسانوں کے علم کو نبی کے علم کے مقابلے میں اتنی نسبت بھی حاصل نہیں ہوئی جتنی ایک قطرے کو سمندر کے مقابلے میں حاصل ہوتی ہے پھر انبیاء علیہم السلام میں سے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ علم عطاء فرمایا ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اؤتیست علم الاولین والآخرین۔ مجھے پہلوں کے بھی علم عطاء ہوئے اور پچھلوں کے بھی علم عطاء ہوئے آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کے انسانوں کا علم، انبیاء علیہم السلام کا بھی علم جمع کیا جائے تو سرکار دوعالم ﷺ کے علم کے مقابلے میں اتنی حیثیت بھی حاصل نہ ہو گی جتنی قطرے کو سمندر کے مقابلے میں حاصل ہو۔ اور یہ بالکل حقیقت ہے کوئی مبالغہ نہیں میرے دوستو! تیئس سال کے قلیل عرصے میں آپ ﷺ نے ارشادات کی شکل میں اپنے علوم کا جو تھوڑا سا ذرہ ظاہر فرمایا تھا وہ ایسا سمندر ہے جس کی تہ میں علم کے موتیوں اور مسائل کا اتنا وسیع خزانہ ہے کہ چودہ سو سال کا زمانہ گزر چکا علماء فقہاء اسی خزانے میں سے موتی نکال دیتے ہیں مسائل کا استنباط کرتے ہیں اور محدثین ان ارشادات کی شرح فرمارہے ہیں۔ بیان بھی کر رہے ہیں اور لکھ بھی رہے ہیں کتب خانوں کے کتب خانے تیار ہو چکے مگر وہ خزانہ اب تک ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ اور ان شاء اللہ قیامت تک ختم نہیں ہو گا۔

اس سے اندازہ کریں کہ جس دریا کے ایک قطرے کا یہ حال ہے اس دریا کی اپنی موجوں کی کیا کیفیت ہو گی؟ سرکار دوعالم ﷺ کے سینے میں آپ کے قلب اطہر میں جو علوم کا دریا موجزن ہے اس کی وسعت کا کچھ اندازہ لگ سکتا ہے مگر اتنی وسعت علمی کے باوجود ساری کائنات کے تمام

انسانوں کا علم بھی، تمام فرشتوں کا علم بھی، جنات کا علم بھی اور تمام انبیاء علیہم السلام کا علم بھی اور سرکار دوعالم ﷺ کا علم بھی جمع کیا جائے تو ان سارے علوم کو اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں اتنی نسبت بھی حاصل نہ ہوگی جتنی قطرے کو سمندر کے مقابلے میں حاصل ہے۔

اس لئے کہ قطرہ بھی محدود ہے اور سمندر بھی اپنی وسعت کے باوجود محدود ہے لیکن ساری کائنات کا علم محدود ہے اور اللہ تعالیٰ کا علم غیر محدود ہے۔ کہ اس کی معلومات غیر محدود ہیں تو محدود کو غیر محدود سے کیا نسبت ہو سکتی ہے اور یہ مضمون خود حدیث سے ثابت ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ بنی اسرائیل کے مجمع میں وعظ فرمایا، تقریر فرمائی اور تقریر ایسی عجیب و غریب تی کہ موسیٰ علیہ السلام نے علوم کے دریا بہا دیئے۔ پیغمبر کا علم اور پیغمبر کا انداز بیان تھالوگ بڑے متاثر ہوئے۔ ایک آدمی نے کھڑے ہو کر موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا: اے موسیٰ علیہ السلام اس وقت دنیا میں آپ سے بھی بڑا کوئی عالم موجود ہے؟ تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: نہیں۔ یعنی اس وقت پوری دنیا میں شریعت کا علم سب سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام کو حاصل تھا، لیکن جواب کا انداز اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا۔ پیغمبر علیہم السلام چونکہ بارگاہ الٰہی میں مقرب ہوتے ہیں، ان کی معمولی بات پر بھی پکڑ آجاتی ہے، تو موسیٰ علیہ السلام کے جواب کا انداز اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس کا جواب بجائے اللہ تعالیٰ کے علم کے سپرد کرنے کے اور بجائے اللہ اعلم کہنے کے یوں ارشاد فرمایا۔ اور وحی آئی کہ مجمع البحرین کے مقام پر ہمارا ایک بندہ رہتا ہے وہ آپ سے زیادہ علم والا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے پتہ پوچھا، پتہ بتادیا گیا، موسیٰ علیہ السلام سفر کر کے وہاں تک پہنچے تو حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی ان کے پاس علم حاصل کرنے کے لئے ٹھہر گئے۔

ایک مرتبہ موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام دونوں کشتی پر سوار ہو کر جارہے تھے کہ ایک چڑیا آئی اور کشتی کے تختے پر آکر بیٹھ گئی اور اپنی چونچ میں پانی کا ایک قطرہ لیا اور اُڑ گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام یہ منظر دیکھ رہے تھے، حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو متوجہ کر کے ارشاد فرمایا: اے موسیٰ علیہ السلام تیرا علم اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں اتنی حیثیت بھی نہیں رکھتا جتنی حیثیت اس چڑیا کی چونچ والے قطرے کو باقی سمندر کے مقابلے میں حاصل ہے۔ یہ اس لئے کہ قطرہ بھی محدود ہے اور سمندر بھی اپنی وسعت کے باوجود محدود ہے۔ لیکن ساری کائنات کے انسانوں کا علم، فرشتوں کا علم اور جنات کا علم محدود ہے مگر اللہ تعالیٰ کا علم غیر محدود ہے تو محدود کو غیر محدود سے کیا نسبت ہو سکتی ہے، بڑے سے بڑے علم والے کو کہیں نہ کہیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ بات مجھے نہیں معلوم باقی کو چھوڑیں۔

خود سرور دو عالم ﷺ کے پاس جبرائیل علیہ السلام انسانی شکل میں آئے اور آکر سوالات کیئے ایمان کے بارے میں، اسلام کے بارے میں اور احسان کے بارے میں آپ ﷺ نے سب کے جوابات دے دیئے آخر میں جبرائیل علیہ السلام نے پوچھا "ومتی الساعة یا رسول اللہ ﷺ" اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ﷺ بتائیں قیامت کب آئے گی تو سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا "ما المسول عنها بأعلم من السائل" پوچھا ہوا قیامت کے بارے میں پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا یعنی جس طرح تجھے قیامت کے آنے کا وقت معلوم نہیں اسی طرح مجھے بھی معلوم نہیں، دیکھا آپ سرکار دو عالم ﷺ کا علم کتنا وسیع تھا مگر وہ بھی ایک حد پر جاکر ٹھہر گیا آپ کو یہ فرمانا پڑا کہ یہ بات مجھے معلوم نہیں۔

اسی طرح ایک آدمی سرکار دوعالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ﷺ بتائیں کہ دنیا میں سب سے بہترین جگہ کون سی ہے اور سب سے بدترین جگہ کون سی ہے؟ تو فرمایا مجھے معلوم نہیں، جبرئیل امین علیہ السلام آئیں گے تو پوچھ کر بتاؤں گا، چنانچہ جبرئیل امین علیہ السلام آئے آپ ﷺ نے ان سے یہی سوال فرمایا، جبرئیل امین علیہ السلام نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ یہ بات تو مجھے بھی معلوم نہیں ہے اللہ تعالیٰ سے پوچھ کر آؤں گا تو آپ ﷺ کو آکر بتاؤں گا، تمام فرشتوں کا سردار فرشتہ اور تمام انبیاء علیہم السلام پر وحی لانے والا معزز فرشتہ بھی کہہ رہا ہے کہ یہ بات مجھے معلوم نہیں اس کو علم کی حد کہتے ہیں، چنانچہ جبرئیل امین علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے جاکر یہ بات پوچھی تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا سب سے بہترین جگہ مساجد ہیں اور سب سے بدترین جگہ بازار ہیں۔

جبرئیل امین علیہ السلام نے یہی جواب آکر آپ ﷺ کو بتادیا اور عرض کیا کہ آج چونکہ میں آپ کا قاصد بن کر گیا آپ کے قاصد ہونے کی برکت سے اللہ تعالیٰ سے مجھے اتنا زیادہ قرب نصیب ہوا کہ اس سے پہلے کبھی بھی اس سے زیادہ قرب نصیب نہیں ہوا تھا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جبرئیل علیہ السلام کتنا قرب نصیب ہوا؟ جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں آج اللہ تعالیٰ کے اتنا قریب ہوا کہ میرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان صرف ستر ہزار نورانی حجاب حائل تھے۔

بہر حال میرے دوستو! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ تمام انسانوں اور فرشتوں اور جنات کے علوم محدود ہیں کسی نہ کسی حد پر جا کر ان کی انتہاء ہو جاتی ہے اور یہ کہنا پڑتا ہے یہ بات مجھے معلوم نہیں، لیکن میرے دوستو! اللہ تعالیٰ کے علوم غیر محدود ہیں ان کی انتہاء کی حد نہیں۔[33]

(۳) صفت قدرت

اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے قدرت والا ہے کوئی شے اس کی قدرت سے باہر نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن عزیز میں ہے:

(۱) اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (البقرۃ ۲۰)

بے شک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

وہ موجود کو معدوم (ختم) اور معدوم کو موجود کر سکتا ہے۔[34]

(۲) أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللهَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ (۱۹) وَمَا ذَلِكَ عَلَى اللهِ بِعَزِيزٍ (ابراھیم ۲۰)

کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ نے آسمان و زمین حق کے ساتھ بنائے اگر چاہے تو تمہیں لے جائے اور ایک نئی مخلوق لے آئے اور یہ اللہ پر کچھ دشوار نہیں۔

(۳) وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَكَفَى بِاللهِ وَكِيلًا (۱۳۲) إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِآخَرِينَ وَكَانَ اللهُ عَلَى ذَلِكَ قَدِيرًا (النساء ۱۳۳)

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں اور اللہ کافی ہے کارساز (کام بنانے والا)۔ اے لوگو وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور اَوروں کو لے آئے اور اللہ کو اس کی قدرت ہے۔

---

33 (صدائے منبر، حضرت مولانا مفتی محمد ادریس صاحب، ص ۱۹۵، ۲۰۷)

34 (اسلامی عقائد از مفتی عبد الواحد، ص ۲۹)

(۴) قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلَى قُلُوبِكُمْ مَنْ إِلَهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِهِ (الانعام ۴۶)

تم فرماؤ بھلا بتاؤ تم اگر اللہ تمہارے کان آنکھ لے لے اور تمہارے دلوں پر مُہر کر دے تو اللہ کے سوا کون خدا ہے کہ تمہیں یہ چیزیں لا دے۔

(۵) إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۸۲) فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (یٰس ۸۳)

اس کا کام تو یہی ہے کہ جب کسی چیز کو چاہے تو اس سے فرمائے ہو جا وہ فوراً ہو جاتی ہے تو پاکی ہے اسے جس کے ہاتھ ہر چیز کا قبضہ ہے اور اسی کی طرف پھیرے جاؤ گے۔

(۶) وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا (فاطر ۴۴)

اور اللہ وہ نہیں جس کے قابو سے نکل سکے کوئی شے آسمانوں اور زمین میں بے شک وہ علم و قدرت والا ہے۔

مخلوقات میں جو کچھ بھی قدرت اور اختیار ہے وہ سب اسی کا فیض اور عطیہ ہے پس یہ کس طرح ممکن ہے کہ مخلوقات تو اپنے افعال میں قادر اور مختار ہوں اور اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں مجبور اور مضطر ہو ہر سلیم الفطرت جانتا ہے کہ قدرت اور اختیار صفت کمال ہے اور ایجاب اور اضطرار کھلا ہوا عیب ہے۔

قال النبی ﷺ فی دعاء الاستخارہ: اللهم إني أستخيرک بعلمک وأستقدرک بقدرتک۔[35]

[35] (صحيح البخاري، ج ۱، ص ۳۹۱_الناشر: دار ابن كثير، اليمامة-بيروت)

و قادر بقدرته التی ہی صفته الازلية السرمدية و المعنى انه اذا قدر على شئی فانما يقدر عليه بقدرته القديمة لا بالقدرة الحادثة كما توجد للاشياء الممكنة فهو الحی القيوم۔[36]
الكلام فی القدرة هی الاختيار فی الفعل و الترک و اجمع اهل السنة على ان الحق سبحانه فاعل بالقدرة فان شاء لم يفعل۔[37]

وہ قادر مختار ہے جس طرح چاہے تصرف کرے

قال اللہ تعالیٰ: لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ (الانبیاء ۲۳)

اُس سے نہیں پوچھا جاتا جو وہ کرے اور اُن سب سے سوال ہو گا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مکتوبات میں فرماتے ہیں کہ فلاسفہ نے اپنے سفاہت سے ایجاب اور اضطرار ہی کو کمال سمجھا اور حق تعالیٰ شانہ کو ایسا معطل اور بے کار خیال کیا کہ اس سے سوائے ایک مصنوع کے صدور جائز نہ رکھا اور وہ بھی بالایجاب و الاضطرار اور تمام حوادث کو عقل فعال کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ جس کا وجود سوائے ان کے تخیل اور توہم کے کہیں ثابت نہیں۔

فلاسفہ کو مناسب تھا کہ حوادث اور اضطرار کے وقت عقل فعل سے التجاء کرتے اور خدائے ذوالجلال کی طرف رجوع نہ کرتے اس لئے کہ ان کے زعم میں حوادث کا تعلق خدائے ذوالجلال سے نہیں بلکہ عقل فعل سے ہے خدا تعالیٰ تو ان کے نزدیک فاعل بالایجاب ہے مصائب اور آلام کے رفع کرنے کی اس کو قدرت اور اختیار نہیں۔

---

36 (فقہ اکبر، ص ۱٦)

37 (مرام الکلام، ص ۳۳)

دو چیزیں اس فرقہ کی خصوصیات سے ہیں:

اول: احکام منزلہ اور اخبار مرسلہ کی تکذیب اور انکار اس فرقہ کا خاص شعار ہے۔

دوم: یہ کہ اس فرقہ نے اپنے مطالب واہیہ کے ثابت کرنے میں جس قدر تلبیس اور تلمیع سے کام لیا ہے اس کی نظیر نہیں اور جس درجہ ان کو اپنے مظنون اور موہوم اور خیالی مقاصد کے ثابت کرنے میں خبط لاحق ہوا ہے وہ کسی سفیہ اور نادان کو بھی نہیں ہوا اور علی ہذا اس فرقہ کے تمام متسق اور منتظم حلائل محض لایعنی اور لاطائل ہیں۔

پہلا جواب: پہلا جواب یہ ہے کہ قادر کی تاثیر اور قدرت کو اس وقت ناقص کہہ سکتے ہیں کہ جب مقدور میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہو مگر فاعل کسی وجہ سے اثر نہ کر سکتا ہو، شجر اور حجر اور دیگر جمادات اگر نور آفتاب سے منور نہ ہوں تو آفتاب کا کیا قصور ہے؟ آفتاب کی تنویر تو شیشہ اور توے سب ہی پر واقع ہوتی ہے مگر جب آئینہ پر اس کی تنویر واقع ہوتی ہے تو جگمگانے لگتا ہے توے میں یہ بات نہیں اس لئے کہ اس میں روشن ہونے کی صلاحیت نہیں۔ ٹھیک اسی طرح جب اس کی قدرت کاملہ ممکنات سے متعلق ہوتی ہے تو ممکنات اپنی ذاتی استعداد اور صلاحیت کی وجہ سے اس کا اثر قبول کرتی ہیں، اور محالات اور ممتنعات اس وجہ سے کہ ان میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت اور استعداد نہیں اگر وہ تحت القدرۃ نہ داخل ہوں تو قدرت خداوندی کا کیا قصور ہوا اور باری تعالیٰ پر چونکہ موت اور فنا کا طاری ہونا اس کے حی و قیوم ہونے کی وجہ سے محال ہے۔ اس لئے اگر اس کی موت ظہور میں نہ آسکے تو اس کی قدرت کاملہ کا کوئی قصور نہیں۔

دوسرا جواب: نیز محل تاثیر کا مؤثر سے منفصل اور جدا ہونا ضروری ہے۔ ایک شئ خود اپنے اندر کوئی تاثیر نہیں رکھتی کیونکہ ایک ہی شئ کا قابل اور فاعل ہونا عقلاً محال ہے۔ آفتاب دوسروں کو منور کرتا ہے اس کی شعاعیں زمین کے ہر ہر گوشہ کو روشن کر دیتی ہیں۔

مگر وہ شعاعیں آفتاب کو روشن نہیں کرتیں۔

تیسرا جواب: علاوہ ازیں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آفتاب کی شعاعیں اور اس کے انوار خود آفتاب میں مؤثر ہو سکتے ہیں۔ تو کیا یہ انوار آفتاب کے تاریک اور مظلم بنانے کے لئے مؤثر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح خدا کی قدرت کاملہ خدا کو مردہ اور معیوب بتانے کے لئے کارآمد نہیں ہو سکتی۔

چوتھا جواب: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود واجب اور ضروری ہے اور عدم اس کا محال اور ممتنع ہے اور قدرت کا تعلق محالات کے ساتھ ایجاداً (یعنی قدر اس محال کو موجود کر دے) ہو سکتا ہے اور نہ اعداماً (یعنی قدرت اس محال کو معدوم کر دے) اس لئے کہ محال اس کو کہتے ہیں کہ جس کا عدم حتمی اور لازم ہو اور اس کا وجود میں آنا ناممکن ہو۔ پس اگر قدرت کا محال ساتھ اعداماً ہو تو معدوم کا معدوم کرنا لازم آتا ہے، جس سے فائدہ نہیں اور اگر ایجاد اس کے متعلق ہو تو محال کا موجود ہونا لازم آتا ہے اور کوئی شئ وجود میں داخل ہونے کے بعد محال نہیں رہ سکتی اور علی ہذا قدرت کا تعلق واجبات کے ساتھ ایجاداً ہو سکتا ہے نہ اعداماً ایجاداً تو اس وجہ سے نہیں ہو سکتا کہ موجود کرنا سراسر تحصیل حاصل ہے اور اعداماً اس وجہ سے نہیں ہو سکتا کہ واجب یعنی جس کا وجود ضروری اور حتمی تھا اس کا ہونا لازم آتا ہے اور معدوم ہونے کے بعد وہ شئ واجب نہیں رہ سکتی الحاصل اس کے قدیر اور مقتدر ہونے میں کوئی شک نہیں اور اگر شک ہو تو کیونکر ہوں ایسے حکیمانہ افعال اور مناظر قدرت کو دیکھ کر بھی اگر

کوئی بدبخت اس کی قدرت کو نہ مانے تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہوگی کہ جو مخمل اور کم خواب کو کہ جو قسم قسم کے نقش و نگار سے مزین ہو دیکھ کر یہ کہے کہ کیڑا کسی مردہ شخص یا اپاہج اور بے دست و پا انسان کا بنایا ہوا ہے۔

پانچواں جواب: نیز یہ سوال کرنا کہ کیا خدا تعالیٰ اپنا مثل بنا سکتا ہے۔ اس سوال کے معنی یہ ہیں کہ کیا خدا تعالیٰ اپنی الوہیت اور وحدانیت کو باطل کر سکتا ہے ظاہر ہے کہ تمام عقلاء کے نزدیک یہ سوال مہمل ہے۔ نیز یہ سوال اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں جو لوگ بھی خدائے علیم و قدیر کو مانتے ہیں ان سب پر یہ وارد ہوتا ہے۔

بہر حال قدرت کا تعلق ممکنات کے ساتھ ہوتا ہے یعنی ان چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے جن میں وجود اور عدم دونوں کی صلاحیت ہو وہ چیزیں جن کا وجود عقلاً لازم اور ضروری ہو اور ان کا عدم محال ہو جیسے واجب الوجود یعنی خود ذات الٰہی اور صفات الٰہیہ تو ایسی چیزوں کے ساتھ قدرت کا تعلق نہیں ہوتا اس کی یہ وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کچھ کمی ہے بلکہ یہ وجہ ہے کہ ان چیزوں میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت اور قابلیت ہی نہیں ہے کیونکہ وہ واجب الوجود ہی کیا ہوا جس پر کسی کی تاثیر اثر کر سکے۔ اسی لئے اگر کوئی یہ سوال کرے کہ کیا خدا اپنی ذات کو یا اپنی خدائی کو یا اپنی کسی صفت کو ختم کر سکتا ہے تو جواب دیا جائے گا کہ یہ چیزیں چونکہ واجب ہیں اس لئے ان میں خدائی قدرت کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں اس لئے یہ چیزیں کبھی ختم نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح وہ چیزیں جو عقلاً محال ہیں، یعنی جن چیزوں کا عدم عقلاً ضروری اور لازم ہے اور ان کا وجود عقلاً ناممکن اور محال ہے جیسے **اجتماع نقیضین** (مثلاً زید کے وجود اور عدم کا ایک ہی وقت اور ایک ہی حالت میں جمع ہونا) تو ایسے

حالات سے بھی قدرت متعلق نہیں ہوتی اس لئے کہ محالات میں بھی اثر قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

اس کی ایک حسی مثال یہ ہے کہ سورج میں اشیاء کو گرم کرنے کی قدرت ہے لیکن بعض سنگ مر مر جو ٹھنڈے ہوتے ہیں ان میں سورج کی تپش کا اثر قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

خلاصہ کلام: یہ کہ قدرت کا تعلق ممکنات کے ساتھ ہوتا ہے واجبات اور محالات کے ساتھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر کوئی یہ سوال کرے کہ خدا تعالیٰ کسی واجب الوجود کو معدوم اور کسی محال کو موجود کر سکتا ہے تو جواب میں یہ کہا جائے گا کہ قدرت اور ارادہ کو واجبات اور محالات سے کوئی سروکار نہیں۔ مگر یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کو اس پر قدرت نہیں یہ بے ادبی ہے اللہ تعالیٰ عجز سے پاک اور منزہ ہے۔

قبائح مثلاً وعدہ وعید کے خلاف کرنا اور خلاف واقعہ بیان کرنا بھی ممکنات میں سے ہیں محالات میں سے نہیں ہیں۔

لہٰذا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت شامل ہیں البتہ اللہ تعالیٰ نہ ان کو کبھی کرتا ہے اور نہ کبھی کرے گا اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرعون وہامان اور ابولہب کے متعلق جو یہ فرمایا ہے کہ وہ دوزخی ہیں تو یہ حکم قطعی ہے۔ اس کے خلاف کبھی نہ کرے گا لیکن اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل کرنے پر قادر ضرور ہے عاجز نہیں ہے۔ ہاں البتہ اپنے اختیار سے ایسا نہیں کرے گا۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (السجدۃ ۱۳)

اور اگر ہم چاہتے ہر جان کو اُس کی ہدایت عطافرماتے مگر میری بات قرار پاچکی کہ ضرور جہنم کو بھر دوں گا ان جنوں اور آدمیوں سب سے۔

جو بات پکی ہو چکی تھی وہ یہ تھی جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے دعوے: قَالَ فَبِعِزَّتِکَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ (۸۲) إِلَّا عِبَادَکَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ (ص ۸۳) بولا تو تیری عزت کی قسم ضرور میں ان سب کو گمراہ کردوں گا مگر جو ان میں تیرے چنے ہوئے بندے ہیں۔ کے جواب میں فرمایا: قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ (۸۴) لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْکَ وَمِمَّنْ تَبِعَکَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ (ص ۸۵) فرمایا تو سچ یہ ہے اور میں سچ ہی فرماتا ہوں بے شک میں ضرور جہنم بھر دوں گا تجھ سے اور ان میں سے جتنے تیری پیروی کریں گے سب سے۔

جہنم کو انسانوں اور جنوں سے بھرنے کے قول کے باوجود یہ فرمانا: وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا کُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا (السجدة ۱۳) اور اگر ہم چاہتے ہر جان کو اُس کی ہدایت عطافرماتے۔ پس اس آیت سے ظاہر ہو گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب کو مؤمن بنا دیتا لیکن وہ اپنے قول کے خلاف نہیں کرتا۔ معلوم ہوا کہ اپنے قول کے خلاف کرنے کی اسے قدرت ہے لیکن وہ قدرت کے باوجود خلاف کرتا نہیں ہے۔

مذکورہ قبائح کے محال اور ممتنع نہ ہونے کی مندرجہ ذیل تصریحات ہیں:

(۱) ارشاد الٰہی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام روز محشر عرض کریں گے:

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُکَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّکَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَکِيمُ (المائدة ۱۱۸)

اگر تو انہیں عذاب کرے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو بے شک تو ہی ہے غالب حکمت والا۔

مطلب یہ ہے کہ اگر آپ ان کی بدعقیدگی یعنی شرک پر سزا دیں تو جب بھی آپ مختار ہیں کیونکہ یہ آپ کے بندے ہیں اور آپ ان کے مالک ہیں اور مالک کو حق ہے کہ بندوں کو ان کے جرائم پر سزا دے۔ اور آپ ان کو معاف فرما دیں تو جب بھی آپ مختار ہیں۔ کیونکہ آپ زبردست قدرت والے ہیں معافی پر بھی قادر اور حکمت والے بھی ہیں اور آپ کی معافی بھی حکمت کے موافق ہو گی اس لئے اس میں کوئی نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنا ضابطہ ذکر فرمایا ہے:

إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ (النساء ۴۸)

بے شک اللہ اسے نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے۔

تو شرک پر عدم مغفرت کی وعید ذکر کی۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرض کر رہے ہیں کہ اگر آپ اپنے ضابطہ اور وعید کے مطابق ان کو سزا دیں تو جب بھی آپ مختار ہیں۔ کیونکہ آپ زبردست قدرت والے ہیں جس میں معافی بھی شامل ہے۔علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس آیت کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں:

وعدم غفران الشرک بمقتضی الوعید فلا امتناع فیه لذاته۔

یعنی مشرک کی عدم مغفرت وعید کا تقاضا ہے اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ (مشرک کی مغفرت) اپنی ذات کے اعتبار سے محال اور ممتنع ہے۔

(۲) شرح مواقف میں ہے:

لا يقال إنه يستلزم جوازهما وهو أيضا محال لأنا نقول استحالته ممنوعة كيف وهما من الممكنات التي تشملها قدرته تعالى۔[38]

---

38 (کتاب المواقف، ج۳، ص ۴۹۳)

کوئی اگر یہ کہے کہ وعید (دھمکی) کے خلاف کرنا تو عفوہ رحمت کی بات ہے جو نقص و قبیح نہیں جب کہ وعدہ خلافی، ظلم و کذب بیانی تو قبیح چیزیں ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کبھی متصف نہیں ہوئے۔ اور جن باتوں سے اللہ تعالیٰ متصف نہیں ہوئے ان پر اللہ تعالیٰ کو قدرت نہیں ہوتی تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک حدیث قدسی میں نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں:

یاعبادي إني قد حَرَّمتُ الظلم علی نفسي۔

اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ظلم نہ کرنے کو اپنی تعریف بتا رہا ہے جب کہ تعریف ہمیشہ اس کام پر کی جاتی ہے جو اپنے اختیار اور قدرت سے ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ کو ظلم پر قدرت ہی نہیں تو تعریف کس بات کی ہوئی، لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ظلم اور دیگر مذکورہ باتوں پر قدرت تو ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے ان کو کرتے نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ان قبائح کو بھی عام ہونا اور شامل ہونا اہلسنت کا مذہب ہے۔

مسامرہ شرح مسایرہ میں ہے:

اما ثبوتها ای القدرة علی ما ذکرتم الامتناع عن متعلقها اختیارا فهو بمذهب الاشاعرة الیق۔

افعال مذکورہ (یعنی ظلم و کذب وغیرہ) پر قدرت تو ہو مگر با اختیار خود ان کا ارتکاب نہ کیا جائے یہ قول مذہب (اہلسنت) اشاعرہ کے زیادہ مناسب ہے۔[39]

---

39 (اسلامی عقائد از مفتی عبد الواحد، ص ۳۰،۳۲)

قدرت کاملہ اور کل اختیارات کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے

(۱) قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۶) تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (آل عمران ۲۷)

یوں عرض کر اے اللہ ملک کے مالک تو جسے چاہے سلطنت دے اور جسے چاہے سلطنت چھین لے اور جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے ساری بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے بے شک تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ تو رات کا حصہ دن میں ڈالے اور دن کا حصہ رات میں ڈالے اور مُردہ سے زندہ نکالے اور زندہ سے مردہ نکالے اور جسے چاہے بے گنتی دے۔

(۲) وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (الانعام ۱۷)

اور اگر تجھے اللہ کوئی بُرائی پہنچائے تو اس کے سوا اس کا کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر تجھے بھلائی پہنچائے تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

(۳) وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ يُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (یونس ۱۰۷)

اور اگر تجھے اللہ کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کا کوئی ٹالنے والا نہیں اس کے سوا اور اگر تیرا بھلا چاہے تو اس کے فضل کے رد کرنے والا کوئی نہیں اسے پہنچاتا ہے اپنے بندوں میں جسے چاہے اور وہی بخشنے والا مہربان ہے۔

تو تکلیف و راحت، بھلائی، برائی، نفع و ضرر پر کامل اختیار اور قبضہ تامہ اللہ رب العزت کا ہے اس ذات پاک کے سوا کسی کو بھی سود و زیان اور دکھ، سکھ پر کوئی اختیار نہیں۔ اس کی بھیجی ہوئی

تکلیف اور دکھ درد کو کوئی نہیں ہٹا سکتا، اور جس پر وہ فضل وکرم فرمائیں کسی کو طاقت نہیں کہ روک دے۔مالک علی الاطلاق اور قادر مطلق فقط ایک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

(۴) لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ يَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ الذُّكُورَ (۴۹) أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَإِنَاثًا وَيَجْعَلُ مَنْ يَشَاءُ عَقِيمًا إِنَّهُ عَلِيمٌ قَدِيرٌ (الشوریٰ ۵۰)

اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی سلطنت پیدا کرتا ہے جو چاہے جسے چاہے بیٹیاں عطا فرمائے اور جسے چاہے بیٹے دے۔یا دونوں ملا دے بیٹے اور بیٹیاں اور جسے چاہے بانجھ کر دے بے شک وہ علم و قدرت والا ہے۔

زمین و آسمانوں کی قدرت اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔وہ علیم بھی ہے اور قدیر بھی، علم کل اور قدرت کاملہ خاص اس کی صفات ہیں۔وہ اپنے علم کی بناء پر اپنی قدرت سے جس کو چاہے اولاد دے یا مطلق نہ دے۔

اجمالاً اللہ تعالیٰ کی قدرت کا بیان

جہاں پورے قرآن میں اللہ رب العزت کی قدرت کاملہ و اختیار عامہ کی تفصیلات موجود ہیں جب کہ احاطہ ممکن نہیں، وہاں قرآن کریم میں ۲۴ مقامات پر بطور اجمال ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا بیان ملاحظہ ہو:

(۱) إِنَّ اللّٰهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (البقرۃ ۲۰)

قدیر اسے کہتے ہیں جو اقتضاء حکمت کے مطابق جو چاہے کرے۔(مفردات القرآن)

پورے قرآن میں ۳۵ مقامات پر ہے، دو مقامات پر **قدیر** ہے باقی ۳۳ مقامات پر **علی کل شئی قدیر** ہے۔(شروع میں کہیں **ان اللہ** ہے کہیں **أن اللہ** ہے، کہیں **و اللہ**، کہیں **ھو** ہے)۔[40]

---

[40] (لغات القرآن، ج۵، ص۴۲۷)

(۲) وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا (الکھف ۴۵)

(مقتدر باقتدار ہر طرح کی قدرت والا) اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ میں سے ہے۔

(۳) عَلِيمٌ قَدِيرٌ، وَاللّٰهُ قَدِيرًا، وقديرا۔ (۱۱ بار آیا ہے)

(۴) بِقَادِرٍ، الْقَادِرُ اور قَادِرٌ۔ (۷ بار آیا ہے)

(۵) وهو على كل شئی وكيل الوكيل اور وكيلا۔ (۱۱ بار آیا ہے)

(۶) وكان الله بكل شئی مقيتا۔ (ایک بار آیا ہے)

(۷) وكان الله بكل شئی محيطا۔ (ایک بار آیا ہے)

(۸) على كل شئی حفيظ۔ (۲ بار آیا ہے)

(۹) وهو القاهر فوق عباده۔ (۲ بار آیا ہے)

(۱۰) لله الواحد القهار، هو الواحد القهار وغیرہ۔ (۶ بار آیا ہے)

(۱۱) والله ولی المؤمنين ولی المتقين۔ (۱۰ بار آیا ہے)

(۱۲) ان الله لقوی عزيز، ان الله قوی عزيز وغیرہ (۸ مقامات پر ہے)

(۱۳) انک انت الوهاب۔ (وغیرہ ۳ مقامات پر ہے)

(۱۴) ان ذلک لمحی الموتٰی۔ (۲ مرتبہ آیا ہے)

(۱۵) قل اللهم مالک الملک، مالک الملک وغیرہ۔ (۵ مقامات پر ہے)

(۱۶) الملک القدوس وغیرہ۔ (۵ مرتبہ آیا ہے)

(۱۷) والمؤمن، المهيمن، الجبار (پورے قرآن میں ۳ بار آیا ہے)

(۱۸) المتين۔ (ا بار آیا ہے)

(۱۹) والله عزيز ذو نتقام انا منتقمون وغیرہ۔ (۶ بار آیا ہے)

(۲۰) ان اللہ واسع علیم، واللہ واسع علیم۔ (۸ مرتبہ آیا ہے)

(۲۱) اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم۔ (۳بار آیا ہے)

(۲۲) وھو خیر الحاکمین و انت احکم الحاکمین۔ (۵بار آیا ہے)

(۲۳) خیر القاصلین اور خیر الفاتحین۔ (۲مرتبہ آیا ہے)

(۲۴) العزیز (پورے قرآن میں ۸۶بار آیا ہے)

(۲۵) علی ھذا ایک ایک مقام پر حکم، والٍ (والی) اور الفتاح۔ (۳مرتبہ آیا ہے۔ میزان ۲۲۳ مقامات)

خلاصہ: اللہ تعالیٰ رب العزت نے اپنی کتاب میں تقریباً سوا دو سو مقامات پر اپنی قدرت عامہ اپنے غلبہ واقتدار تامہ اور اپنی قوت و حاکمیت مطلقہ کا بیان و اثبات تو فرمایا ہے۔ مگر ایک جگہ پر بھی غیر اللہ، کسی بت، کسی فرشتہ یا ولی حتیٰ کہ نبی کے لئے قدرت اور اختیار کا ذکر نہیں فرمایا۔

نیز قرآن کریم میں مذکورہ بالا صفات و اسماء الٰہی کے علاوہ قابض، باسط، خافض، رافع، معز، مذل، واجد، ممیت، مغنی، نافع، جبار، مانع وغیرہ اسماء الحسنیٰ اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ نفع، نقصان، عزت وذلت، موت وحیات سب اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہے۔

یہ صرف اجمالی طور پر صفات و اسماء الٰہی سے سوا دو سو مقامات پر قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اختیار عامہ کا ذکر ہے، ورنہ یوں تو سارے قرآن کا موضوع ہی یہی ہے اور پورے قرآن کریم میں جگہ جگہ بڑی تفصیل کے ساتھ رب العزت نے اپنی قدرت کاملہ، الوہیت عامہ اور رحمت واسعہ کو بیان فرمایا ہے۔[41]

---

41 (توحید کی حقیقت، ص ۲۱۹، ۲۲۸)

(۴)صفت ارادہ

ارادہ کے معنی کسی شے کے وجود اور عدم کو جو کہ قدرت کے اعتبار سے برابر تھے ان میں سے کسی ایک جانب کو اپنے اختیار سے ترجیح دینے کے ہیں۔ پس جو کچھ ہوتا ہے وہ اسی کے ارادہ سے ہوتا ہے۔

ازل میں جو کچھ اب اسی کے مطابق ہو رہا ہے۔

دلیل نمبر ۱: قال اللہ تعالی: فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ (البروج ١٦)

ہمیشہ جو چاہے کر لینے والا۔

دلیل نمبر ۲: قال اللہ تعالی: إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (يٰسٓ ٨٢)

اس کا کام تو یہی ہے کہ جب کسی چیز کو چاہے تو اس سے فرمائے ہو جا وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

دلیل نمبر ۳: قال اللہ تعالی: يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرة ١٨٥)

دلیل نمبر ۴: قال اللہ تعالی: وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا (یونس ٩٩)

دلیل نمبر ۵: قال اللہ تعالی: وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ (البقرة ٢٥٣)

دلیل نمبر ۶: قال اللہ تعالی: إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ (هود ١٠٧)

دلیل نمبر ۷: قال اللہ تعالی: إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ (المائدة ١)

یہ آیات کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ارادہ اور مشیئت اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں تو جب ارادہ کا اللہ تعالیٰ کی صفت ہونا ثابت ہوا تو قاعدہ ہے کہ شی کی صفت اس شی کے ساتھ قائم ہو گی، تو لازماً ارادہ بھی ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو گا اور چونکہ حوادث ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم نہیں ہو سکتے، اس لئے ارادہ قدیم ہو گا۔

دلیل نمبر۸: عالم میں اس قسم کا انضباط اور استحکام بدون ارادہ اور اختیار کے پیدا ہونا یقیناً محال ہے خدا کے افعال بدون ارادہ اور اختیار خود بخود مثل حرکت مرتعش کے صادر ہوتے ہیں تو عالم میں یہ انضباط اور استحکام اور حسن انتظام ہر گز نہ ہوتا۔

دلیل نمبر۹: اس دلیل سے پہلے بطور تمہید یہ جان لینا ضروری ہے کہ جب کسی فاعل سے کوئی شی ارادہ اور اختیار سے صادر ہو جائے تو اس فاعل کو فاعل بالاختیار کہتے ہیں اور اس سے صادر ہونے والا مصنوع حادث ہوتا ہے اور جس فاعل سے بلا اختیار و بلا ارادہ کوئی شی صادر ہو جائے تو اس کو فاعل موجب اور علت موجبہ کہتے ہیں اور علت موجبہ اور معلول کے درمیان تخلف ناجائز ہے۔ جیسے آگ سے حرارت کا صدور اس کے ارادہ کے بغیر ہوتا ہے، اب ایسا نہیں ہو سکتا کہ آگ ہو اور حرارت نہ ہو۔

اس تمہید کے بعد دلیل کا حاصل یہ ہے کہ عالم کا حدوث صانع کے فاعل بالاختیار ہونے پر دلالت کرتا ہے، وہ اس طرح کہ اگر صانع بالاختیار نہ ہو بلکہ فاعل موجب ہو تو عالم کا قدیم ہونا لازم آئے گا، کیونکہ "تخلف المعلول عن العلت الموجبة" ناجائز ہے، لہٰذا جب سے اللہ تعالیٰ ہوں گے اس وقت سے عالم ہونا ضروری ہو گا اور اللہ تعالیٰ ازل سے ہیں، لہٰذا عالم بھی ازل سے ہو کر قدیم ہو گا اور عالم کا قدیم ہونا باطل ہے تو اللہ تعالیٰ کا موجب بالذات ہونا بھی باطل ہے، تو جب موجب بالذات ہونا باطل ہے تو لا محالہ باری تعالیٰ فاعل مختار ہوں گے۔ (شرح العقائد مع الشرح)

بندہ جس کام کا ارادہ کرتا ہے اسی کے مطابق اعضاء حرکت کرنے لگتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں بتلا سکتا کہ اعضاء کو اس کا ارادہ کا علم کیسے ہو جاتا ہے پس جب کہ بندہ ہی کے ارادہ کے تعلق کی کیفیت

نہیں بتلائی جا سکتی تو خداوند ذوالجلال کے ارادہ کے تعلق کی حقیقت کون بتلا سکتا ہے۔ بلکہ جو شخص ارادہ کرتا ہے وہ خود اپنے ارادے کے تعلق کی کیفیت سمجھانے سے قاصر اور عاجز ہے۔[42]

مذهب اهل الحق ان كل ما اراد الله تعالیٰ فهو كائن، وان كائن فهو مراد له، وان لم يكن مرضيا، ولا مامور ابه، بل منهيا عنه، و هذا ما اشتهر من السلف ان ماشاء الله كان و مالم يشاء لم يكن۔

نجاریہ کا مذہب:

نجاریہ حضرات کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرید بذاتہ ہیں، ارادہ اللہ تعالیٰ کی مستقل صفت نہیں ہے، بلکہ عین ذات باری تعالیٰ ہے۔ ہم نے جب کہا کہ ارادہ باری تعالیٰ کی صفت ہے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ صفت اور موصوف کے درمیان عینیت نہیں ہوتی تو اس سے نجاریہ کی تردید ہوگئی۔

بعض معتزلہ کا مذہب:

بعض معتزلہ حضرات کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ مرید ہیں ارادہ کے ساتھ جو حادث ہے اور محل سے مستغنی ہے کسی کے ساتھ قائم نہیں ہے بذات خود قائم ہے، دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر یہ ارادہ ذات باری تعالیٰ میں حادث ہو تو ذات باری تعالیٰ کا محل حوادث ہونا لازم آتا ہے اور اگر ذات باری تعالیٰ کے علاوہ غیر کے ساتھ قائم ہو تو اس صورت میں "اتصاف الغیر بصفت اللہ تعالیٰ" لازم آتا ہے جو کہ ناجائز ہے، پس معلوم ہوا کہ ارادہ بذات خود قائم ہے۔

---

42 (علم الکلام، محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، ص ۸۲)

جواب:

معتزلہ کی اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ آپ نے لوگوں سے کہا کہ ارادہ حادث ہے ہم یہ تسلیم نہیں کرتے، بلکہ ارادہ قدیم ہے اور ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے۔

کرامیہ کا مذہب:

کرامیہ کہتے ہیں کہ ارادہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور حادث ہے اور یہ حضرات حوادث کا ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہونے کو جائز کہتے ہیں، یہ حضرات دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ارادہ کو اگر قدیم مانا جائے تو تعدد قدماء لازم آئے گا۔

جواب:

جواب یہ ہے کہ محال تعدد ذوات قدیمہ ہیں نہ کہ تعدد صفات قدیمہ۔

(شرح العقائد النسفی مع الشرح)

(۵)صفت سمع

صفت سمع یعنی اس کو شنوائی اور سننے کا وصف حاصل ہے وہ تمام مخلوق کی ایک وقت دعا اور آواز کو سنتا ہے اور ایک بات کا سننا اس کو دوسری بات کے سننے سے مانع نہیں ہوتا اور عالم کی مختلف زبانیں اس کو اشتباہ میں نہیں ڈالتیں وہ بیک لحظ پرندوں کے چہچہانے اور پہاڑوں کے اندر کیڑوں کے بھنبھنانا اور صاف چکنے پتھر پر چیونٹی کے چلنے کی آواز اور دریا میں مچھلیوں کی آواز سنتا ہے حتیٰ کہ مچھر اور چیونٹی کی باریک نسوں میں جب خون دوران کرتا ہوا ایک بند اور جوڑ سے منتقل ہو کر دوسرے جوڑ کی طرف جاتا ہے تو وہ اس خون کے چلنے کی آواز کو صاف سنتا ہے، قرآن پاک میں بھی آیا ہے:

قال اللّٰہ تعالیٰ: إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (البقرة ۱۸۱)

بے شک اللہ سنتا جانتا ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (غافر ۵٦)

تو تم اللہ کی پناہ مانگو بے شک وہی سنتا دیکھتا ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (الشوریٰ ۱۱)

اس جیسا کوئی نہیں۔

عن أبي موسى الأشعري رضي الله عنه قال: كنا مع النبي صلى الله عليه و سلم فكنا إذا أشرفنا على واد هللنا و كبرنا ارتفعت أصواتنا فقال النبي صلى الله عليه و سلم (يا أيها الناس اربعوا على أنفسكم فإنكم لا تدعون أصم و لا غائبا إنه معكم إنه سميع قريب۔[43]

فانه تعالیٰ سمیع بالاصوات و الحروف و الکلمات بسمعه القدیم الذی هو نعت له فی الازال۔[44]

قال فی انه حی سمیع بصیر شهدت به الکتب الالهیة و اجمع علیه الانبیاء، بل جمهور العقلاء۔[45]

(٦) صفت بصر

یعنی اس کو وصف بصارت حاصل ہے کہ جس کے سبب ہر چیز کو دیکھتا ہے خواہ کوئی چیز اندھیرے میں ہو خواہ نزدیک ہو خواہ دور ہو خواہ دن میں خواہ رات میں ہو خواہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو خواہ بڑی ہو مخلوق کو نظر آئے یا نہ آئے اللہ تعالیٰ سب کو ہر وقت بلا تفاوت یکساں طور پر دیکھتا ہے

---

43 (صحيح البخاري، ج۳، ص ۱۹۱)

44 (شرح فقہ اکبر، ص ۱۸)

45 (شرح المقاصد، ج۳، ص ۱۰۰)

کسی وقت میں کوئی شے اس سے چھپی نہیں ہے۔ بایں ہمہ وہ مخلوق جیسی آنکھوں اور آنکھوں جیسی ہر قسم کی شکل وصورت سے پاک ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: لَيۡسَ كَمِثۡلِهِۦ شَيۡءٌ (الشوریٰ ۱۱)

قرآن مجید میں اس صفت کا ذکر کئی آیات میں آیا ہے۔

مثلاً قال اللہ تعالیٰ: إِنَّهُۥ بِكُلِّ شَيۡءِۭ بَصِيرٌ (الملک ۱۹)

بیشک وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: إِنَّ ٱللَّهَ هُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلۡبَصِيرُ (غافر ۲۰)

الحاصل وہ سمیع بھی ہے اور بصیر بھی اور کیوں نہ ہو اس لئے کہ جب مخلوق اس صفت کمال سے موصوف ہے سو اگر خالق اس صفت کمال سے عاری ہے تو مخلوق کا خالق سے اکمل اور بہتر ہونا لازم آتا ہے نیز سمع اور بصر سے خالی ہونا ایک عیب ہے کہ جس کا بارگاہ خداوندی میں گزر ہی محال اور ناممکن ہے اور اسی وجہ سے کہ سمع اور بصر نہ ہونا عیب ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کی عبادت کرنے والوں سے فرمایا کہ:

قال اللہ تعالیٰ: لِمَ تَعۡبُدُ مَا لَا يَسۡمَعُ وَلَا يُبۡصِرُ وَلَا يُغۡنِي عَنكَ شَيۡـًٔا (مریم ۴۲)

اے میرے باپ کیوں ایسے کو پوجتا ہے جو نہ سنے نہ دیکھے اور نہ کچھ تیرے کام آئے۔

نیز اگر خالق ان صفات کمال سے عاری ہے تو مخلوق میں سمع بصر کا کمال کہاں سے آگیا۔

قال اللہ تعالیٰ: وَهُوَ ٱلَّذِيٓ أَنشَأَ لَكُمُ ٱلسَّمۡعَ وَٱلۡأَبۡصَٰرَ وَٱلۡأَفۡـِٔدَةَۚ قَلِيلٗا مَّا تَشۡكُرُونَ (المؤمنون ۷۸)

اور وہی ہے جس نے بنائے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل تم بہت ہی کم حق مانتے ہو۔

قال اللہ تعالیٰ: إِنَّهُۥ هُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلۡبَصِيرُ (غافر ۵۶)

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فی حدیث الایمان قال: یا محمد ما لاحسان؟ قال: ان تعبد اللہ کانک تراہ فانک ان لم تکن تراہ فانہ یراک۔[46]

و بصیر بالاشکال و الالوان بابصارہ القدیم الذی ھو لہ صفۃ فی الازل فلا یحدث لہ سموع ولا بصر بحدوث مبصر، فھو السمیع البصیر یسمع و یری، لا یعذب علی سمعہ سموع و ان خفی غایۃ السر، و لا یغیب عن رؤیتہ مرئی و ان دق فی النظر، بل یری دبیب النملۃ السوداء فی اللیلۃ الظلماء علی الصخرۃ الصماء"۔[47]

(۷) صفت کلام

یعنی اس کی ایک صفت کلام بھی ہے جس سے چاہتا ہے کلام کرتا ہے کیونکہ گونگا ہونا عیب اور نقص ہے اور ذات خداوندی ہر عیب سے پاک ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَى مِنْ بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُوَارٌ أَلَمْ يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ (الاعراف ۱۴۸)

اور موسیٰ کے بعد اس کی قوم اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنا بیٹھی بے جان کا دھڑ گائے کی طرح آواز کرتا کیا نہ دیکھا کہ وہ ان سے نہ بات کرتا ہے اور نہ انہیں کچھ راہ بتائے اسے لیا اور وہ ظالم تھے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو ذات صفت کلام سے عاری ہو اس کو خدا بنانا انتہا درجہ کا ظلم ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لئے کلام ہونے کے دلائل یہ ہیں:

کما قال اللہ تعالیٰ: وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا (النساء ۱۶۴)

اور اللہ نے موسیٰ سے حقیقتاً کلام فرمایا۔

---

46 (صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۲)

47 (شرح فقہ اکبر، ص ۱۸)

اور جس طرح اس کا وجود دوسروں کے وجود کے مشابہ نہیں اسی طرح اس کا کلام دوسروں کے کلام کے مشابہ نہیں اور جس طرح خداوند ذوالجلال کی صفت علم، صفت قدرت وغیرہ بے چون و چگون قدیم اور غیر مخلوق ہیں اسی طرح اس کی صفت کلام بھی قدیم اور غیر مخلوق اور بے چون و چگون ہے۔[48]

قال اللہ تعالیٰ: قَالَ يَامُوسَى إِنِّي اصْطَفَيْتُکَ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَاتِي وَبِكَلَامِي (الاعراف ۱۴۴)

فرمایا اے موسیٰ میں نے تجھے لوگوں سے چن لیا اپنی رسالتوں اور اپنے کلام سے۔

قال اللہ تعالیٰ: مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰہُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ (البقرۃ ۲۵۳)

ان میں کسی سے اللہ نے کلام فرمایا اور کوئی وہ ہے جسے سب پر درجوں بلند کیا۔

قال اللہ تعالیٰ: وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّةَ (البقرۃ ۳۵)

اور ہم نے فرمایا اے آدم تو اور تیری بی بی اس جنت میں رہو۔

اہل حق کے نزدیک جو کلام خدا کی صفت ہے وہ حروف و آواز سے مرکب نہیں بلکہ وہ ایک صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور اس کو کلام نفسی کہتے ہیں کیونکہ کلام اصل میں دل میں موجود مضمون اور معانی کو کہتے ہیں چنانچہ شاعر کہتا ہے:

ان الکلام لفی الفؤاد وانما   جعل اللسان علی الفؤاد دلیلا

کلام دل میں ہوتا ہے اور زبان تو محض اسی دل کے مضمون پر دلالت کرتی ہے۔

ہم لوگ دل کے اس مضمون کو کبھی زبان سے ادا کرتے ہیں اور کبھی لکھ کر بتادیتے ہیں اور کبھی اشاروں سے ظاہر کرتے ہیں۔

---

48 (علم الکلام، محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، ص ۱۳۶،۱۳۷)

ہم کلام کی ادائیگی یعنی تکلم میں مخارج، حروف اور صوت (یعنی آواز) کے محتاج ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اسی سے منزہ ہیں وہ ہماری طرح حروف و آواز سے تکلم نہیں فرماتے۔

اللہ تعالیٰ نے جب کسی سے کلام فرمایا مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا کہ:

قال اللہ تعالیٰ: فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ (طٰہٰ ۱۲)

تو تو اپنے جوتے اتار ڈال۔

قال اللہ تعالیٰ: وَمَا تِلْکَ بِیَمِیْنِکَ یَامُوسَی (طٰہٰ ۱۷)

اور یہ تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ۔

تو یہاں چند باتیں قابل لحاظ ہیں:

امام اشعری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا کلام نفسی ہی قابل سماع ہے اگرچہ یہ عام عادت کے خلاف ہے جبکہ امام ماتریدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی کلام نفسی کے سننے کو ممکن مانتے ہیں۔

کسی خاص شخص کے ساتھ کلام میں جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گفتگو میں ہوا امام اشعری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تو یہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کلام نفسی کو ہی سنا البتہ امام ماتریدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسی آواز سنی جو کلام الٰہی پر دلالت کر رہی تھی اور امام ماتریدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلیم اللہ اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کتاب یا فرشتے کے واسطے کے بغیر کلام کیا۔

اللہ تعالیٰ کا کلام دو طرح کا ہے۔ ایک تو وہ ہے جو احکام و نواہی پر مشتمل ہے۔ یہ تو قدیم ہے اور اس کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متکلم ہیں دوسرا وہ ہے جو کسی مخلوق سے کسی خاص موقع پر کیا۔

مثلاً: وَکَلَّمَ اللہُ مُوسَی تَکْلِیمًا (النساء ۱۶۴)

اور اللہ نے موسیٰ سے حقیقتاً کلام فرمایا۔

امام اشعری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ کلام کرنا بھی قدیم ہے، اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متکلم ہیں، البتہ اس شرط کے ساتھ کہ جب وہ مخاطب پایا جائے گا تو اس خاص کلام کا تعلق اس مخاطب کے ساتھ ہو گا۔ مثلاً وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوسَى تَكْلِيمًا (النساء ۱۶۴) ترجمہ: اور اللہ نے موسیٰ سے حقیقتاً کلام فرمایا۔ کلام نفسی میں اس قید کے ساتھ ہمیشہ سے موجود ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وجود حاصل ہو گا اور وہ ایک خاص موقع پر پہنچیں گے تو اس وقت اس کلام کا ربط و تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہو گا۔ اکثر ماتریدیہ کہتے ہیں کہ تکلیم اس وقت کہتے ہیں جب دوسرے کو سنائے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ سے متکلم نہیں کہا جائے گا بلکہ صرف اسی وقت کہا جائے گا جب مخاطب کو وہ کلام سنایا جائے گا۔

قرآن پاک

قرآن پاک بھی اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور صفت قدیم ہے اس لئے اصل کے اعتبار سے تو یہ کلام نفسی پر مشتمل ہے البتہ بندے چونکہ اپنی قرأت اور تلاوت میں اور اپنی سماعت میں حروف اور صوت کے محتاج ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو (جو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے) حروف اور کلمات کے لباس میں نازل کیا تاکہ بندے اس کو پڑھ سکیں اور سن سکیں۔

الكلام هو صفة ازلية عبر عنها بالنظم المسمى بالقرآن المركب من الحروف يريد ان الكلام المعدود من الصفات الهية هو المعنى القديم القائم بذاته تعالىٰ و اما هذاالقرآن المركب من الحروف الهجاء فحادث و ليس صفة قديمة قائمة بذاته تعالىٰ بل هو دال عليها و يسمى الاول بالكلام اللفظى۔[49]

---

[49] (نبراس، ۱۳۹)

حضرت امام مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: ”قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرف اور آواز کا لباس دے کر ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل فرمایا ہے اور بندوں کو اسی کے ساتھ امر و نہی کا مخاطب بنایا ہے۔ جس طرح ہم اپنے نفسی کلام کو زبان کے ذریعہ حرف اور آواز کے لباس میں لا کر ظاہر کرتے ہیں۔

اور اس طرح اپنے پوشیدہ مطالب و مقاصد کو عرصہ ظہور میں لاتے ہیں اسی طرح حق تعالیٰ شانہ نے اپنے کلام نفسی کو بغیر زبان کے وسیلہ کے محض اپنی قدرت کاملہ سے حروف اور آواز کا لباس عطا فرما کر اپنے بندوں پر بھیجا ہے اور اپنے پوشیدہ اوامر و نواہی کو حروف اور آواز کے ضمن میں لا کر ظہور کے میدان میں جلوہ گر کیا ہے۔ پس کلام کی دونوں قسموں پر کلام کا اطلاق حقیقت کے طور پر ہے اور دونوں قسمیں یعنی کلام نفسی اور کلام لفظی حقیقتاً اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں پس جس طرح کہ ہمارے کلام کی دونوں قسمیں نفسی اور لفظی حقیقت کے طور پر ہمارا کلام ہیں نہ یہ کہ قسم اول (کلام نفسی) تو حقیقت ہے اور دوسری قسم (کلام لفظی) مجاز ہے غرض کلام الٰہی کا اطلاق دو معنی پر ہوتا ہے۔

اول یہ کہ کلام اللہ تعالیٰ کی ایک صفت بسیط ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور اس کے قدیم ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ کلام سے وہ کلمات مراد لئے جاتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام نفسی کے لئے بطور لباس مقرر فرمایا ہے۔

قرآن حکیم کو اللہ تعالیٰ کا کلام اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ کلمات پر مشتمل ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے کلام نفسی کے لئے بطور لباس ہیں۔ بالفاظ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن الفاظ اور معانی کے مجموعہ کا نام ہے، البتہ قرآن کی قرأت اور سماعت اور کتابت یہ حادث اور

مخلوق ہے اس لئے کہ قرأت اور سماعت اور کتابت یہ بندے کے افعال ہیں اور بندے کے افعال حادث اور مخلوق ہوتے ہیں۔[50]

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: جاننا چاہیئے کہ کلام الٰہی کا اطلاق دو معنی پر ہوتا ہے: اول یہ کہ کلام اللہ تعالیٰ کی ایک صفت قدیمہ ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور بسیط ہے۔ دوم وہ کلمات جس کا حق سبحانہ وتعالیٰ نے تکلم فرمایا، قرآن کو اسی معنی میں کلام الٰہی کہا جاتا ہے۔ یہ کلمات بھی قدیم اور مجرو عن المادۃ ہیں اس لئے کہ پروردگار عالم سے ان کا ظہور اور صدور ہوا ہے اور جو شے قدیم سے ظاہر اور صادر ہوگی وہ بھی قدیم ہوگی۔

ہمارے الفاظ اور حروف اور ہماری آواز ان کلمات الٰہیہ کے لئے بمنزلہ آئینہ کے ایک مظہر اور تجلی گاہ ہیں۔ اگر کسی شے کا عکس آئینہ میں پڑے تو اصل شے کو عکس کے عوارض سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اسی طرح ہماری قرأت اور کتابت میں جو حدوث کے لوازم پائے جاتے ہیں کلمات الٰہیہ کو ان سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ قدیم اپنے قدم پر رہے گا حادث اپنے حدوث پر رہے گا۔ حدوث اور امکان کے تمام عوارض بندہ کی طرف متوجہ ہوں گے اور خدا اور اس کا کلام ان سب سے منزہ اور مقدس ہو گا۔ ادھر تنزیہ ہوگی، ادھر تشبیہ وتمثیل ہوگی۔ ادھر وجوب اور قدم ہوگا، ادھر حدوث اور امکان ہو گا۔

دوسرے عنوان سے اس کو یوں سمجھو کہ الفاظ اور عبارات معانی کے لئے بمنزلہ آئینہ کے ہیں، معانی الفاظ میں حلول کئے نہیں ہوتے، اور نہ الفاظ اور عبارات معانی کے لئے محل اور ظرف ہیں بلکہ الفاظ معانی کے لئے مظہر اور تجلی گاہ اور ایک آئینہ ہیں، لفظ اور معنی میں ظاہر اور مظہر ہونے کا علاقہ

---

50 (اسلامی عقائد، مفتی عبد الواحد، ص ۲۹، ۲۶)

ہے حال اور محل، ظرف اور مظروف جیسا علاقہ نہیں۔ کوئی شخص یہ نہیں سمجھا سکتا کہ معانی، الفاظ کے آئینہ میں کس طرح عکس افگن اور جلوہ گر ہیں۔ فقط اجمالاً اتنا جانتا ہے کہ الفاظ کے آئینہ میں معنی کے ظاہر کرنے کا ایک آئینہ ہے، اور الفاظ و عبارات کی صفات اور کیفیات سے معنی کو کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح ہماری زبانیں، ہمارے کتابی نقوش کلمات قدسیہ کے لئے ایک آئینہ ہیں حدوث اور امکان کے تمام عوارض ہماری زبان اور کتاب کی طرف متوجہ ہوں گے اور اس کا کلام پاک، ان تمام عوارض سے پاک اور منزہ ہو گا۔[51]

کلام اللہ کی تفصیل

کلام کی اقسام:

بطور تمہید یہ جان لینا ضروری ہے کہ کلام کی دو قسمیں ہیں:

(۱) کلام نفسی　　　(۲) کلام لفظی

(۱) کلام نفسی: وہ کلام جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے وہ کلام نفسی ہے۔

(۲) کلام لفظی: اور جس پر تلفظ کیا جاتا ہے اور حروف اور اصوات کے قبیل سے ہے اس کو کلام لفظی کہا جاتا ہے جس کو قرآن کریم کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفت کلام نفسی ہے نہ کہ کلام لفظی، کیونکہ کلام لفظی حروف اور اصوات سے مرکب ہونے کی بناء پر حادث ہے اور حادث اللہ تعالیٰ کی صفت نہیں ہو سکتی۔

---

51 (علم الکلام از مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، ص ۱۳۷، ۱۳۸)

کلام نفسی کے ثبوت پر دلیل:

حاصل یہ ہے کہ جو آدمی کسی چیز کا امر کرتا ہے یا کسی چیز سے نہی کرتا ہے یا کسی چیز کی خبر دے رہا ہے تو اس سے پہلے ان کی دل میں ایک معنی اور کیفیت پائی جاتی ہے اس مضمر اور دل میں پوشیدہ کیفیت اور معنی کو کلام نفسی کہا جاتا ہے پھر اس کلام نفسی کا اظہار کبھی الفاظ و عبادات کے ذریعے اور کبھی کتابت اور کتابت اشارہ کے ذریعہ کیا جاتا ہے جس کو کلام لفظی کہا جاتا ہے۔

صفت کلام غیر صفت ارادہ ہے:

کلام غیر ارادہ ہے کیونکہ کبھی انسان کسی چیز کا امر کرتا ہے حالانکہ وہ اس کا ارادہ نہیں رکھتا، جیسے کسی آدمی کو نافرمان غلام کی مارپیٹ پر لوگ اس کو ملامت کرتے ہیں تو یہ آدمی غلام کو کسی کام کرنے کا حکم دیتا ہے، حالانکہ یہ آدمی ارادہ نہیں رکھتا کہ غلام وہ کام کرے بلکہ وہ غلام کی نافرمانی کو لوگوں پر ظاہر کرنا چاہتے ہیں، تو یہاں امر اور کلام ہے لیکن ارادہ نہیں ہے، پس معلوم ہوا کہ کلام عین ارادہ نہیں ہے۔

اخطل شاعر فرماتے ہیں:

ان الکلام نفی الفؤاد و انما ‌ ‌ ‌ جعل اللسان علی الفؤاد دلیلا

کلام تو دل میں ہوتا ہے زبان تو دل کی ترجمانی کرتی ہے۔

حضور ﷺ کے وصال کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کے مسئلہ میں اختلاف ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ:

اجتمعت الانصار علی ان یائمروا سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فمشیت الیھم مع ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و زورت فی نفسی مقالۃ فتکلم ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و لم یترک مما زورت شیئا۔

تو یہاں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کلام کا محل نفس قرار دیا اور یہی کلام نفسی ہے۔

بسا اوقات ایک آدمی دوسرے آدمی سے کہتا ہے کہ میرے دل میں ایک بات ہے جو میں تمہیں کہنا چاہتا ہوں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ کلام نفسی یا تو عین علم ہے یا ارادہ ہے۔ کلام نفسی کوئی الگ چیز نہیں ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ کلام یا تو خبر کی صورت میں ہو گا یا انشاء کی صورت میں ہو گا، اگر خبر کی صورت میں ہے تو عین عل ہے، کیونکہ خبر میں عبارت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ متکلم کو اس کا علم ہے اور اگر انشاء کی صورت میں ہے تو عین ارادہ ہے، کیونکہ انشاء یا تو امر کی صورت میں ہو گا یا نہی وغیرہ کی صورت میں، اگر امر کی صورت میں ہے تو یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ متکلم نے مخاطب سے فعل منہی عنہ کے نہ کرنے کا ارادہ کیا ہے اور استفہام کی صورت میں سوال کرنے کا ارادہ کیا ہے اور تمنی، ترجی اور قسم میں تمنی، امید اور قسم کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ تو اس تقریر سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ کلام عین علم یا عین ارادہ ہے۔

جواب یہ ہے کہ صفت کلام صفت ارادہ کا غیر ہے، اس لئے کہ کبھی کبھار انسان کسی ایسی چیز کے بارے میں خبر دیتا ہے، جس کا علم اس کو نہیں ہوتا بلکہ اس کے خلاف کا علم ان کو ہوتا ہے جیسے اخبار کاذبہ۔

صفت کلام اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہے:

کلام نامی صفت اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہے۔

پہلی دلیل:

وہ آیات مبارکہ جو گذر چکے وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

دوسری دلیل:

اس بات پر کہ کلام اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اجماع امت ہے۔

تیسری دلیل:

یہ کہ تواتر کے ساتھ انبیاء علیہم السلام سے یہ بات نقل ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ متکلم ہیں اور ظاہر ہے کہ جو متکلم ہو گا کلام ان کے ساتھ قائم ہو گا، کیونکہ کلام کے ثبوت کے بغیر تکلم محال ہے۔

چوتھی دلیل:

کلام اللہ تعالیٰ کی صفت ہے دلیل کا حاصل یہ ہے کہ قاعدہ ہے کہ مشتق کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جس کے ساتھ مأخذ اشتقاق قائم ہو، اگر مأخذ اشتقاق اس کے ساتھ قائم نہ ہو، تو مشتق کا اطلاق اسی پر ناجائز ہے، تو جب اللہ تعالیٰ متکلم ہیں تو لا محالہ کلام اس کی صفت ہو گی۔

معتزلہ کی حماقت:

معتزلہ حضرات کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ متکلم ہیں اور کلام اللہ تعالیٰ کے ماسوا لوح محفوظ، جبرائیل علیہ السلام یا محمد ﷺ کے ساتھ قائم ہے، معتزلہ کی یہ بات انتہائی حماقت پر مبنی ہے، کیونکہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ صفت کسی اور کی ہو اور قائم کسی دوسرے کے ساتھ ہو، نیز معتزلہ کی یہ بات مذکورہ قاعدہ کی وجہ سے مردود ہے۔

صفت کلام ازلی:

جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کلام ازلی نہ ہو، تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا محل حوادث ہونا لازم آئے گا اور یہ ناجائز ہے۔

مزید وضاحت:

مزید وضاحت یہ ہے کہ کلام حروف اور اصوات کے قبیل سے نہیں ہے، اس لئے کہ اصوات اور حروف اعراض اور حوادث ہیں، کیونکہ ان میں بعض کا حدوث دوسرے بعض کے ختم ہونے کے ساتھ مشروط ہے یعنی دوسرے حرف پر تلفظ کرنا اس وقت ممکن نہیں جب تک پہلے حرف کا تلفظ ختم اور معدوم نہیں ہو جاتا، مثلاً زید پر جب تلفظ کریں تو باء پر تلفظ زاء سے قبل نا ممکن ہے اور معدوم ہونا حادث کی علامت ہے اس لئے کلام حروف اور اصوات کے قبیل سے نہیں ہے۔

اس سے حنابلہ اور کرامیہ کی تردید ہو گئی، یہ دونوں حضرات کہتے ہیں کہ کلام حروف اور اصوات کے قبیل سے ہے، البتہ کرامیہ کلام کے حادث ہونے کے قائل ہیں جبکہ حنابلہ کلام کو حروف اور اصوات کی جنس سے ہونے کے باوجود قدیم کہتے ہیں۔

کلام سکوت و آفت کے منافی ہے:

کلام اللہ تعالیٰ کی ازلی صفت ہے اور سکوت اور آفت کے منافی ہے، یعنی ایسی بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کلام پر قدرت ہو اور کلام نہ کریں اور نہ ایسی بات ہے کہ آلات کی عدم موافقت کی وجہ سے کلام پر قادر نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ بغیر آلات کے جب چاہیں کلام کرنے پر قادر ہیں۔

سکوت و آفت کی اقسام:

جس طرح کلام کی دو قسمیں ہیں کلام لفظی اور کلام نفسی، اسی طرح سکوت اور آفت کی بھی دو قسمیں ہیں، سکوت و آفت ظاہری، سکوت و آفت باطنی، سکوت ظاہری یہ ہے کہ قدرت کے ہوتے ہوئے کلام نہ کرنا، سکوت باطنی یہ ہے کہ قدرت کے ہوتے ہوئے دل میں کسی چیز کے بارے میں سوچ نہ سکے، یعنی تدبر کی تمام صلاحیت کا ختم ہو جانا۔

کلام صفت واحدہ ہے:

کلام صفت واحدہ ہے، کلام کی ذات میں تکثر اور تعدد نہیں ہے۔کلام میں تکثر متعلقات امر، نہی، خبر وغیرہ کے اعتبار سے ہے، جیسا کہ علم، قدرت اور تمام صفات کا یہی حال ہے کہ وہ واحد ہیں اور تکثر متعلقات کے اعتبار سے ہے، اس طرح کلام بھی صفت واحد ہے تعلقات کے اعتبار سے اس میں تکثر اور تعدد ہے، تو کلام کا تکثر اعتباری ہے نہ کہ ذاتی، کلام کا تعلق جب طلب فعل ہو جائے تو امر کہلاتا ہے اور جب کلام کا تعلق ترک فعل کے ساتھ ہو جائے تو نہی کہلاتا ہے اور جب طلب حکایات کے ساتھ ہو جائے تو خبر اور جب طلب اعلام کے ساتھ ہو جائے تو استفہام اور جب طلب توجہ کے ساتھ ہو جائے تو ندا کہلاتا ہے۔

جیسے زید جزئی حقیقی ہے، زید کی ذات میں تکثر نہیں ہے، البتہ تعلقات کے اعتبار سے زید میں تکثر ہے، مثلاً زید کا تعلق اگر فقہ کے ساتھ ہے تو فقیہ کہلاتا ہے اور اگر صرف کے ساتھ تعلق ہے تو صرفی کہا جاتا ہے اور اگر نحو کے ساتھ ہے تو نحوی کہا جاتا ہے۔یہی حال کلام کا بھی ہے کہ اس کی ذات میں تکثر نہیں ہے، تعلقات کے اعتبار سے کلام میں تکثر اور تعدد ہے۔

قرآن پاک کا اطلاق کلام نفسی و لفظی دونوں پر ہوتا ہے:

جس طرح کلام کا اطلاق کلام لفظی اور کلام نفسی دونوں پر ہوتا ہے اسی طرح قرآن کا اطلاق کلام نفسی پر بھی ہوتا ہے اور نظم متلو حادث یعنی کلام لفظی پر بھی ہوتا ہے، لہٰذا قرآن کریم بمعنی کلام نفسی اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، قدیم ہے اور غیر مخلوق ہے۔

فائدہ: جب ہم کہیں گے کہ قرآن مخلوق ہے تو قرآن بمعنی کلام لفظی ہو گا اور جب ہم کہیں گے کہ قرآن غیر مخلوق ہے تو قرآن بمعنی کلام نفسی ہو گا، وہ قدیم ہے اور ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے۔

فائدہ: حضور ﷺ نے اس آدمی کو جو کہ قرآن کو مخلوق کہتا ہے تغلیظاً کافر کہا ہے۔

منشاء اختلاف:

ہمارے اور معتزلہ کے اصل اور حقیقت میں اختلاف کلام نفسی کی اثبات اور نفی میں ہے، ہم کلام نفسی کے ثبات کے قائل ہیں اور وہ حضرات کلام نفسی کی نفی کے قائل ہیں باقی قرآن کریم کا مخلوق ہونا اختلاف کی فرع ہے ہم کلام نفسی کا اثبات کرتے ہیں اس وجہ سے ہم قرآن بمعنی کلام نفسی کو قدیم کہتے ہیں اور معتزلہ کلام نفسی کی نفی کے قائل ہیں اس لئے وہ قرآن کریم یعنی کلام لفظی کو مخلوق کہتے ہیں۔ اگر ہم معتزلہ کی طرح کلام کو صرف کلام لفظی میں منحصر کریں اور کلام نفسی کی نفی کے قائل ہو جائیں تو ہم کلام لفظی کو جو کہ حروف اور اصوات سے مرکب ہے قدیم نہیں کہتے، ہم معتزلہ کی طرح اس کو حادث اور غیر مخلوق مانتے ہیں یا اگر معتزلہ ہماری طرح کلام نفسی کے اثبات کے قائل ہو جائیں تو وہ کلام نفسی کو حادث نہیں کہیں گے پھر اختلاف نہ ہو گا۔

بہر حال حقیقت میں اختلاف کلام نفسی کے اثبات اور نفی میں ہے اور کلام کا مخلوق اور غیر مخلوق ہونا اسی اختلاف کی فرع ہے۔

معتزلہ کی دلیل:

جس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن مخلوق کی صفات کے ساتھ متصف ہیں اور حادث کی علامات کے ساتھ متصف ہیں اور جو چیز مخلوق اور حادث کی صفات کے ساتھ متصف ہوتی ہے وہ حادث ہوتی ہے،

لہٰذا قرآن کریم مخلوق اور حادث ہیں۔ رہی یہ بات کہ مخلوق اور حادث کے وہ کون سے اوصاف ہیں جن کے ساتھ قرآن کریم متصف ہے وہ چند اوصاف یہ ہیں:

قرآن پاک کے اوصاف:

(۱) تالیف:

یعنی قرآن کریم حروف اور آیات سے مرکب ہے۔ تالیف چونکہ اجزاء پر موقوف ہوتی ہے، اس لئے تالیف حادث ہے، پس جو قرآن موصوف بالتالیف ہے وہ بھی حادث ہو گا۔

(۲) تنظیم:

قرآن کریم کی دوسری صفت تنظیم ہے قرآن کریم کا طبعی طور پر مرتب ہونا تنظیم کہلاتا ہے، جیسا کہ موتیوں کی لڑی، تو تنظیم میں ترتیب ہوتی ہے اور ترتیب حادث ہے اس لئے تنظیم بھی حادث ہے۔ پس جو قرآن کریم موصوف با تنظیم ہے۔

(۳) انزال و تنزیل:

قرآن کریم کی تیسری صفت انزال اور تنزیل ہے، انزال اور تنزیل میں فرق یہ ہے کہ انزال یک بارگی نازل ہونے کو کہتے ہیں۔ اور تنزیل تدریجاً نازل ہونے کو کہتے ہیں اور قرآن دونوں کے حق میں یہ دونوں معنی درست ہیں، اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ قرآن دفعۃً لوح محفوظ سے آسمان دنیا کی طرف یک بارگی نازل ہوا ہے، پھر آسمان دنیا سے تیئس سال میں رفتہ رفتہ نازل ہوا ہے جیسے قرآن میں ہے: إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ (القدر ۱) دوسری جگہ ہے: وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا (الاسراء۱۰۶)۔

تنزیل اور انزال مکان اعلیٰ سے مکان اسفل کی طرف منتقل ہونے کو کہتے ہیں۔

(۴) عربی ہونا:

قرآن کریم کی چوتھی صفت قرآن کریم کا عربی زبان میں ہونا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا (یوسف ۲) اور عربی زبان میں ہونا عرب کی وضع پر موقوف ہے اور وضع حادث ہے تو عربی زبان میں ہونا بھی حادث ہو گا، لہٰذا قرآن جو کہ موصوف بالعربیت ہے وہ بھی حادث ہو گا۔

(۵) مسموع ہونا:

پانچویں صفت قرآن کریم کا مسموع ہونا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ (الاعراف ۲۰۴) اور مسموع صوت ہو سکتی ہے اور آواز عرض ہونے کی بناء پر حادث ہو گی، پس قرآن جو کہ موصوف بالمسموع ہے وہ بھی حادث ہو گا۔

(٦) فصیح ہونا:

چھٹی صفت قرآن کا فصیح ہونا ہے اور فصیح ہونا کثرۃ الاستعمال پر موقوف ہے اور استعمال حادث ہے پس فصیح ہونا حادث ہو گا، تو قرآن جو کہ موصوف بالفصاحت ہے وہ بھی حادث ہو گا۔

(۷) معجز ہونا:

ساتویں صفت قرآن کا معجز ہونا ہے اور اعجاز الفاظ پر موقوف ہوتا ہے کیونکہ مخالف کو الفاظ کے ذریعے چیلنج دیا جاتا ہے اور الفاظ حادث ہیں، لہٰذا اعجاز حادث ہو گا تو مسموع بھی حادث ہو گا، پس قرآن جو کہ موصوف بالاعجاز ہے وہ بھی حادث ہو گا بہر حال قرآن مخلوق کی صفات کے ساتھ متصف ہے اور جو چیز مخلوق کی صفات کے ساتھ متصف ہوتی ہے وہ حادث ہوتی ہے پس قرآن کریم مخلوق اور حادث ہے۔

جواب:

جواب کا حاصل یہ ہے کہ معتزلہ کا یہ استدلال ہمارے خلاف حجت نہیں بن سکتی، کیونکہ انہوں نے کلام کی جو اوصاف ذکر کئے ہیں اور ان کا حدوث ثابت کیا ہے یہ کلام لفظی کی اوصاف ہیں اور کلام لفظی کے حدوث کے ہم بھی قائل ہیں، ہماری گفتگو تو کلام نفسی میں ہیں، لہٰذا معتزلہ کی یہ استدلال ہمارے خلاف حجت نہیں بن سکتی، البتہ حنابلہ کے خلاف حجت بن سکتی ہے، کیونکہ وہ کلام کو حروف اور اصوات میں سے ماننے کے باوجود قدیم کہتے ہیں۔

معتزلہ کی ایک باطل تاویل:

معتزلہ حضرات اللہ تعالیٰ کے متکلم ہونے کا انکار تو کر نہیں سکتے، اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام سے تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ متکلم ہیں، نیز قرآن میں امر اور نہی کے صیغے بکثرت موجود ہیں، جو کہ کلام کی اقسام میں سے ہیں تو معتزلہ نے اللہ تعالیٰ کے متکلم ہونے میں تاویل کیا اور اللہ تعالیٰ کے متکلم ہونے کا مطلب یہ بیان کیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے حروف اور اصوات کو اپنے محل میں پیدا کیا ہے شجرۂ موسیٰ علیہ السلام یا لسان جرائیل علیہ السلام یا لسان نبی علیہ السلام یا لوح محفوظ میں حروف اور اصوات کو پیدا کیا ہے یا متکلم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کتاب کے اشکال کو لوح محفوظ میں پیدا کرنے والے ہیں اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اس پر تلفظ نہیں کیا، جیسا کہ مصنفین حضرات کتابیں لکھتے ہیں اور ان کے نقوش پر تلفظ نہیں کرتے، لیکن اس کے باوجود یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں کی کتاب اور تصنیف ہے۔

پھر معتزلہ نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ جبرئیل نے کس کیفیت سے قرآن کو لیا، بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آواز کو پیدا کرتے، جبرئیل علیہ السلام اس کو سن لیتے اور اس کے ساتھ نازل

ہوتے اور بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوح محفوظ میں کتابت کے نقوش کو پیدا فرماتے جبرئیل ان نقوش کو دیکھ کر لے آتے، بہر حال معتزلہ متکلم کو بمعنی موجد لیتے ہیں۔

جواب:

جس کا حاصل یہ ہے کہ معتزلہ کی یہ تاویل لغت کے قاعدہ کے خلاف ہے، کیونکہ قاعدہ ہے کہ مشتق کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جس کے ساتھ ماخز اشتقاق قائم ہو، مأخذ اشتقاق کے موجد پر مشتق کا اطلاق نہیں ہوتا، جیسے متحرک اس کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ حرکت قائم ہو حرکت کے موجد کو متحرک نہیں کہا جاتا۔ ورنہ اگر موجد پر مشتق کا اطلاق کیا جائے تو جن جن اعراض کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا اتصاف صحیح ہونا چاہیئے مثلاً: اللہ تعالیٰ نے سواد اور بیاض کو پیدا کیا ہے تو پھر تو اللہ تعالیٰ کو اسود اور ابیض کہنا چاہیئے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو اسود اور ابیض نہیں کہا جاسکتا، تو معلوم ہوا کہ متکلم موجد کو نہیں کہا جاتا، بلکہ متکلم اس کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ کلام قائم ہے۔

معتزلہ کا اعتراض:

اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ اے اشاعرہ! تم نے قرآن کی تعریف یہ کی ہے کہ: ”ھو اسم لما نقل الینا بین دفتی المصاحف تواترا“ اور یہ تعریف قرآن کے لکھے جانے، پڑھے جانے، سنے جانے کو مستلزم ہے اور مکتوب، مقروء، مسموع حادث کی علامات ہیں اس لئے کہ ان کی محلات مصاحف، زبان، کان وغیرہ حادث ہیں، لہٰذا قرآن کریم مخلوق ہوا نہ کہ غیر مخلوق۔

جواب:

جواب کا حاصل یہ ہے کہ قرآن بمعنی کلام نفسی کا ان صفات کے ساتھ متصف ہونا براہ راست نہیں ہے، بلکہ دال کے واسطہ سے ہے اور حادث ہونا تب لازم آتا جبکہ یہ مدلول یعنی کلام نفسی کی

صفات ہوتے، رہی یہ بات کہ قرآن کریم بمعنی کلام نفسی دال کے واسطہ سے ان صفات کے ساتھ کیسے متصف ہے وہ اس طرح کہ مکتوب فی المصاحف کا مطلب یہ ہے کہ کتابت کی اشکال اور حروف کی وہ صور جو کہ کلام نفسی پر دال ہیں وہ مصحف میں مکتوب ہیں یہ مطلب نہیں ہے کہ کلام نفسی نے مصحف میں حلول کیا ہے، یہاں تک کہ محل (مصحف) کے حادث ہونے سے کلام نفسی کا حادث ہونا لازم آئے، اسی طرح محفوظ فی القلوب کا مطلب یہ ہے کہ وہ الفاظ جو کہ خزانہ خیال میں جمع ہیں اور کلام نفسی پر دال ہیں اور ہمارے دلوں میں حلول کیا ہے نہ یہ کہ خود کلام نفسی خزانہ خیال میں جمع ہے اور محفوظ فی القلوب ہے حتیٰ کہ محل یعنی دل کے حادث ہونے سے کلام نفسی کا حادث ہونا لازم آئے۔

اسی طرح مقروٗ اور مسموع کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کلام نفسی نے ہماری زبانوں اور کانوں میں حلول کیا ہے، یہاں تک کہ یہ کہا جائے کہ محل یعنی زبان اور کان کے حادث ہونے سے کلام نفسی کا حادث ہونا لازم آجائے، بلکہ کلام نفسی ایک ایسی صفت ہے جو کہ ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے، اس پر دلالت کرنے والے حروف و الفاظ مکتوب، مقروٗ، مسموع ہیں، خود کلام نفسی مکتوب، مقروٗ، مسموع، محفوظ وغیرہ نہیں ہیں اور دال یعنی کلام لفظی کے مکتوب، مسموع، مقروٗ ہونے سے مدلول یعنی کلام نفسی کا حدوث لازم نہیں آتا۔ لہٰذا قرآن بمعنی کلام نفسی غیر مخلوق اور غیر حادث ہیں۔

مثال:

اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ: "النار جوهر مضيئ محرق" آگ ایسا جوہر ہے جو کہ روشن اور جلانے والا ہے، یہ ایک جملہ ہے جو کہ بولا، لکھا اور سنا جاتا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آگ کی حقیقت اصوات کے قبیل سے ہے بولا، لکھا اور سنا جاتا ہے، ورنہ زبان، کان اور اوراق

جل جائیں گے اسی طرح کلام نفسی پر دلالت کرنے والے الفاظ اور حروف سنے، بولے اور لکھے جاتے ہیں، خود کلام نفسی مکتوب، مقروٗاور مسموع وغیرہ نہیں۔

وضاحت:

جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شیٔ کے مختلف وجود ہو سکتے ہیں، جس کی وجہ سے اس شیٔ پر مختلف احکام لگائے جاتے ہیں اور شیٔ کے چار وجود ہیں:

(۱) وجود خارجی (۲) وجود ذہنی

(۳) وجود کتابی (۴) وجود لفظی

(۱) وجود خارجی:

وجود خارجی وہ ہے جس میں شیٔ خارج اور نفس الامر میں موجود ہوتی ہے، چاہے کوئی مانے یا نہ مانے، کوئی اس کا تصور کرے یا نہ کرے۔

(۲) وجود ذہنی:

وجود ذہنی وہ ہے جس میں شیٔ ذہن میں موجود ہوتی ہے۔

(۳) وجود کتابی:

وجود کتابی وہ ہے کہ جس میں شیٔ کتابت میں موجود ہوتی ہے، اس کو وجود تعبیری بھی کہتے ہیں۔

(۴) وجود لفظی:

وجود لفظی وہ ہے کہ شیٔ کے لئے جو لفظ وضع ہوا اس کا تلفظ کیا جائے، یہ تلفظ کا تابع ہوتا ہے۔

وجود کتابی وجود لفظی پر دلالت کرتا ہے اور وجود لفظی وجود ذہنی پر دلالت کرتا ہے اور وجود ذہنی وجود خارجی پر دلالت کرتا ہے، وجود خارجی کے اعتبار سے قرآن سے مراد کلام نفسی ہے اور باقی تین وجود کے اعتبار سے قرآن سے مراد کلام لفظی ہے اور ان کے وجود کی وجہ سے کسی شئ پر مختلف احکام لاگو ہو سکتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد جواب کا حاصل یہ ہے کہ جہاں کہیں قرآن کے لئے ایسی صفات ثابت کی جائیں جو کہ قدیم کے لوازمات میں سے ہیں، جیسا کہ "القرآن غیر مخلوق" اس وقت قرآن کا وجود خارجی مراد ہوگا اور قرآن کا وجود خارجی کلام نفسی ہے اور جس وقت قرآن کو ایسی صفات کے ساتھ متصف کیا جائے جو کہ مخلوق اور حادث کے لوازمات میں سے ہیں، تو اس وقت قرآن سے کلام لفظی مراد ہوگا، اور قرآن کے وجود سے یا وجود لفظی مراد ہوگا جیسے قرأت نصف قرآن اب یہاں وہ الفاظ مراد ہیں جن کو ہم بولتے اور سنتے ہیں۔ یا وجود ذہنی مراد ہوگا، جیسے "حفظت القرآن" یہاں قرآن سے مراد وہ الفاظ ہیں جو کہ خزانۂ خیال میں جمع ہیں یا وجود کتابی مراد ہوگا جیسے کہا جائے کہ بے وضو آدمی کے لئے قرآن کا چھونا حرام ہے، قرآن سے مراد اس کے نقوش ہیں۔ لہٰذا مکتوب، مقروء، مسموع، محفوظ یہ اوصاف کلام لفظی کے ہیں، جس کو ہم حادث مانتے ہیں، مکتوب ہونا وجود کتابی کے اعتبار سے ہے، مقروء اور مسموع ہونا وجود لفظی کے اعتبار سے اور محفوظ ہونا وجود ذہنی کے اعتبار سے ہے اور یہ اوصاف کلام نفسی کے نہیں ہیں، جس کو ہم قدیم مانتے ہیں۔

اعتراض:

اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ جب قرآن کا اطلاق کلام لفظی اور کلام نفسی دونوں پر ہوتا ہے تو اصولیین نے قرآن مجید کی ایسی تعریف کیوں کی جو کہ صرف کلام لفظی پر صادق آتی ہے، علماء اصول

نے قرآن کی یہ تعریف کی ہے، "المنزل علی الرسول المکتوب فی المصاحف المنقول عنه نقلا متواترا" یہ تعریف صرف کلام لفظی پر صادق آتی ہے کلام نفسی پر صادق نہیں آتی، ان کو چاہیئے تھا کہ ایسی تعریف کرتے جو کہ دونوں کو شامل ہوتی۔

جواب:

جواب کا حاصل یہ ہے کہ علماء علم اصول کے نزدیک قرآن الفاظ اور معانی دونوں سے عبارت ہے لیکن چونکہ علم اصول فقہ میں احکام شرعیہ پر دلیل قائم کرنا مقصود ہوتا ہے اور دلیل بننے کی صلاحیت الفاظ میں ہوتی ہے نہ کہ معنی میں، کیونکہ معنی ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم اور قدیم ہے، اس وجہ سے اصولیین نے ایسی تعریف کی جو کہ صرف کلام لفظی کو شامل ہے۔

کلام نفسی کا سننا ممکن ہے یا نہیں؟

شیخ ابو الحسن اشعری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک کلام نفسی کا سننا ممکن ہے:

پہلی دلیل: ان کی پہلی دلیل یہ آیت ہے:

وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ (توبة ٦)

دوسری دلیل: دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر اللہ تعالیٰ کا کلام سنا تھا۔

اور ابو اسحٰق اسفرائینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور شیخ ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک کلام اللہ کا سننانا ممکن ہے۔

پہلی دلیل کا جواب:

ان دونوں حضرات نے پہلی دلیل کا یہ جواب دیا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ الفاظ سنے جو کہ کلام نفسی پر دلالت کرتے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے: ”سمعت علم فان“ اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ میں نے وہ الفاظ سنے جو کہ فلاں کے علم پر دلالت کرتے ہیں۔

دوسری دلیل کا جواب:

دوسری دلیل کا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہ الفاظ سنے تھے جو کہ کلام نفسی پر دلالت کرتے ہیں۔

اعتراض:

پھر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ کلام لفظی کو تو ہم سنتے ہیں، پھر کلیم کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخصوص کرنے کی کیا وجہ؟

جواب: جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرشتہ اور کتاب کے واسطہ کے بغیر کلام اللہ سنا تھا، اور ہم نے کتاب کے واسطہ سے سنا ہے اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام نے فرشتہ کے ذریعے سنا ہے، اس وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ کے ساتھ خاص کیئے گئے۔
(شرح العقائد مع الشرح)

(۸) صفت تکوین

تکوین ایک صفت ہے اور اس کے مختلف نام اور تعبیرات ہیں، اس کو فعل، تخلیق، ایجاد، اختراع وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تکوین کا معنیٰ:

جس کا حاصل یہ ہے کہ شئ معدوم کو عدم سے وجود کی طرف لانے کا نام تکوین ہے۔

تکوین صفت باری تعالیٰ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ عقل اور نقل کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم کا خالق اور مکون ہے اور قاعدہ ہے کہ مشتق کا اطلاق اس پر کیا جاتا ہے جس کے ساتھ ماخذ اشتقاق قائم ہو، تو جب اللہ تعالیٰ مکون اور خالق ہیں تو لا محالہ تکوین مذکورہ بالا قاعدہ کی وجہ سے اس کے ساتھ قائم ہو گی۔

تخلیق یعنی کسی شئ کو پیدا کرنا، ترزیق یعنی جانداروں کو رزق دینا، تصویر یعنی جاندار وغیرہ کو صورت دینا، سبزہ اگانا، زندہ کرنا اور موت دینا یہ سب صفت تکوین ہی کے تحت داخل ہیں۔[52]

قال اللہ تعالیٰ: إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (یسٓ ۸۲)

اس کا کام تو یہی ہے کہ جب کسی چیز کو چاہے تو اس سے فرمائے ہو جا وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (فاطر ۳)

کیا اللہ کے سوا اور بھی کوئی خالق کہ آسمان اور زمین سے تمہیں روزی دے۔

قال اللہ تعالیٰ: هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (الحشر ۲۴)

وہی ہے اللہ بنانے والا پیدا کرنے والا ہر ایک کو صورت دینے والا۔

والتکوین و الخلق و التخلیق و الایجاد و الاحداث و الاختراع و نحو ذلک صفة اللہ تعالیٰ لاطباق العقل و النقل علی انه خالق للعائم مکون له۔[53]

---

[52] (اسلامی عقائد، ص ۳۳)

[53] (شرح العقائد، ص ۶۴)

صفت تکوین ازلی ہے:

امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک یہ صفت بھی قدیم اور ازلی ہے یعنی ہمیشہ ہمیشہ سے ہے اور سا کا فائدہ یہ ہے کہ جب کسی بھی شئ کے وجود کا وقت (جو کہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں ہے) آجاتا ہے تو اس صفت کے تحت اللہ تعالیٰ اس شئ کو عدم سے وجود میں لے آتے ہیں۔

امام ابو الحسن اشعری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ صفت تکوین کو علیحدہ سے مستقل صفت نہیں مانتے بلکہ تکوین کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت ہی کے ساتھ متعلق مانتے ہیں۔

دلیل نمبر ۱:

دلیل کا حاصل یہ ہے کہ اگر تکوین ازلی نہ ہو بلکہ حادث ہو تو باری تعالیٰ کا محل حوادث ہونا لازم آئے گا اور باری تعالیٰ کا محل حوادث ہونا باطل ہے، لہٰذا تکوین کا حادث ہونا باطل ہے۔

دلیل نمبر ۲:

دلیل کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کلام ازلی میں اپنے آپ کو خالق کہا ہے، اب اگر اللہ تعالیٰ کو ازل میں خالق نہ کہا جائے تو یا تو ذات باری تعالیٰ کا کاذب ہونا لازم آئے گا یا مجاز کی طرف عدول لازم آئے گا اور خالق بمعنی "خالق فی المستقبل یا قادر علی الخلق" ہو گا اور ذات باری تعالیٰ کا کاذب ہونا بھی باطل ہے اور عدول الی المجاز بھی باطل ہے، لہٰذا ازل میں باری تعالیٰ خالق اور مکون ہو گا۔

عدول الی المجاز کے بطلان کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہاں حقیقی معنی معتذر نہیں ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر خالق کا معنی مجازاً "قادر علی الخلق" لیا جائے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ جتنی اعراض اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں، ان سب کا اطلاق بھی اللہ تعالیٰ پر صحیح ہونا چاہیئے مثلاً: قادر علی

السواد کی وجہ سے اسود قادر علی البیاض کی وجہ سے ابیض کا اطلاق بھی اللہ تعالیٰ پر درست ہونا چاہیئے، حالانکہ اعراض کا تعلق ذات باری تعالیٰ پر ناجائز ہے، تو معلوم ہوا کہ خالق بمعنی "قادر علی الخلق" نہیں ہے۔

دلیل نمبر ۳:

دلیل کا حاصل یہ ہے کہ تکوین اگر ازلی نہ ہو بلکہ حادث ہو تو اس کا حدوث دوسری تکوین کی وجہ سے ہو گا یا بغیر تکوین کے ہو گا، دونوں صورتیں باطل ہیں۔ لہٰذا تکوین کا حادث ہونا بھی باطل ہے۔

پہلی صورت میں تو اس لئے باطل ہے کہ اس صورت میں تسلسل لازم آئے گا وہ اس طرح کہ پہلی تکوین کا حدوث دوسری تکوین کی وجہ سے ہو تو دوسری تکوین بوجہ حادث ہونے کے تیسری تکوین کی محتاج ہو گی اور یہی سلسلہ لاالی نہایہ چلتا رہے گا اور یہی تسلسل ہے جو کہ باطل ہے۔

دوسری وجہ پہلی صورت کے بطلان کی یہ ہے کہ اس صورت میں عالم کے وجود کا محال ہونا لازم آئے کیونکہ عالم کا وجود موقوف ہو گا تکوینات غیر متناہی پر اور تکوینات غیر متناہی محال ہیں اور موقوف ہیں اور موقوف علی المحال محال ہوتا ہے، لہٰذا عالم کا وجود محال ہو جائے گا حالانکہ ہم مشاہدہ سے عالم کے وجود کو دیکھتے ہیں۔

دوسری صورت اس لئے باطل ہے کہ اس صورت میں تعطیل صانع لازم آئے گا، کیونکہ جب ایک حادث کا بغیر صانع کے موجود ہونا ممکن ہوا تو تمام کائنات کا بغیر صانع کے موجود ہونا ممکن ہو گا اور تعطیل صانع محال ہے لہٰذا تکوین کا بغیر صانع کے موجود ہونا محال ہے، تو جب دونوں صورتیں

باطل ہوئیں تو تکوین کا حادث ہونا بھی باطل ہو گا پس جب تکوین کا حادث ہونا باطل ہے تو لا محالہ تکوین ازلی اور قدیم ہو گا۔

دلیل نمبر ۴:

دلیل کا حاصل یہ ہے کہ اگر تکوین حادث ہے تو یا ذات باری تعالیٰ میں حادث ہو گی یا ذات باری تعالیٰ کے علاوہ میں حادث ہو گی جیسا کہ ابو ھزیل کا مذہب ہے کہ ہر جسم کی تکوین اس جسم کے ساتھ قائم ہوتی ہے اور یہ دونوں شقیں باطل ہیں۔

پہلی صورت اس لئے باطل ہے کہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا محل حوادث ہونا لازم آئے گا اور دوسری صورت اس لئے باطل ہے کہ اس صورت میں شئ کا اپنے نفس کے لئے مکون ہونا لازم آئے گا، تو جب دونوں صورتیں باطل ہوئیں تو تکوین کا حادث ہونا بھی باطل ہو گا، پس جب تکوین کا حادث ہونا بھی باطل ہے تو تکوین لا محالہ ازلی ہو گا۔

فائدہ نمبر ۱:

ہم نے جو چار دلائل ذکر کیئے ہیں ان کا دارومدار اس بات پر ہے کہ تکوین کو مستقل صفت قرار دیا جائے اور ہم ماتریدیہ تکوین کو مستقل صفت مانتے ہیں۔

فائدہ نمبر ۲:

ہمارے مذہب کی تائید اس آیت سے بھی ہو سکتی ہے إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (یٰس ۸۲) طریقہ استدلال یہ ہے کہ اگر تکوین مستقل صفت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ”اذا اراد شیئا فیکن“ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ”کُن“ کا لفظ ذکر کیا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تکوین مستقل صفت ہے۔

اشاعرہ کا مذہب:

اشاعرہ کہتے ہیں کہ تکوین حادث ہے، دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ تکوین کا تصور بغیر مکون کے نہیں ہو سکتا جس طرح ضرب بغیر مضروب کے موجود نہیں ہو سکتا، تو اگر تکوین قدیم ہو جائے تو اس سے مکونات کا قدیم ہونا لازم آئے گا، حالانکہ مکونات حادث ہیں تو معلوم ہوا کہ تکوین حادث ہیں۔

جواب:

ماتریدیہ کی طرف سے جواب یہ ہے کہ تکوین کا تعلق عالم کے ساتھ ہے لیکن تعلق ازل سے نہیں، بلکہ عالم کے موجود ہونے کے وقت ہے پس تکوین ازلی ہے اور مکونات کا تعلق حادث ہے کیونکہ صفت کا قدیم ہونا متعلقات کے قدم کو مستلزم نہیں ہوتا جس طرح علم اور قدرت قدیم ہیں اور اس کے تعلقات یعنی معلومات اور مقدورات حادث ہیں، اسی طرح تکوین قدیم ہے اور مکونات حادث ہیں کیونکہ تعلقات حادث ہوتے ہیں اور صفات قدیم ہوتی ہیں۔

علامہ صابونی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ عالم کے وجود میں تین احتمالات ہیں

پہلا احتمال:

یہ ہے کہ وجود عالم کا تعلق ذات باری تعالیٰ اور ان کی صفات میں سے کسی صفت کے ساتھ نہ ہو۔ یہ صورت باطل کیونکہ اس صورت میں دو قسم کی خرابی لازم آئے گی:

(۱) تعطیل صانع (۲) حوادث کا محدث سے مستغنی ہونا۔

دوسرا احتمال:

یہ ہے کہ عالم کے وجود کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت کے ساتھ ہو اور صفت کے قدم کی وجہ سے عالم بھی قدیم ہو، یہ صورت اس لئے باطل ہے کہ عالم تمام اجزاء سمیت حادث ہے۔

تیسرا احتمال:

یہ ہے کہ عالم کے وجود کا تعلق کسی صفت سے ہو اور عالم حادث ہو اور یہی صورت درست ہے، اسی طرح صفت تکوین کے ساتھ مکونات کا تعلق ہے۔ اور تکوین کا قدیم ہونا مکونات کے قدیم ہونے کو مستلزم نہیں ہے لہٰذا صفت قدیم ہوئی اور تکوین کا قدیم ہونا مکونات کے قدم کو مستلزم نہ ہوا۔

تکوین عین مکون نہیں ہے:

اشاعرہ حضرات نے جب دیکھا کہ مخلوق پر خلق کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: هَذَا خَلْقُ اللهِ فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ (لقمان ۱۱) یا جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ: "اجتمع خلق عظیم" یہاں خلق بمعنی مخلوق ہے، تو انہوں نے کہا کہ تکوین عین مکون ہے اور امر اضافی ہے۔

ماتریدیہ فرماتے ہیں کہ تکوین عین مکون نہیں ہے۔

دلیل نمبر ۱:

دلیل کا حاصل یہ ہے کہ تکوین عین مکون نہیں ہے کیونکہ تکوین فعل ہے اور مکون مفعول ہے اور فعل اور مفعول کے درمیان مغایرت ہوتی ہے جیسا کہ ضرب اور مضروب اکل اور ماکول کے درمیان مغایرت ہے اسی طرح تکوین اور مکون کے درمیان مغایرت ہے۔

دلیل نمبر ۲:

اگر تکوین عین مکون ہو جائے تو مکون کا بذات خود موجود ہونا بلا صنع صانع لازم آئے گا، اسی طرح مکون کا قدیم ہونا اور مستغنی عن الصانع ہونا لازم آئے گا اور مکون کا بذات خود پیدا ہونا، قدیم ہونا، مستغنی عن الصانع ہونا باطل ہے۔ لہٰذا تکوین کا عین مکون ہونا باطل ہے، حالانکہ مکون یعنی عالم حادث ہے اور صانع کا محتاج ہے۔ رہی یہ بات کہ مکون کا بذات خود پیدا ہونا، قدیم ہونا، مستغنی عن الصانع ہونا کیسے لازم آئے گا؟ وہ اسی طرح کہ جب تکوین عین مکون ہے تو مکون اس تکوین سے پیدا ہو گا جو اس کا عین ہے اور جب مکون عین اس تکوین سے پیدا ہو جو اس کا عین ہے تو ظاہر ہے کہ مکون کا وجود لذاتہ ہو گا اور جا کا وجود لذاتہ ہوتا ہے وہ قدیم اور مستغنی عن الصانع ہوتا ہے اور مکون کا بذات خود پیدا ہونا، قدیم ہونا، مستغنی عن الصانع ہونا باطل ہے لہٰذا تکوین کا عین مکون ہونا بھی باطل ہے۔

دلیل نمبر ۳:

دلیل کا حاصل یہ ہے کہ اگر تکوین عین مکون ہو جائے تو ذات باری تعالیٰ کا خالق للعالم اور صانع ہونا جائز نہ ہو گا اور خالق کا عالم کے ساتھ صرف یہ تعلق ہو کہ خالق عالم سے مقدم اور عالم پر اس کی قدرت ہے، لیکن اس میں مؤثر نہیں ہے، کیونکہ تکوین جب عین مکون ہوا تو ہر مکون اس تکوین سے پیدا ہو گا جو کہ اس کے ساتھ قائم ہے، تو لامحالہ ہر مکون بذات خود موجود ہو گا صانع مؤثر نہ ہو گا اور ذات باری تعالیٰ کا خالق اور صانع نہ ہونا باطل ہے لہٰذا تکوین کا عین مکون ہونا بھی باطل ہے۔

دلیل نمبر ۴:

دلیل کا حاصل یہ ہے کہ اگر تکوین عین مکون ہو جائے تو باری تعالیٰ کو مکون الاشیاء ہونا درست نہ ہو گا، کیونکہ مکون اس کو کہتے ہیں جس کے ساتھ تکوین قائم ہو، تو جب تکوین عین مکون ہوا تو تکوین

ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم نہ ہو گا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا مکون ہونا درست نہ ہو گا، حالانکہ باری تعالیٰ مکون الاشیاء ہیں تو جب باری تعالیٰ مکون الاشیاء تو تکوین کا عین مکون ہونا باطل ہو گا۔

دلیل نمبر ۵:

دلیل کا حاصل یہ ہے کہ اگر تکوین کو عین مکون مان لیا جائے تو یہ کہنا صحیح ہو گا: ”خالق سواس ھذا لجسم اسود“ یعنی اس جسم کے سواد کا خالق اسود ہے۔ اور یہ کہنا اس لئے صحیح ہو گا کہ خلق تکوین ہے اور سواد مکون ہے تو جب تکوین اور مکون ایک ہے تو خلق اور سواد بھی ایک ہوں گے اور ان دونوں کا محل بھی ایک ہو گا، لہٰذا جس کے ساتھ سواد قائم ہو گا اس کے ساتھ تکوین اور خلق قائم ہو گا، کیونکہ دونوں کا محل ایک ہے اور سواد اسود کے ساتھ قائم ہے تو خلق بھی اسود کے ساتھ قائم ہو گا، تو جب خلق اسود کے ساتھ قائم ہو گا تو اسود کو خالق کہنا صحیح ہو گا، کیونکہ جس کے ساتھ خلق اور تکوین قائم ہوتا ہے اسے خالق اور مکون کہا جاتا ہے، حالانکہ اسود کو خالق کہنا درست نہیں ہے، پس معلوم ہوا کہ تکوین عین مکون نہیں ہے۔

اسی طرح اگر تکوین عین مکون ہو جائے تو یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اس پتھر کے سواد کا خالق پتھر ہے، کیونکہ خلق تکوین ہے اور سواد مکون ہے تو جب تکوین اور مکون ایک ہے تو خلق اور سواد بھی ایک ہونگے اور دونوں کا محل بھی ایک ہو گا تو جس کے ساتھ سواد قائم ہو گا اس کے ساتھ خلق قائم ہو گا کیونکہ دونوں کا محل ایک ہے اور سواد حجر کے ساتھ قائم ہے تو خلق بھی حجر کے ساتھ قائم ہو گا تو جب خلق اور تکوین حجر کے ساتھ قائم ہو گا تو حجر کو خالق کہہ کر یوں کہنا درست ہونا چاہیئے: **”خالق سواد ھذاالحجر حجر“** حالانکہ یہ کہنا درست نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ تکوین عین مکون نہیں ہے۔

اعتراض:

اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ تکوین اور مکون کے درمیان مغایرت ایک بدیہی امر ہے اور بدیہی چیز پر استدلال قائم نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا مذکورہ دلائل کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی؟

جواب:

یہ دلائل نہیں ہیں بلکہ یہ فعل اور مفعول کے درمیان مغایرت پر تنبیہات ہیں، کیونکہ مغایرت کا ہونا بدیہی امر ہے اور بدیہی چیز پر تنبیہات کو پیش کیا جاتا ہے۔

اشاعرہ کے قول کی توجیہ:

علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اشاعرہ کے قول کی توجیہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ: اشاعرہ حضرات جو کہتے ہیں کہ تکوین عین مکون ہے اس سے اشاعرہ کی مراد یہ نہیں کہ تکوین اور مکون کا مفہوم ایک ہے، بلکہ اشاعرہ کی مراد یہ ہے کہ جب فاعل کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو خارج میں فاعل اور مفعول کے علاوہ کوئی اور شئی نہیں ہوتی ہے۔ رہا فعل اس کا حقیقتاً خارج میں وجود نہیں ہوتا، وہ ایک امر اضافی اور نسبت ہے جو کہ فاعل اور مفعول دونوں کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے مثلاً ضرب کو لیجئے کہ خارج میں ضارب اور مضروب کا تحقق ہوتا ہے اور ضرب ایک امر اضافی ہے، جو کہ ضارب اور مضروب کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے، حقیقتاً اس وجود نہیں ہوتا ہے، اسی طرح تکوین بھی ایک امر اضافی ہے جس کا خارج میں حقیقتاً کوئی تحقق نہیں ہوتا بلکہ مکوِن اور مکوَن دونوں کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ تو اشاعرہ نے جو کہا ہے کہ "تکوین عین مکون ہے" اس سے اشاعرہ کی مراد یہ نہیں ہے کہ دونوں کا مفہوم ایک ہے یعنی عینیت سے اتحاد فی المفہوم مراد نہیں لیا ہے ورنہ وہ محالات لازم آئیں گے جو کہ ماتریدیہ نے ذکر کئے ہیں بلکہ اشاعرہ کی مراد یہ ہے کہ ایسی بات نہیں ہے کہ خارج میں

تکوین کا الگ تحقق ہے اور مکون کا الگ تحقق ہے بلکہ خارج میں جو تحقق تکوین کا ہے ان دونوں کے درمیان وجود خارجی کے اعتبار سے اتحاد ہے مفہوم کے اعتبار سے اتحاد نہیں ہے۔

اس توجیہ کی توضیح بالنظیر والمثال:

جس کا حاصل یہ ہے کہ مناطقہ حضرات کہتے ہیں کہ ماہیت اور وجود ماہیت کے درمیان خارج میں عینیت ہے تو اس سے مناطقہ کی مراد یہ نہیں کہ ماہیت اور وجود کا مفہوم ایک ہے، کیونکہ مفہوم دونوں کا الگ الگ ہے، ماہیت "مابہ الشئی ھو ھو" کو کہتے ہیں جبکہ شئی کا خارج میں موجود ہونا وجود کہلاتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ خارج میں ماہیت کا الگ تحقق ہوتا ہے اور وجود جو کہ ماہیت کو عارض ہوتا ہے اس کا الگ تحقق ہوتا ہے، جیسا کہ قابل "جسم" اور مقبول "سواد" کا الگ الگ تحقق ہوتا ہے، پھر یہ دونوں ایک ساتھ جمع ہو جاتے ہیں۔ وجود اور ماہیت اس طرح نہیں کہ ماہیت کا الگ تحقق ہو اور وجود کا الگ تحقق ہو، پھر ان دونوں کا اجتماع ہو گیا ہو، بلکہ مناطقہ کی مراد یہ ہے کہ خارج میں جب ماہیت موجود ہوتی ہے تو اس کا موجود ہونا ہی وجود اور حصول ہو گا، وجود کا الگ تحقق نہیں ہوتا، خارج میں ماہیت اور وجود کے درمیان مغایرت نہیں ہے، البتہ ذہن میں ماہیت اور وجود کے درمیان مغایرت ہو سکتی ہے، یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ ذہن ایک کا تصور دوسرے کے بغیر کرے، اس طرح تکوین اور مکون میں وجود ذہنی کے اعتبار سے مغایرت ہو سکتی ہے، کہ ذہن ایک کا تصور دوسرے کے بغیر کرے، لیکن وجود خارجی کے اعتبار اور عینیت ہے۔

علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اشاعرہ کی تائید میں فرماتے ہیں کہ:

جب اشاعرہ کی مراد اس قول سے کہ "تکوین عین مکون ہے" یہ ہے کہ خارج میں تکوین اور مکون ایک ہی چیز ہیں، اور تکوین امر اضافی ہے خارج میں مکون کے علاوہ تکوین کا الگ وجود نہیں ہے،

تو مذکورہ دلائل سے اس مذہب اور رائے کا ابطال اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک یہ بات ثابت نہ کی جائے کہ اللہ تعالیٰ سے اشیاء کا صدور ایسی صفت پر موقوف ہے جو کہ ارادہ اور قدرت کے علاوہ ہے، حالانکہ یہ ناممکن ہے، کیونکہ اشیاء کا صدور ارادہ اور قدرت کی وجہ سے ہے تکوین کی وجہ سے نہیں، رہی یہ بات کہ اس صورت میں اس رائے کا ابطال کیوں نہ ہو گا۔

جواب:

تو اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ دلائل مکون اور تکوین کے درمیان مفہوم کے اعتبار سے مغایرت ثابت ہونے پر دلالت کرتی ہیں، حالانکہ اشاعرہ بھی مفہوم کے اعتبار سے مغایرت کے قائل ہیں، اشاعرہ حضرات جو مغایرت ثابت کرتے ہیں وہ وجود خارجی کے اعتبار سے ہے، البتہ اگر تکوین کا صفت حقیقی ہونا ثابت ہو جائے تو تکوین اور مکون کے درمیان خارج میں مغایرت ثابت ہو گی اور تکوین ازلی ہو گی۔

علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی توجیہ کا جواب:

علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مذکورہ توجیہ کا جواب ماتریدیہ نے یہ دیا ہے کہ جب تکوین کو امر اضافی قرار دیا ہے اور مکوِن اور مکون کے درمیان جو نسبت ہے اس کو تکوین کہا جاتا ہے تو اس طرح دیگر صفات مثلاً علم وغیرہ کو امر اضافی کہا جائے، کیونکہ خارج میں عالم اور معلوم کے علاوہ کوئی چیز موجود نہیں تو علم بھی عالم اور معلوم کے درمیان ایک نسبت ہے لہٰذا علم اور دیگر صفات کو بھی امر اضافی کہا جائے، حالانکہ آپ حضرات علم وغیرہ کو صفات حقیقیہ مانتے ہیں تو جب ان صفات کو صفات حقیقیہ مانتے ہیں تو لا محالہ تکوین کو حقیقی صفت ماننا پڑے گا اگر نہیں مانیں گے تو تحکم ہو گا۔

(شرح العقائد الشرح)

اشیاء کے وجود کا تعلق کیا کلمہ کُن کے ساتھ ہے

قرآن پاک میں ہے:

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (یس ۸۲)

اس کا کام تو یہی ہے کہ جب کسی چیز کو چاہے تو اس سے فرمائے ہو جا وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

(۱) امام اشعری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک اشیاء کے وجود کا تعلق اللہ تعالیٰ کے کلام ازلی کے ساتھ ہوتا ہے اور کلمہ کُن اس کلام ازلی پر دلالت کرتا ہے۔

(۲) امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک اس کلمہ سے مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت سے وہ شئ بلا کسی تاخیر کے وجود میں آجاتی ہے۔ غرض محض اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت کا اظہار ہے خاص یہ کلمہ کہنا مراد نہیں ہے۔

(۳) امام فخر الاسلام بزدوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک اشیاء کا وجود تکوین وایجاد اور کلمہ کن کے ساتھ خطاب دونوں سے ہی ہوتا ہے۔[54]

(مفصل ومدلل عقائد اہلسنت والجماعت)

و اللہ تعالیٰ اعلم بالصواب و الحق۔

۱۶) نیت مراقبہ اصل اخفیٰ: الٰہی اخفائے من بمقابل اخفائے نبی علیہ السّلام، آن فیض تجلّائی شان جامع خود کہ بہ اخفائے نبی علیہ السّلام رسانیدہ بہ اخفائے من نیز برسانی بواسطہ پیران کبار۔ توقف۔۔۔۔روز

[54] (اسلامی عقائد از مفتی عبد الواحد، ص ۳۳)

اس لطیفہ کی فناء یہ ہے کہ سالک کو اخلاق حق سبحانہ و تعالیٰ اور اخلاق نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ تخلق و اتصاف اور آراستگی حاصل ہو جاتی ہے، اور یہی اثرات آئندہ مقامات میں پختہ ہوتے رہتے ہیں۔اس مقام میں حضور ﷺ کی پوری طرح اتباع کرنا مفید ہوتا ہے۔

صفات، شیونات اور ذات سب کے مجموعہ کو شان جامع کہتے ہیں اور یہ تجلی نبی کریم ﷺ کو اللہ رب العزت نے عطا فرمائی۔ چنانچہ اس سبق کے ملنے پر جن کا یہ لطیفہ زیادہ نمایاں ہوتا ہے پھر اس سے فیض ان کو آتا ہے، جن کے اندر محبوبیت آجاتی ہے۔ لطیفۂ سر غالب تھا تو وہ مرید تھے اور لطیفۂ اخفیٰ غالب آگیا تو مراد بن گئے، ان کے اندر محبوبیت آگئی، ایسے اخلاق عظیم آجاتے ہیں کہ انسان وَإِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ (القلم ۴) ''بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں'' کا نمونہ بن جاتا ہے، تصوف کا جو مقصود ہے کہ اخلاق ذمیمہ ختم ہوں اور حمیدہ آجائیں، اس سبق پہ آکر اخلاق حمیدہ کامل طور پر حاصل ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس سبق پر پہنچنے تک بندے کے مقامات عشرۂ سلوک طے ہو جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جو لطیفۂ اخفیٰ تک پہنچ جاتا ہے تو توبہ، انابت، زہد، ریاضت وغیرہ سارے مقامات عشرہ طے ہو جاتے ہیں اور اس بندے کے اندر محبوبیت آجاتی ہے، اس بندے کے اندر حمیت کی صفت غالب آجاتی ہے، رحیم و کریم طبیعت ہو جاتی ہے، عفوو درگزر والی طبیعت نصیب ہو جاتی ہے۔ سبحان اللہ!

چنانچہ حدیث پاک میں ہے:

الراحمون يرحمهم الرحمن ارحموا من في الارض يرحمكم من في السماء[55]

---

[55] سنن الترمذي، ج۳، ص ۲۱۷

تو رحمۃ اللعالمین ﷺ کے صدقے ان کی اتباع کے کمال کی وجہ سے پھر بندے کو اس میں سے حصہ نصیب ہو جاتا ہے، پھر دل میں امت کا غم پیدا ہو جاتا ہے، مخلوق کا غم آ جاتا ہے۔ تو یہ پانچ سبق مراقبات مشاربات کہلاتے ہیں، اللہ تعالیٰ یہ صفات ہمیں بھی عطا فرمائیں، آمین

لطائف کی اپنے اصل کی طرف سیر

تصوف کے اسباق کو کچھ دائروں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے دائرے کو "دائرہ امکان" کہتے ہیں، دائرہ امکان کے درمیان میں عرش آتا ہے۔ آدھا دائرہ عرش سے نیچے ہے اور آدھا عرش کے اوپر ہے، عرش کے نیچے عالم امر کے لطائف ہیں یعنی قلب، روح، سر خفی، اخفیٰ اصل نہیں ہیں بلکہ سایہ ہے، ان کی اصل عرش سے اوپر ہے۔ جب لطیفہ کی سیر ہوتی ہے تو روح لطیفہ اندر سے نکل کر اپنے اصل کی طرف جاتی ہے۔ کل شئی یرجع الیٰ أصله، تو اس کو "سیر الی اللہ" کہتے ہیں۔

مکتوبات معصومیہ دفتر دوم مکتوب ۸۵ میں حضرت خواجہ معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں ہر لطیفہ کی فنا اس لطیفہ کے اپنے اصل تک پہنچنے سے وابستہ ہے اور چونکہ روح کی اصل صفات بلکہ ظلال صفات کے مقام سے ہے کیونکہ عالم امر کے پانچوں لطائف کے اصول، اسماء وصفات کے ظلال کے دائرہ میں داخل ہیں کہ ان میں سیر واقع ہونا ولایت صغریٰ ہے جو کہ اولیاء اللہ کی ولایت ہے، میں فنائے روح صفات کے ظلال تک وصول سے عبارت ہے، جیسا کہ قلب کی اصل افعال واجب تعالیٰ کے مقام سے ہے اور اس کی فنا اس کے اس مقام تک وصول سے وابستہ ہے۔ سالک کو جب مشارب میں فنا حاصل ہو جاتی ہے (لطیفۂ قلب کو تجلیات افعال، لطیفۂ روح کو صفات ثبوتیہ، لطیفۂ سر کو شیونات ذاتیہ، لطیفۂ خفی کو صفات سلبیہ اور لطیفۂ اخفیٰ کو شان جامع میں فنا) گویا اس کو دائرۂ ولایت صغریٰ میں فنا حاصل ہو جاتی ہے۔

تنبیہ: ان پانچوں مراقبات مشارب میں ہر مراقبہ کی نیت کر کے جب اس لطیفے کے فیض کے انتظار میں بیٹھے تو ہر اس لطیفے کو جس میں مراقبہ کر رہا ہے آنحضرت ﷺ تک اپنے سلسلے کے تمام بزرگوں کے اس لطیفے کے سامنے اس شیشہ کی مانند، جو آپس میں ایک دوسرے کے سامنے ہوں فرض کر کے خیال کرے کہ اس لطیفے کا خیالی فیض جناب باری تعالیٰ سے آں سرور عالم ﷺ کے اس لطیفے میں آرہا ہے، پھر سلسلہ کے تمام بزرگوں کے اس لطیفہ کے آئینوں سے منعکس ہو کر میرے اس لطیفہ میں آرہا ہے۔

حدیث قدسی: **أنا عند ظن عبدی بی۔**

ترجمہ: میں اپنے بندے کے ساتھ اس کے گمان کے موافق ہوں۔

کے بموجب اپنے مقصد میں کامیاب ہو گا۔

وَمَا ذٰلِکَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ (ابراھیم ۲۰)

نیز جاننا چاہیئے کہ عالم امر کے ان پانچوں لطائف کی فنا حاصل ہونے کے بعد دائرہ امکان کی سیر ختم ہو جاتی ہے، اس سیر میں جمعیت، حضور، جذب لطائف بسوئے اصول خود اور حالات و واردات (جو فوق سے سالک پر وارد ہوتے ہیں اور سالک ان کو برداشت کرنے سے عاجز ہو جاتا ہے) کا حاصل ہونا ضروری ہے۔

لطائف کی فنا کی مختلف علامات

حضرت شاہ احمد سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مکتوب ۵ میں لکھا ہے کہ فنائے قلب کی علامت دل سے ماسویٰ کا بھول جانا ہے حتیٰ کہ اگر تکلیف سے بھی یاد کرے تو یاد نہ آئے۔ یعنی لطیفۂ قلب کو جب تجلیات افعالیہ میں فنا حاصل ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی یاد میں اتنا مستغرق ہو جاتا ہے کہ گناہوں

کی طرف دھیان بھی کرنا چاہے تو طبیعت ادھر متوجہ ہی نہیں ہوتی، اس طرف سوچ ہی نہیں جاتی۔ سالک کے ذہن سے ماسوٰی اللہ تعالیٰ کے نقش ایسے مٹ جاتے ہیں جیسے کہ بعض گناہ آپ چھوڑ چکے ہوں، اب آپ یاد بھی کرنا چاہیں تو آپ کو وہ بچپن، لڑکپن اور جوانی کے گناہ یاد نہیں آئیں گے، اسی طرح ماسوٰی کی یاد دل سے مٹ جاتی ہے، طبیعت اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتی، اتنااللہ، اللہ، اللہ کا غلبہ ہو جاتا ہے، فرماتے ہیں کہ اس حالت میں نہ ہی دنیا کی خوشی سے خوش ہو اور نہ ہی کسی غم سے غمگین ہو۔ فنائے روح کی علامت یہ ہے کہ تجلّیٔ صفاتی کا ظہور ہو یعنی سالک کی صفات معدوم ہو جائیں اور اس کی جگہ صفات حق ظاہر ہو جائیں۔ یعنی سالک کو اس سبق میں تخلقوا بأخلاق اللہ تعالیٰ والا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ حدیث قدسی میں ہے:

وما يزال عبدي يتقرب إلي بالنوافل حتى أحبه فإذا أحببته كنت سمعه الذي يسمع به وبصره الذي يبصر به ويده التي يبطش بها ورجله التي يمشي بها وإن سألني لأعطينه۔[56]

یعنی "بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرلیتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، پس جب میں اس کو محبوب بنالوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے کسی چیز کا سوال کرتا ہے تو میں اسے عطا کرتا ہوں"۔

فنائے سر کی علامت یہ ہے کہ سالک کی ذات، حق جل جلالہ کی ذات میں مستہلک یعنی فنا ہو جاتی ہے۔ اپنے آپ سے الگ ہو کر، من و تو سے گزر کر خدا رہ جاتا ہے یعنی سالک فنا تک پہنچ جاتا ہے اور اپنے آپ کو گم پاتا ہے پس اللہ ہی اللہ رہ جاتا ہے، چنانچہ اس کیفیت کے متعلق کسی نے

---

[56] صحيح البخاري، ج۵، ص ۲۳۸۴۔ الناشر: دار ابن كثير، اليمامة - بيروت

یوں فرمایا ہے:

جو ''لا'' کہا، وہ ''لا'' ہوا، وہ ''لا'' بھی اس میں ''لا'' ہوا

جزء ''لا'' ہوا، کل ''لا'' ہوا، پھر کیا ہوا، اللہ ہوا!

مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دفتر دوم مکتوب ۳ میں فرماتے ہیں کہ جو کچھ آفاق و انفس کے آئینوں میں ظاہر ہوتا ہے وہ ظلیت کے داغ سے داغ دار رہے، یہ اللہ کی تجلی نہیں ہے، یہ تجلی سے بھی نیچے کی چیز ہے، تجلی تو بہت اونچی چیز ہوتی ہے چنانچہ مراقبۂ احدیت سے پہلے جو سیر ہوتی ہے وہ اعتبارات میں ہوتی ہے۔ مشارب میں جو سیر ہوتی ہے وہ ظل میں سیر ہوتی ہے، یہ سیر سب ظلال میں ہے پھر جب مراقبۂ معیت کر کے اوپر جاتے ہیں تو پھر اسماء و صفات میں سیر ہوتی ہے۔ ابھی تو منزل بہت دور ہے جو لطائف کے اسباق والے ہیں، ابھی تو وہ اعتبارات میں ہیں جو ظلال سے بھی نیچے کا درجہ ہے جس میں وہ پھر رہے ہیں۔ اللہ اکبر کبیراً! کہاں سب سے اوپر تجلّی ذات، پھر شیونات، پھر صفات پھر ان کے اسماء، پھر ان کے افعال، پھر ان کے نیچے یہ اعتبارات، ابھی تو ہم اعتبارات میں سیر کر رہے ہیں، اسماء و صفات تو بہت اونچا مقام ہے، اسماء و صفات کی سیر تو انبیاء کو حاصل ہوئی اور اس کا نام ولایت کبریٰ رکھا گیا۔

مکتوبات معصومیہ دفتر دوم مکتوب ۸۵ میں تحریر ہے کہ اس دائرۂ ظلال سے گزر جانے کے بعد (یعنی سولہویں سبق کو مکمل کرنے کے بعد) اسماء و صفات اور شیون و تنزیہات کا دائرہ ہے کہ اس میں سیر (واقع ہونا) ولایت کبریٰ ہے جو کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی ولایت ہے۔ اولیاء اللہ کو جو ولایت ملتی ہے وہ اسماء و صفات کے ظلال میں ملتی ہے۔ ابھی تک ہم ولایت صغریٰ کی باتیں کر رہے ہیں، ہر کسی کی پہنچ ولایت کبریٰ تک نہیں ہوتی۔

کبوتر کتنا اونچا اُڑتا ہے، چند سو میٹر، اس سے اوپر نہیں جاسکتا، مگر شاہین تیس ہزار میٹر یعنی زمین سے تیس کلو میٹر اوپر اڑ سکتا ہے۔ تو کہاں کبوتر کی پرواز اور کہاں شاہین کی۔ چنانچہ اولیاء اللہ کی پرواز کبوتر کی پرواز کی طرح ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام کی پرواز شاہین کی پرواز کی طرح ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو تو اپنے اسماء وصفات کی سیر کروادی، مگر اپنے محبوب کو جیتے جاگتے عرش پر بلا کر ذات کی سیر کروادی۔

ولایت صغریٰ کا دائرہ ظلال کا دائرہ ہے، ہمارے مشائخ نے جس کو ولایت کبریٰ کہا وہ انبیاء کرام علیہم السلام کی ولایت ہے اور وہ اسماء و صفات میں ہوتی ہے۔ جبکہ اولیاء کرام ظلال کے اندر ہی سیر کرنے والے ہوتے ہیں۔

چنانچہ دفتر دو مکتوب ۳ میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: جو کچھ آفاق و انفس کے آئینوں میں ظاہر ہوتا ہے وہ ظلیت کے داغ سے داغ دار ہے، اس لئے وہ نفی کے لائق ہے، تاکہ اصل ثابت ہو جائے اور جب معاملہ آفاق انفس سے گزر جائے، تو ظلیت کی قید سے رہائی ہو جاتی ہے اور فعل وصفت کی تجلی میں آغاز میسر ہو جاتا ہے۔ تو معلوم ہو گیا کہ اس سے قبل جو بھی تجلی ظاہر ہوتی تھی وہ سیر آفاقی و انفسی میں تھی، اگرچہ اس کو تجلی ذات ہی خیال کریں۔ لیکن اس کا تعلق صفت ظلال سے تھا۔ نہ کہ نفس فعل وصفت سے تو پھر ذات تعالیٰ و تقدس تک کس طرح رسائی ممکن ہو، کیونکہ ظلیت کا دائرہ انفس کی نہایت تک منتہی ہو جاتا ہے، لہٰذا جو کچھ آفاق و انفس میں ظاہر ہوتا ہے وہ اس دائرے میں داخل ہے۔ فعل وصفت بھی اگرچہ حقیقت میں حضرت ذات تعالیٰ و تقدس کے ظلال ہیں لیکن اصل کے دائرے میں داخل ہیں اور اس مرتبہ کی ولایت اصلی ولایت ہے بخلاف

پہلے مرتبہ کی ولایت کے کہ جس کا تعلق آفاق و انفس سے ہے کہ وہ ولایت ظلی ہے۔ تو ولایت صغریٰ، ظلی ولایت ہے، اصل ولایت تو وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے عطا فرمائی۔

یہ بات مسلم ہے کہ نبوت نبی قبل از بعثت عطا فرمائی جاتی ہے جیسے کہ حضور اکرم ﷺ کا فرمانا: **كنتُ نبيًّا و آدمُ بينِ الروحِ و الجسدِ۔** اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نبوت ہر نبی کو وقت ولادت سے عطا کی جاتی ہے اور حال یہ ہے کہ نبوت بغیر ولایت کے نہیں عطا کی جاسکتی، اس لئے کہ ولایت سے قرب الہٰی نصیب ہوتا ہے تو ولی کی ولایت کسبی نہیں ہوتی۔

فرماتے ہیں کہ دائرہ ظل کے منتہی حضرت کو تجلیٔ برقی، جو مرتبہ اصل ہے، پیدا ہوتی ہے، حاصل ہے جو ایک ساعت کے لئے آفاق و انفس کی قید سے آزاد کر دیتی ہے۔

مزید فرماتے ہیں کہ جن اولیاء کرام پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہو جائے اور ان کی فنا کامل ہو جائے، ان کو تھوڑی دیر کے لئے تجلیٔ ذات ملتی ہے، مگر وہ تجلیٔ ذاتی برقی ہوتی ہے، برقی کہتے ہیں کہ جیسے بادل گرجتا ہے تو بجلی میں تھوڑی دیر کے لئے ذات کا دیدار ہوتا ہے پھر اس کے بعد پردے حائل ہو جاتے ہیں۔ تو یہ تجلیٔ ذاتی برقی ہوتی ہے۔ لیکن جو انبیاء علیہم السلام کی ولایت ہے وہ چونکہ اسماء و صفات کے اندر سیر ہوتی ہے ظل میں نہیں ہوتی لہٰذا ان کو تجلیٔ ذاتی دائمی نصیب ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ وہ جماعت، جو آفاق و انفس کے دائرے سے گزر چکی اور ظل کے اصل کے ساتھ پیوست ہو گئی ہے، ان کے حق میں یہ تجلی برقی دائمی ہے کیونکہ ان بزرگوں کا مسکن وماویٰ دائرۂ اصل ہے۔

۱۷)نیت مراقبہ معیت: فیض می آید از ذات بیچون کہ ہمراہ است ہمراہ من و ہمراہ جمیع ممکنات بلکہ ہمراہ ہر ذرّہ از ذرّاتِ ممکنات بہمراہی بیچون بمفہوم ایں آیہ کریمہ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (الحدید ۴) بہ لطائف خمسہ عالم امر من بواسطہ پیران کبار۔ توقف۔۔۔روز

ترجمہ: فیض ذات بیچون سے پیران کبار رحمۃ اللہ تعالیٰ اجمعین کے ذریعے جو میرے ساتھ اور تمام ممکنات بلکہ ممکنات کے ہر ذرے کے ساتھ ہے۔ آیت کریمہ کے اس مفہوم کے ساتھ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ۔ (الحدید ۴) میرے لطائف خمسہ عالم امر پر آتا ہے۔

مراقبہ معیت کے سبق میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ سالک کو اپنی ذات اور کائنات کے ہر ذرے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معیت سمجھ میں آجاتی ہے، اللہ تعالیٰ کی معیت ہر ذرے کے ساتھ کیسے؟ اس کو علماء کرام علمی طور پر جانتے ہیں اور مشائخ اس کو ذوقی انداز سے سمجھتے ہیں، دیکھیں کہ مٹی میں تو اس کی استعداد بھی نہیں کہ وہ ہل سکے، وہ تو بے جان چیز ہے، زمین پر پڑی رہتی ہے لیکن جب ہوا آتی ہے تو اس مٹی کو اڑا دیتی ہے، آندھی بنتی ہے اور وہ آندھی اس کو کتنا اونچا لے جاتی ہے، جب ہوا ذرات کو آندھی کی شکل میں لے کر اڑتی ہے تو ہر ذرے کو ہوا کی معیت حاصل ہوتی ہے، اسی طرح اس کائنات کی ہر چیز کو واجب الوجود کی معیت حاصل ہے۔ چنانچہ ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی تفسیر میں وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (الحدید ۴) کی تفسیر میں حدیث پاک نقل کی ہے کہ ایک صاحب نے نبی ﷺ سے سوال کیا:

وقال رجل یارسول اللہ ﷺ ماتذکیۃ المرء نفسہ؟

یعنی ایک بندہ جب اپنے نفس کا تزکیہ کرتا ہے تو کب تزکیہ ہو جاتا ہے؟

فقال ﷺ یعلم أن اللہ معه حیث کان۔[57]

فرمایا: جب بندہ جان لیتا ہے کہ اللہ ہر وقت اس کے ساتھ ہے تب اس کو تزکیہ نصیب ہو جاتا ہے۔

اب جو لوگ کہتے ہیں کہ تصوف عجمی چیز ہے، تو ان کے پاس کیا دلیل ہے؟ یعنی مراقبۂ معیت تک کی کیفیات کا ثبوت تو حدیث پاک میں موجود ہے، سالک کا یہ مرتبہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ہر وقت یہ محسوس کرے کہ اللہ میرے ساتھ ہے۔ ہمارے مشائخ نے یہ کیفیت اس سبق پر پہنچ کر پائی کہ حدیث مبارکہ کے مطابق اس کیفیت کو پانا کمال ایمان سے ہوا جس کو یہ حاصل نہیں تو وہ بیچارہ اس کے انتظار کا انکار ہی کرے گا۔

اسی آیت کی تفسیر میں ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ:

عن عبادۃ بن الصامت قال قال رسول اللہ ﷺ ان افضل الایمان أن تعلم أن اللہ معک حیث ما کنت۔

"عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ افضل ایمان کی حالت یہ ہے کہ تم جان لو کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے، تم جہاں کہیں بھی ہو"۔

ایک حدیث میں فرمایا کہ یہ تزکیہ نفس کی نشانی ہے، دوسری میں فرمایا کہ افضل ایمان ہے۔

تفسیر ابن عجیبہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں اس آیت کی تفسیر میں ایک واقعہ ذکر کرتے ہیں کہ:

ان الفقیه العلامة سیدی احمد بن مبارک لقی الرجل الصالح السید احمد العقلی، فقال له: کیف تعتقدو ھو معکم این ما کنتم فقال بالذات۔

---

[57] مجمع الزوائد، ج ا، ص ۲۳

”علامہ احمد بن مبارک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک صالح سید شخص احمد عقلی سے ملے تو ان سے پوچھا کہ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (الحدید ۴) کے بارے میں آپ کا کیا عقیدہ ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ رب العزت کے ساتھ یہ معیت مجھے بالذات حاصل ہے“۔

فقال له اشهد انک من العارفين ”تو انہوں نے فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم عارفین میں سے ہو“۔ تو علماء کو تو علمی طور پر معیت معلوم ہوتی ہے لیکن مشائخ اس معیت کو ذوقی طور پر محسوس کرتے ہیں، ہر وقت جیسے کوئی ساتھ ہوتا ہے۔

تم میرے ساتھ ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا!

”اربع انہار“ میں شاہ احمد سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مقام لا الہ الا اللہ کا زبانی ذکر اس طرح ہو کہ سالک کی توجہ قلب کی طرف اور قلب کی توجہ معنیٰ کی رعایت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، یہ نہایت مفید بات ہے، اس مراقبہ میں فیض کا منشاء ولایت صغریٰ کا دائرہ ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ دائرہ ولایت صغریٰ دوسرا دائرہ ہے اور اس کو دائرہ ظل اسماء وصفات بھی کہتے ہیں اس میں تجلیات افعالیہ الٰہیہ میں سیر حاصل ہوتی ہے، نیز اس مراقبہ میں توحید وجودی، ذوق و شوق، گریہ زاری، ہر وقت ذات حق میں استغراق و محویت، اللہ تعالیٰ کی طرف کامل اور توجہ ماسوا کے خیال کا مٹ جانا حاصل ہوتا ہے اور اسی کو فنائے قلبی کہا جاتا ہے۔

حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ”ھدایۃ الطالبین“ میں فرماتے ہیں کہ ولایت صغریٰ میں مراقبہ معیت، جو آیت کریمہ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (الحدید ۴) کا مفہوم کرتے ہیں اور دائرۂ امکان کے سیر کی انتہا یوں معلوم ہو سکتی ہے کہ سالک اگر صاحب کشف ہے تو خود اپنے آپ کی، اپنے کشف کے ذریعے شناخت کر لے گا یا اس کا شیخ صاحب کشف کو متنبہ کر دے گا۔

مزید فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معیت کو اپنے آپ اور اپنے تمام لطائف و عناصر بلکہ ممکنات کے ذرات میں سے ہر ذرہ کے ساتھ ملحوظ رکھنا چاہیئے تا کہ اللہ تعالیٰ کا، بے چوں ادراک کے ساتھ ادراک کیا جائے اور جملہ جہات ستہ کا احاطہ کر لے اور جو توجہ و حضور پیدا ہوا تھا اور اپنا منہ نیستی کی جانب پھیر لے۔

پھر اس معیت کے بھی مراتب ہیں جب حضور ﷺ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرما رہے تھے تو غار ثور میں تشریف فرما ہوئے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ ﷺ کے ساتھ تھے اور کفار مکہ باارادۂ قتل دونوں کے تعاقب میں غار میں پہنچے اور غار کے دھانے سے جھانکنے لگے اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معیت خاصہ باوجود مرتبۂ صدیقیت ہونے کے اس صورت حال کی تاب نہ لا سکے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہو گا؟ سید المرسلین ﷺ نے فرمایا:

لاتحزن ان اللہ معنا (التوبۃ ۴۰)

ترجمہ: اندیشہ نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

تو حضور ﷺ کو جو معیت حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ تھی وہ ایک امتی کو کہاں میسر ہو سکتی ہے۔ اگر چہ صدیقیت، ولایت کا سب سے اعلیٰ مقام ہے۔ مگر رسول اللہ ﷺ کی معیت اور ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ صدیقین کی معیت کا جو انتہائی مقام ہے وہ رسالت کی معیت کا ابتدائی مقام ہے تو معلوم ہوا کہ بحسب مراتب، معیت میں بھی فرق و امتیاز ہے۔

حضرت امام ربانی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ مقام صدیقیت ایک ایسا مقام ہے جس میں شریعت مطہرہ اور علوم و معارف باطنیہ میں ذرہ بھر بھی تضاد یا مخالفت کی مجال نہیں ہوتی اور یہ مقام ولایت کے تمام مقامات سے اونچا ہے۔

چنانچہ آپ رقمطراز ہیں:

"جاننا چاہیئے کہ ولایت، شہادت اور صدیقیت کے مقامات میں سے ہر مقام کے علوم و معارف جُدا جُدا ہیں جو اسی مقام سے مناسبت رکھتے ہیں۔ مرتبۂ ولایت میں علوم زیادہ تر سُکر آمیز ہوتے ہیں کیونکہ اس مرتبے میں سُکر غالب ہے اور صحو (ہوش) مغلوب اور مرتبۂ شہادت میں جو درجات ولایت میں سے دوسرا درجہ ہے سُکر مغلوب ہو جاتا ہے اور صحو غالب آجاتا ہے۔ لیکن سُکر کلیتاً زائل نہیں ہوتا اور درجۂ صدیقیت جو مراتب ولایت میں سے تیسرا مرتبہ ہے اور درجات ولایت کی آخری حد ہے کہ اس کے اوپر ولایت کا کوئی درجہ نہیں ہے بلکہ اس کے اوپر نبوت کا مرتبہ ہے۔ اس درجہ کے علوم سُکر سے بالکل آزاد ہوتے ہیں اور علوم شریعت کے مطابق ہو جاتے ہیں۔ صدیقیت انہی علوم شریعہ کو الہام کے ذریعے سے حاصل کرتا ہے جنہیں کہ نبی کریم ﷺ وحی کے ذریعے سے حاصل فرماتے ہیں۔

صدیق، صدوق سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کا لفظی معنی ہے بہت بڑا سچا۔

عارف باللہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رقم طراز ہیں:

الصدیقون و هم المبالغون فی الصدق۔

یعنی سچائی میں مبالغے کی حد تک پہنچے ہوئے صدیق کہلاتے ہیں۔

تفسیر مدارک میں ہے:

الصادق المستقيم في الأفعال و الصديق المستقيم في الأحوال[58]

یعنی صادق وہ ہے جو اعمال میں راست کردار ہو اور صدیق وہ ہے جو اعمال کے ساتھ ساتھ احوال میں بھی راست اور مستقیم ہو۔

---

[58] مدارک التنزیل و حقائق التأویل، ج ۲، ص ۲۷۱

صوفیائے کرام کے نزدیک صدیقیت ولایت کبریٰ کا ایک اعلیٰ مرتبہ ہے، جس میں ولایت انبیاء عظام علیہم السلام کا فیض آتا ہے۔ اس مرتبے کے معارف انبیاء کرام علیہم السلام کے معارف کے مشابہ ہوتے ہیں اور اس مقام میں کوئی کشف خلاف شریعت رونما نہیں ہوتا۔ آیت کریمہ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَ الصِّدِّيقِينَ (النساء ٦٩) میں مفسرین کرام نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سب سے اعلیٰ ترین مرتبۂ صدیقیت کا وارث قرار دیا ہے۔ اسی طرح آیت مقدسہ وَ الَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِهِ (الزمر ٣٣) میں صَدَّقَ بِهِ کا اولین مصداق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہی قرار دیا ہے۔ آیت کریمہ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ (الحدید ١٩) کی تفسیر میں الصدیقون کے متعلق یوں تصریح فرمائی گئی ہے۔

قال الضحاک هم ثمانیة نفر من هذه الامة سبقوا أهل الأرض فی زمانهم إلی الإسلام أبو بکر و علی و زید و عثمان و طلحة و الزبیر و سعد و حمزة (رضی اللہ تعالیٰ عنهم اجمعین)[59]

ترجمہ: حضرت ضحاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ وہ اس اُمت کے آٹھ افراد ہیں جو اپنے زمانہ میں تمام اہل زمین سے پہلے اسلام لائے اور یہ ابو بکر صدیق، علی، زید، عثمان، طلحہ، زبیر، سعد اور حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ہیں۔

و تاسعهم عمر بن الخطاب الحقه الله بهم لما عرف من صدق نية۔[60]

اور ان کے نویں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے صدق نیت کی وجہ سے ان کے ساتھ لاحق فرمادیا۔

[59] تفسیر مظهری، ج ۱، ص ۳۸۰۲، ناشر: مکتبة رشدیه
[60] تفسیر مظهری، ج ۱، ص ۳۸۰۲، ناشر: مکتبة رشدیه

اس امت کے تمام صدیقین کے سردار حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور اس پر اجماع امت ہو چکا ہے جس کا منکر ضال و مضل اور بے دین ہے۔

تفسیر کبیر میں ہے:

وَلَا شَكَّ أَنَّ رَأْسَ الصِّدِّيقِينَ وَرَئِيسَهُمْ أَبُو بَكْرٍ الصِّدِّيقُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ۔[61]

یعنی اس امر میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ صدیقوں کے سردار اور رئیس ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صدیق ہونے پر متعدد احادیث شاہد ہیں، مثلاً ایک مرتبہ رسول خدا ﷺ ابو بکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اُحد پہاڑ پر تشریف فرما ہوئے تو پہاڑ ہلنے لگا۔ آپ نے فرمایا اثبت أحد فإنما عليک نبي و صديق و شهيدان[62] یعنی اے احد ٹھہر جا، تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں۔

مزید بر آں یہ حدیث تین طریقوں سے مروی ہے۔ ویلمی نے حضرت ام ہانی سے روایت نقل کی ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: یا أبا بکر إن الله سماک الصديق[63] یعنی اے ابو بکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اللہ تعالیٰ نے تیرا نام صدیق رکھا ہے۔[64]

اثرات: اس مرتبے میں فنائے قلبی حاصل ہوتی ہے اور دائرہ امکان کے باقی اثرات کی تکمیل ہوا کرتی ہے، اس مقام میں تجلیٔ افعال الٰہیہ میں سیر واقع ہوتی ہے، توحید وجودی، ذوق و شوق، آہ و نالہ و استغراق و بے خودی و دوام حضور و نسیان ماسواء جس کو فنائے قلب بھی کہتے ہیں حاصل ہو جاتا ہے۔

---

[61] مفاتیح الغیب=التفسیر الکبیر، ج ا، ص ۲۲۱

[62] صحیح بخاری، ج ۳، ص ۱۳۴۴۔ الناشر: دار ابن کثیر، الیمامة - بیروت

[63] مسند الفردوس، ج ۲، ص ۴۵

[64] البینات شرح مکتوبات، ص ۱۸۰

اس مقام میں ذکر تہلیل لسانی توجہ قلبی کے ساتھ کرنا بہت فائدہ بخشتا ہے اور توجہ فوق سے ہٹ کر شش جہات کا احاطہ کر لیتی ہے۔ پس جب لوح دل سے ماسویٰ کا خیال مٹ جائے اور توجہ الی اللہ میں اس قدر محویت و استغراق ہو جائے کہ تکلف سے بھی غیر کا خیال پیدا کرنا دشوار ہو جائے اور تمام دنیوی تعلقات کا رشتہ دل سے ٹوٹ جائے تو فنائے قلبی حاصل ہو جاتی ہے جو کہ ولایت کا پہلا قدم ہے اور باقی کمالات کا حاصل ہونا اس پر موقوف ہے۔

فائدہ: حضرات نقشبندیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا سلوک یہیں تک ہے اس سے آگے کے اسباق بالتفصیل حضرت حق جل مجدہ کی جانب سے حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کو مرحمت ہوئے ہیں جن کی تفصیل آگے درج ہے۔ اس مقام کی تکمیل پر اکثر مشائخ کرام سالک کو طریقہ سکھانے کی اجازت مرحمت فرما دیتے ہیں اور وہ اسی تبلیغ کی ضمن میں باقی سلوک کی تکمیل بھی کرتا رہتا ہے لہٰذا پیر طریقت کو چاہیئے کہ جب تک خود یا وجدان سالک سے اس کے حالات میں تغیر و تبدل، جذب تام اور کمال جمعیت و حضور کو ملاحظہ نہ کرے، ان مقامات کے حاصل ہونے کی نسبت بشارت نہ دے کہ اس سے طریق عالیہ کی بدنامی ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ خدا کی یاد کے سوا سب چیزوں کو بھولنا لطیفۂ قلبی کی فنا ہے اور دوام حضور یعنی اس یاد میں دائمی طور پر ثابت قدم رہنا، کہ کسی وقت بھی غافل نہ ہو، لطیفۂ قلبی کی بقا کہلاتی ہے، اس کو دائرہ ولایت صغریٰ کہتے ہیں اور حصول بقا کے بعد سالک حقیقت میں داخل ہوتا ہے۔

دائرہ امکان میں

دائرہ امکان کے حالات سالک پر ذکر قلبی اور ذکر کثیر میں گزر جاتے ہیں لیکن مجھے اس بات کو بیان کرنا ہے کہ دائرہ امکان اصطلاح حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ میں کیا چیز ہے؟ حضرت

مجدد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک مقام کا دائرہ قرار دیا ہے اور یہ دائرہ امکان سب سے پہلا دائرہ ہے اور یہ طرز اور اصطلاح دائرہ خاص آپ کی ہی قرارداد ہے، دائرہ ہر مقام کے واسطے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دائرہ کا کوئی پہلو کوئی سمت کوئی انتہاء نہیں ہے، اسی طرح قرب حق میں ہر مقام میں کوئی سمت اور کوئی حد نہیں ہے۔ لہذا دائرہ کو مقامات سے نہایت مناسبت ہے۔ علاوہ اس کے مسئلہ ہمہ اوست ہمہ از وست کا فیصلہ بھی اسی دائرہ سے ہوتا ہے کیونکہ دائرہ نقطہ سے بنتا ہے، اور خود بخود وجود دائرہ نہیں ہے، لیکن وجود نقطہ اور وجود دائرہ دونوں الگ الگ ہیں نہ دائرہ کو مرکز سے وصل و حلول واتحاد ہے اور نہ مرکز کو دائرہ سے۔ جب باوجود پیدائش دائرہ کو مرکز سے تعلق اور وصل نہیں ہے تو پھر خدا کا تعلق عین یا اتحاد اور وصل کیسے ہو سکتا ہے۔ میں ان شاء اللہ مختصر حالات دوائر کے لکھوں گا اور تقریر علمی اور وجوہات مفصل سے اوراق نہ بھروں گا کیونکہ عام لوگ نہ پڑھنے والے ایسے ہیں نہ سمجھنے والے، میرا مقصد صرف عام لوگوں کو سمجھانے کا ہے اور جو صاحب ذی علم ہیں ان کے واسطے مکتوبات حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور بہت سی کتابیں موجود ہیں کہ جن میں ہر اجمال کی تفصیل موجود ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق میں تعلق دائرہ امکان کا دس لطائف سے ہے، پانچ عالم امر کے اور پانچ عالم خلق کے۔ عالم امر کے لطائف قلب روح سر خفی اخفی ہیں اور عالم خلق کے لطائف خاک، آب، ہوا، آتش اور نفس ہیں، عرش سے اوپر اصل ہر لطیفہ عالم امر کی ہے اور عرش سے نیچے ہر لطیفہ عالم خلق کی اصل ہے، جس کا دائرہ اس جگہ لکھا جاتا ہے۔

دائرہ امکان

آگاھی: عالم خلق اس کو کہتے ہیں جو بتدریج وقتاً فوقتاً پیدا ہوئے ہیں، عالم امر لفظ کن کے ساتھ ہی پیدا ہوئے ہیں اگر سالک صاحب کشف ہوتا ہے تو تحت الثریٰ سے لے کر بالائے عرش تک اس کو حالات جنت و دوزخ وغیرہ وغیرہ نظر آتے ہیں لیکن فی زمانہ طلبا اہل کشف بہت کم ہوتے ہیں کیونکہ کشف اکل حلال، صدق مقال، کثرت عبادت، قلبِ طعام اور کمی آرام سے حاصل ہوتا ہے۔

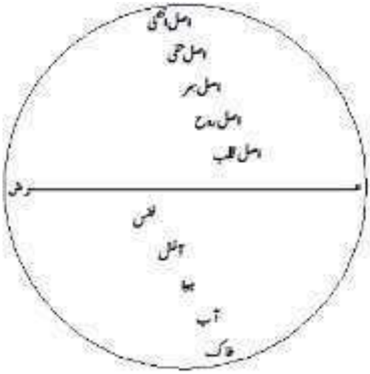

یہ سب باتیں تو کجا، ان میں سے دو ایک پر بھی پوری طور پر عامل نہیں ہوتے، زمانہ ایسے طلباء سے خالی تو نہیں ہے لیکن ہزاروں میں سے پانچ یا دس طالب ایسے نکلتے ہیں کہ جن کو کشف صحیح دیا جاتاہے۔ کشف بہت سے قسم کا ہے، کشف عیانی، کشف حسی، کشف وجدانی، کشف ادراکی، بعض کو کشف قبور بعض کو کشف قلوب بعض کو صرف خواب اور بعض کو یہ سب عنایت کیا جاتا ہے، کشف عیانی، کشف حسی باقی مکشوفات کے مقابلہ میں قوی ہیں اور یہ دونوں کشف صحیح طور پر امام وقت یا قطب مدار یا قطب الاقطاب کو کامل طور پر عنایت کیا جاتا ہے کیونکہ انتظام عالم دنیا اور فیض رسانی عالم کے لئے یہ ذات مبارک مرکز ہوتے ہیں اور ان کی اتباع میں اولیائے خدمت مردان غیب، قطب

ابدال، اوتاد نقیب، نجیب وغیرھم کو بھی کشف دیا جاتا ہے جس کے ذریعے سے یہ صاحب تعمیل احکام الٰہی مثل خضر علیہ السلام کے کرتے ہیں اور یہ اولیائے خدمت پوشیدہ رہتے ہیں، ان سے کوئی واقف نہیں ہوتا، وائے اولیائے خدمت کے لیکن بعض اولیائے عشرت زبردست بھی اولیائے خدمت سے واقف ہوتے ہیں لیکن اس کا اظہار نہیں کر سکتے اور اولیائے عشرت جو قطب ارشاد کے تحت میں ہوتے ہیں ان سے خلق واقف ہو کر فائدہ اٹھاتی ہے۔

فائدہ: قطب مدار ہر زمانہ میں ہر وقت رہتا ہے، گویا عالم کا دارومدار اللہ نے اس پر رکھا ہے اور قطب ارشاد کسی زمانہ میں ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ اور قطب مدار قطب ارشاد کے ماتحت رہتا ہے۔

آگاھی: یہ مقامات قطب، ابدال اور اوتاد وغیرہم کے بلا مقام فنا و بقا کے حاصل نہیں ہوتے اور نہ بلا فنا و بقا کے جماعت اولیاء میں داخل ہوتا ہے، اور شاذ و نادر اس کے خلاف بھی فضل خدا سے کسی کو نصیب ہوتا ہے اور بعض علماء اور اولیاء ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو ان حالات مذکورہ بالا میں سے کچھ نہیں دیا جاتا، ان کو صرف بر و یقین عنایات کیا جاتا ہے یہاں تک کہ بعض کو اپنے ولی ہونے کا بھی علم نہیں ہوتا، قبر میں جا کر معلوم ہو گا۔

آگاھی: کشف کا ہونا ولایت کے لئے ضروری بات یا شرط نہیں ہے۔ کیونکہ کشف دنیا علاوہ مسلمانوں کے غیر مذاہب جوگیہ برہمنان ہند فلاسفر یونان کو بھی ہوتا ہے لیکن جو کشف غیر مذاہب کے لوگوں کو ہوتا ہے وہ صرف کشف اشیاء دنیا کا ہوتا ہے ذات و صفات الٰہی یا عالم ملکوت کا نہیں ہوتا، ذات و صفات الٰہی و عالم ملکوت کا کشف تب تک ہرگز نہیں ہوتا جب تک حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لائے، کمال یقین کا نام ولایت ہے۔ چنانچہ بہت سے اولیاء اللہ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو کشف بالکل نہیں ہوتا لیکن اہل کشف اولیاء سے بدرجہا قرب حق میں ان کا قدم غالب ہوتا

ہے، اسی واسطے حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے دریافت پر شناختِ کمال کی بابت فرمایا: "یقین تر، کامل تر" چنانچہ اکثر حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کشف اور کرامات کا اظہار ثابت نہیں ہے، بعض بعض سے خال خال مکشوف و کرامات کا ظاہر ہونا ثابت ہوا ہے، لیکن ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی جن سے کبھی ادنیٰ سی کرامت کا یا کشف کا اظہار نہیں ہوا ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ، اکمل سے اکمل ولی سے مرتبہ ولایت قرب حق میں اعلیٰ، افضل و برتر ہیں، بلکہ وہ کیا ان کے دیکھنے والے تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی ہر اعلی ولی سے اعلی ہیں، یہ بزرگی ان کی یقین کامل کا سبب ہے جو صحبت اور برکت رسالت مآب صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے حاصل ہوا ہے، بعض اولیاء نہ اہل خدمت ہوتے ہیں، نہ اہل ارشاد، صرف امت کی دعا کے واسطے مختص ہوتے ہیں، اگر کسی کو کشف نہ ہو تو شناخت دائرہ امکان کے طے کر جانے کی یہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین فرماتے ہیں کہ وہ طالب چار گھڑی تک ذکر و فکر خدا میں ایسا مشغول رہتا ہو کہ دنیا کا خیال اس کے دل و دماغ میں بالکل نہ آتا ہو، اور بعضوں نے انوارِ لطائف دیکھنے سے دائرہ امکان کے طے کر جانے کی علامت بیان فرمائی ہے۔

دائرہ ولایت صغریٰ میں

اصطلاح صوفیہ میں اس مقام کو چند ناموں کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، وحدۃ الوجود ہمہ اوست، مقام جمع، کفر طریقت، فنا و بقا، ولایت صغریٰ، اور نسیانِ ماسویٰ اللہ، یہ نام حضرات نقشبندیہ مجددیہ کے قرار دیئے ہوئے ہیں، ان حضرات کی تحقیقات سلوک میں مقام ہمہ اوست سے آگے بہت زیادہ مقامات ترقی کے ہیں اسی واسطے اس ولایت کو ولایت صغریٰ فرماتے ہیں، یعنی چھوٹی ولایت اور دیگر طرق کے کبرائے دین اکثر و بیشتر اس مقام ہمہ اوست کو انتہائی ترقی اور قرب حق فرماتے ہیں اور

نسیان ماسوی اللہ شریعت سے بہت ہی مناسبت رکھتا ہے بموجب ارشاد نبوی ﷺ اکثروا ذکر اللہ حتی یقولوا مجنون (اتنی کثرت سے یاد خدا کرو کہ لوگ تم کو دیوانہ کہنے لگیں)۔

دوسری جگہ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: لن یؤمن احدکم حتی یقال انہ لمجنون (تم میں سے کوئی ایمان والا نہ ہوگا جب تک کہ اس کو یہ نہ کہا جائے کہ وہ دیوانہ ہے) جب کوئی خلق کو محبت و ذکر خدا میں بھول جائے تو دنیادار لوگ اس کو دیوانہ کہیں گے۔ اسی لئے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اس خاص مقام میں بہت بڑا اختلاف اور ردوکد صوفیوں میں صوفیوں سے اور علماء اور صوفیہ میں واقع ہے اور بیسیوں رسالے کتابیں مکتوبات اس کی تائید اور تردید میں بھرے ہیں۔ بہت سے اہل قال نے بلا حال اہل حال اولیاء اللہ کی نقل کر کے اپنے کو جہنمی بنالیا اور بہت سے اہل قال نے اہل حال اولیاء اللہ پر طعن وطنز کر کے اپنے آپ کو خسر الدنیا والآخرۃ کرلیا۔

حضرت مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد | کم کسے باشد زاو آگاہ شد
تمام دنیا اس وجہ سے گمراہ ہوگئی | اس مسئلہ سے بہت کم لوگ واقف ہیں

اس واسطے میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو راہ راست پر چلائے اور اس خاص مسئلہ میں ہم کو حق بیان کرنے اور سمجھنے کی توفیق عنایت فرمائے اور ایسا علم ہمارے سینہ میں ڈالے کہ جس کے بیان اور ادراک میں لغزش نہ ہو اور عند اللہ و عند الرسول ﷺ مقبول ہو (آمین)۔ یہ مقام ہمہ اوست سلطان الاذکار کے انتہا ہونے پر شروع ہوتا ہے۔ بعض مرشد جب اس مقام کا نور سالک میں پاتے ہیں تو کلمہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ اس کو تلقین فرماتے ہیں۔ بعض شیخ جب سالک میں اس مقام کا نور

دیکھتے ہیں تو اس کو مراقبہ تعلیم کرتے ہیں کہ تمام عالم میں سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں، بعض رہنما کچھ تعلیم نہیں کرتے بلکہ اس کو اپنی ہمت باطنی سے اس مقام میں کھینچ لے جاتے ہیں اور خود بخود اس طالب پر یہ حال طاری ہو جاتا ہے لیکن ایسے شیخ بہت کم ہیں، ایسے پیر فی زمانہ زیادہ ہیں کہ طالب کو نہ ذکر قلبی اور نہ سلطان الاذکار حاصل ہوا ہے نہ ہمہ اوست کا نور اس پر وارد ہوا ہے، بلکہ وہ شیخ خود ہی ان باتوں سے ناآشنا ہیں، لیکن طالب کو باوجود ہوش کے اور بلا حال کے ہمہ اوست کا مسئلہ زبانی تلقین کر دیا کرتے ہیں اور ایسا مسئلہ بلا حاصل کے تلقین کرنا شریعت پاک میں "کفر" ہے۔ مسلمان اپنے ایمان کو قوی کرنے کے لئے شیخ کی خدمت میں جاتے ہیں لیکن جاہل شیخ اپنا اور اپنے مرید کا ایمان کھو دیتے ہیں، ایسے شیخ جاہل و نااہل اس مصرعہ کے مصداق ہیں:

"او خویشتن گم است کرا رہبری کند"

وہ خود گم ہیں تو کس کی رہبری کریں گے؟

بعض لوگ تو مرید سے یہ بھی کہہ دیا کرتے ہیں کہ میں اور تو اور جو کچھ تو دیکھ رہا ہے یہ سب عین خدا ہے نعوذ باللہ منہا اللہ تعالیٰ ہمیں اور ایسے لوگوں کو صراط مستقیم عنایت فرمائے۔

طالب حق جب خدا کی یاد کثرت سے کرتا ہے تو اس کے لطائف اور جسم پاک صاف ہوتے ہیں اور وہ حسب حیثیت عروج کرتا ہے یہاں تک کہ اپنی اصل سے اس کو وصل ہو جاتا ہے۔ اصل اس کی کیا ہے؟ حقیقت ممکنہ ہے۔

سوال: حقیقت ممکنہ کیا ہے؟

جواب: جس جگہ انوارِ اسماء و صفات الٰہی نے جمع ہو کر عدم محض کی طرف عکس ڈال کر وجودِ مستعار بخشا ہے، مثلاً آئینہ کو بالکل اس میں کوئی چیز نہیں ہوتی، اس کو عدم خیال کیا جائے اور جو وجود

اس آئینہ کے سامنے آئے اس کو انوار اسماء وصفات خیال کیا جائے اور جو عکس آئینہ میں قائم ہو اس کو حقیقت ممکنہ خیال کیا جائے لیکن وہ معاملہ حقیقت ممکنہ کا کہیں بالا تر اور عقل معاش کی فہمید سے دور ہے کیونکہ اس کا خالق قادرِ کل بیچون وبیچگون ہے، جب رب العالمین نے چاہا کہ اپنی ذات کی معرفت عطا کروں اور عالم کو پیدا کروں تو پرکارِ قدرت اسماء وصفات سے نقطہ حقیقت محمدی ﷺ قائم فرما کے اس سے تمام اشیاء کا دائرہ وجود کھینچ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ تمام مخلوق کے باعث تخلیق ہیں اور جس طرح دائرہ مرکز سے الحاق نہیں کر سکتا، اسی طرح کوئی مخلوق میں سے نبی کریم ﷺ کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا، اسی مطلب میں حدیث شریف میں وارد ہوا ہے **لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل** (مجھ اللہ پاک عزوجل کے ساتھ وہ وقت حاصل ہے کہ جس میں نہ کوئی مقرب فرشتہ میری برابری کر سکتا ہے اور نہ کوئی پیغمبر برگزیدہ) چونکہ طالب خدا عدم کی طرف پشت اور اسماء وصفات الٰہی کی طرف منہ کرکے تقرب الی اللہ چاہتا ہے اس کو اصطلاح صوفیہ میں **سیر الی اللہ** کہتے ہیں، بموجب حدیث شریف **کل شیئٍ یرجع الی اصلہ** (ہر چیز اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے) اور اسی حدیث کا ترجمہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش　　　　باز جوید روزگار وصل خویش

جو کوئی اپنی اصل و حقیقت سے دور رہا

ایک عرصہ تک وہ اس سے طالبِ وصل رہا اور ڈھونڈھتا رہا

اور حدیث شریف میں وارد ہوا ہے، **حب الوطن شعبۃ من الایمان** (وطن کی محبت شعبہ ایمان سے ہے) وطن حقیقتاً ہر مومن کا حقیقت ممکنہ ہے، جہاں روحوں کا قیام اور اسماء وصفات الٰہی کے انوار کا ظہور ہے۔ لہٰذا ہر ایمان دار اپنی حقیقت کی طرف رجوع کرتا ہے اور چونکہ حقیقت ممکنہ میں تمام

مخلوق کی حقیقت اور نقشہ اجمالاً ہوتا ہے، کفر اور اسلام، مسجد اور مندر خوب وزشت سب ایک جگہ نظر آتے ہیں، جیسے کہ تخم درخت میں سب درخت کی حقیقت جڑ شاخیں پتے پھول اور پھل اجمالاً اس میں ہوتی ہے اور تفصیل اس کی بعد درخت کامل ہو جانے کی معلوم ہوتی ہے اسی طرح حقیقت ممکنہ میں اسماء وصفات کا انوار ہادی و مضل، رحمن، قہار، جبار، شافی وغیرہم اور عدم محض سب یکجا ہوتے ہیں تو سالک اپنے علم کے مطابق ہمہ اوست **انا الحق سبحانی و ما اعظم شانی** وغیرہ الفاظ بحالت بے خودی کہہ اٹھتا ہے، چونکہ عدم کی طرف اس کی پشت ہوتی ہے اور انوارِ اسماء وصفات الٰہی کی طرف منہ ہوتا ہے پس سامنے جو دیکھتا ہے کہتا ہے:

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

قلندر جو کچھ کہتا ہے دیکھا ہوا کہتا ہے

وہ اس وقت مرفوع القلم ہوتا ہے لیکن یہ حال ہمیشہ نہیں رہتا ہے۔ دریا کی سی موجیں آیا کرتی ہیں جب اور جس وقت اصل سے وصل ہوتا ہے اپنے کو اور تمام جہان کو نیست ونابود پا کر وجود حقیقی کو اپنے علم میں جان کر ہمہ اوست وغیرہ کہہ بیٹھتا ہے۔ حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کے حال کی توضیح حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت میں خوب فرمائی ہے جس سے ہر ذی علم خوب سمجھ جائے گا۔

با مریدان آن فقیر محتشم   بایزید آمد کہ یزدان نک منم

مریدوں کے پاس اس بزرگ درویش

بایزید نے آکر کہا کہ میں خدا ہوں

گفت مستانہ عیان آن ذوفنون   **لا الہ الا انا فاعبدون**

اس مست نے یہ صاف کہا کہ

میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس میری پرستش کرو

چوں گذشت آں حال گفتند ش صباح | تو چنیں گفتی و ایں نبود صلاح

جب یہ حال گزر گیا تو ان سے صبح کہا گیا | کہ آپ نے ایسا کہا اور یہ صحیح نہیں ہے

تو حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا:

حق منزہ از تن و من باتنم | چوں چنیں گویم بباید کشتنم

اللہ تعالیٰ جسم وغیرہ سے پاک ہے اور میں جسم رکھتا ہوں

جس وقت میں ایسا کہوں تو مجھے مار ڈالنا چاہیئے

چوں ہمائے بے خودی پرواز کرد | آں سخن را بایزید آغاز کرد

جب بے خودی کا ہما اڑنے لگا | تو پھر بایزیدؒ نے وہی کہنا شروع کیا

عقل را سیل تحیر در ربود | زاں قوی تر گفت کاول گفتہ بود

تحیر کا دریا عقل کو بہا کر لے گیا

اور پہلے سے بھی زیادہ زور دے کر وہی الفاظ ادا کئے

نیست اندر جبہ ام الا خدا | چند جوئی در زمین و در سماء

کہ میرے لباس میں خدا ہے

تم زمین و آسمان میں کب تک جستجو کرو گے

حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے خود یہ فیصلہ فرمادیا ہے، جیسا کہ حالت ہوش میں حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

اے بروں از وہم و قال و قیل من　　　　خاک بر فرق من و تمثیل من

اے خدا تیری ذات میرے قیاس و گفتگو سے باہر ہے
میرے اور میری تمثیلات پر خاک پڑے

پس اس حکایت سے صاف معلوم ہو گیا کہ وقت غلبہ محبت کہ جس کو حالت عشق کہتے ہیں عقل بجا نہیں رہتی اور دریا تحیر کے تمیز و عقل کو بہالے جاتا ہے اور اس وقت یہ کہہ دینا کچھ بعید از عقل نہیں کیونکہ جب مجنوں سے کوئی پوچھتا کہ تو کون ہے تو مجنوں جواب میں کہتا انا لیلیٰ (میں لیلیٰ ہوں) تو جب بندہ کی محبت میں بندہ اپنے آپ کو بھول گیا تو کوئی خدا کی محبت میں اپنے کو بھول جائے اور خدا کہنے لگے تو یہ کیا تعجب کی بات ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

از محبت خشتہا زریں شود　　　　از محبت تلخ ہا شیریں شود

محبت سے مٹی کی اینٹ سونا بن جاتی ہے　　　　محبت میں کڑوی چیز میٹھی ہو جاتی ہے

از محبت سرکہ ہا مے می شود　　　　از محبت خارہا گل می شود

محبت سے سرکہ شراب بن جاتا ہے
محبت سے کانٹا پھول بن جاتا ہے

از محبت نار نورے می شود　　　　از محبت دیو حورے می شود

محبت سے آگ نور بن جاتی ہے
محبت سے بد شکل خوبصورت بن جاتا ہے

اور جب ہوش آتا ہے تو سالک اپنے کو اور تمام خلق کو موجود پاتا ہے اور خالق و مخلوق میں تمیز کرتا ہے، یہ حالات کسی کو لحظہ، کسی کو گھنٹہ، کسی کو دنوں، کسی کو برسوں رہتے ہیں اور اکثر حضرات متقدمین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اس حال میں برسوں اور بعض عمر بھر رہے ہیں اوراس مقامِ خاص کے وہ ذات مبارک مرکز ہوئے ہیں اور ان کی نگاہ علم میں گویا غیریت اٹھ گئی تھی اور اسی مقام میں خرق عادات، کشف، کرامات کثرت سے ظاہر ہوتی ہیں، اسی مقام میں صاحب کشف کو اپنے سینہ میں تمام جہاں کی حقیقت نظر آتی ہے اسی واسطے خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، اولیاء بعد فنا وبقا ہر چہ می بینند در خود می بینند، و ہر چہ می شناسند در خود می شناسند و حیرت ایشاں در وجود ایشاں، وفی انفسکم افلاتبصرون (اور تمہارے نفس میں ہے پس کیا تم نہیں دیکھتے) اور حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

انچہ حق است اقرب از حبل الورید　　　　تو فگندی تیر فکرت رابعید

جو حق ہے وہ شاہ رگ سے بھی قریب ہے

اور تو اپنی فکر کے تیر کو دور گراتا ہے

یہ کلام حضرت خواجہ بزرگوار رحمۃ اللہ علیہ کا اس حدیث قدسی سے تعلق رکھتا ہے جس کا ترجمہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

گفت پیغمبر کہ حق فرمود است　　　　من نگنجم در سر بالا وپست

نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اللہ تعالی فرماتا ہے

میں نشیب و فراز میں نہیں سما سکتا

من نہ گنجم در زمین وآسمان　　　　من بگنجم در قلوب مومنان

اور نہ میں زمین و آسمان میں سما سکتا ہوں

بلکہ میں سچے مومن کے دل میں سماجاتا ہوں

جب خدا کی سمائی قلب مومن میں ہو جائے تو تمام مخلوق کا قلب مومن میں نظر آنا کیا بعید ہے لیکن یہ تقرب بیچونیت کے ساتھ ہے، نہ کسی احاطہ ظرف کے ساتھ۔ جیسے سمائی آسمان کی آنکھ کی پتلی میں، نہ آسمان آنکھ میں گھس گیا نہ آنکھ آسمان میں، بلکہ یہی سمائی محبت ہے، جیسے کہ دوسری حدیث قدسی میں وارد ہوا ہے **بی یسمع و بی یبصر الی اخرہ** اگر حقیقتاً سماعت و بصارت وغیرہ بشر کی عین خدا کی سماعت و بصارت ہو جاتی تو پھر اس کو فنا نہیں ہونا چاہیئے تھا، حالانکہ خود ذات ہی ولی کی فانی ہے تو پھر بقا و صفات کہاں؟ یہ آیت قرآنی اور آحادیث قدسی اسی طرح پر ہیں کہ جس طرح حدیث شریف میں ارشاد ہے **یا علی لحمک لحمی و دمک دمی** (اے علی تمہارا گوشت میرا گوشت ہے اور تمہارا خون میرا خون ہے)۔ اگر حدیث شریف کے معنی حقیقتاً مان لئے جائیں تو پھر بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہما سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح نہیں ہو سکتا تھا، ان آیات بینات **اذ رمیت الخ و فی انفسکم افلاتبصرون، و احادیث بی یسمع الخ لا یسعنی ارضی و لا سمائی و لکن یسعنی قلب عبدی المومن** اور **یا علی لحمک لحمی و دمک دمی** سے مراد اظہار عنایت و کرم ہے بمقابلہ اور مخلوق کے اور ساتھ ہی اس کے ظلی اور صفاتی طور پر تقرب بھی ہے۔

جب اللہ تعالیٰ اپنے کو ہر الفاظ تعریفیہ سے بلند تر فرماتا ہے **سبحانہ و تعالیٰ عما یصفون** اور یہ بھی ارشاد فرماتا ہے **لا تدرکہ الابصار** (کسی کی نگاہ اس کا ادراک نہیں کر سکتیں) تو پھر جسم خاکی اور فانی اس سے کیسے تقرب حقہ جسمانی کے ساتھ کر سکتا ہے، بموجب ارشاد **و نحن اقرب الیہ من حبل الورید** (ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں) کی طرح ہر تقرب حق قابل ایمان و حالت علم منقول سے تعلق رکھتی ہے اور اسی طرح قلب حق اور نزول تجلی ذات خانہ کعبہ سے بیچون و بیچگونیت

کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور نہ کوئی خلق ذات حق کو تو کجا اس کی ایک رسم وصفت کا احاطہ اور وصل نہیں کر سکتی، کیونکہ حق جل وعلا اور اس کی جملہ صفات قدیم ہیں اور جمیع حوادث سے منزہ اور مبرا ہیں۔ اور جمیع مخلوقات حادث، پس حادث اور قدیم ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، لیکن نزول تجلی خانہ کعبہ میں اور نزول قلب انسان میں فرق ہے، خانہ کعبہ پر تجلی کا نزول ہر وقت رہتا ہے اور اولیاء پر بوجہ غفلت یا معصیت کبھی تجلی کا ظہور بند ہو جاتا ہے اور کبھی زیادہ کم ہوتا رہتا ہے اور اس حالت کو اصطلاح صوفیہ میں قبض وبسط کہتے ہیں، ان حالات کا تعلق علم معقول اور علم معاش میں سے نہیں ہے بلکہ علم منقول اور عقل معاد سے ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

علم معقولات علم اشقیاء علم منقولات علم انبیاء

علم معقول اشقیا کا علم ہے اور علم منقول انبیا علیہم السلام کا ہے

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

کم عقلوں سے دلیل لانے والوں کی مثال لکڑی کی ہے

اور لکڑی کے پاؤں ناپائیدار ہوتے ہیں

گر بہ استدلال کار دیں بدے فخر رازی رازدار دیں بدے

اگر استدلال پر ہی مذہب اسلام کا دارومدار ہوتا تو

امام فخر الدین رازیؒ جو علم معقول کے امام ہیں، مذہب کے بھی امام ہوتے

سالک کثرت محبت الٰہی میں اپنے کو اور تمام خلق کو بھول جاتا ہے اور غیریت اس کی نگاہ علم میں اٹھ کر صرف ایک ذات واجب الوجود کی طرف باقی رہتی ہے اور وہ اپنے کو اور تمام مخلوق کو عین خدا سمجھتا ہے اور بیساختہ اس کی زبان سے لفظ انانیت کے نکلتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ بھی بموجب حدیث

قدسی **اناعندظن عبدی بی**، ایسے لوگوں سے ان کے خیال کے مطابق ویسا ہی پیش آتا ہے، اور جو کچھ وہ زبان سے کہہ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے ویسا ہی کر دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرات متقدمین میں سے خرق عادات کثرت سے ظہور میں آئی ہیں، اسی واسطے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

آں دعا شیخ نے چوں ہر دعاست　　　　فانی است گفتہ گفت خداست

بندہ خاص کی دعا اوروں کی طرح نہیں ہوتی

جو محبت خدا میں فنا ہے، تو اس کا قول خدا کا قول ہے

اولیاء راہست قدرت ازالہ　　　　تیر جستہ باز گرداند زراہ

اولیاء کو خدا نے ایسی قدرت عطا فرمائی ہے

کہ کمان سے نکلا ہوا تیر واپس لوٹا لیتے ہیں

اکمہ وابرص چہ باشد مردہ نیز　　　　زندہ گردد از فسون آں عزیز

مادر زاد اندھا اور کوڑھی تو کیا مردہ بھی

ان کے دم کرنے سے زندہ ہو جاتا ہے

اسی مقام کو اصطلاح صوفیہ میں مقام فنا و بقا کہتے ہیں، فنا اس حالت کو کہتے ہیں کہ جب سالک کی نگاہ سے غیریت اٹھ کر سوائے ذات باری تعالیٰ کے کچھ باقی نہ رہے، اور بقا اس حال کو کہتے ہیں کہ اس حال فنا سے اس کو افاقہ ہو اور خالق و مخلوق، حادث و قدیم میں تمیز کرے، سالک کو پہلے فنائے فعلی پھر فنائے صفاتی، پھر فنائے ذاتی ہوتی ہے، یعنی اپنے افعال کو فعل خدا میں، اور پھر اپنی صفات کو صفات خدا میں اور پھر اپنی ذات کو ذات خدا میں فنا پاتا ہے اور یہ بات کثرت ذکر اور خاصان خدا کی صحبت سے

نصیب ہوتی ہے اور بموجب حدیث شریف اللہ تعالیٰ ایسے بندۂ خاص کے افعال کو اپنی طرف منسوب فرماتا ہے:

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ و ما یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتیٰ احببتہ فاذا احببتہ فکنت سمعہ الذی یسمع بہ و بصرہ الذی یبصر بہ و یدہ التی یبطش بھا و رجلہ التی یمشی بھا و ان سالنی لاعطینہ و لان استعاذنی لاعیذنہ۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا بندہ نوافل کے ذریعہ سے ہمیشہ مجھ سے قرب ڈھونڈھتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی وہ سماعت بن جاتا ہوں جس سے کہ وہ سنتا ہے اور وہ بینائی بن جاتا ہوں جس سے کہ وہ دیکھتا ہے اور وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے کہ وہ پکڑتا ہے اور وہ پاؤں بن جاتا ہوں جس سے کہ وہ چلتا ہے، اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اس کو دیتا ہوں، اگر وہ مجھ سے پناہ مانگتا ہے تو میں اس کو پناہ دیتا ہوں۔

اور اس حدیث شریف کی تصدیق اور تائید میں آیت شریف وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللهَ رَمَى (الانفال ۱۷) ارشاد رب العباد ہے، اور دوسری جگہ ہے إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ (الفتح ۱۰) (بے شک اے نبی جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں، یقیناً اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے) اسی مطلب میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اللہ اللہ کن کہ اللہ می شود　　　　این سخن حق ست باللہ می شود

اللہ اللہ کر کہ تو ”اللہ“ ہو جائے

یہ بات بالکل سچ ہے قسم خدا کی تو ضرور ہو جائیگا

یہ حالت فناوبقادریا کی موجوں کی طرح سالک پر وارد ہوتی رہتی ہیں۔

چنانچہ مولانارومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام　　　ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام

میں نے سات سو ستر قالب دیکھے ہیں

اور سبزہ کی طرح کئی بار اگا ہوں

حضرت ابو مدین مغربی رحمۃ اللہ علیہ اس معنی میں فرماتے ہیں:

کشتگان خنجر تسلیم را　　　ہر زمان از غیب جان دیگر است

خنجر تسلیم سے مرے ہوئے لوگوں کیلئے

ہر زماں میں غیب سے دوسری جان ودیعت ہوتی ہے

اسی مفہوم میں مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ہر کس بمیرد ایک بار　　　بیچارہ جامی بارہا

ہر شخص ایک مرتبہ مرتا ہے　　　(لیکن) بیچارہ جامی بار بار

اور اسی مقصد میں حضرت مرزا مظہر جانجاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

بعضے از دولتمندان از ہر بار گفتن آن فنائے خاص

در خود می فہمند و در ہر نفس چندیں بار می میرند

بعض بزرگ عرفان ذکر اللہ سے اپنے میں ایک فنائے خاص سمجھتے ہیں

اور ہر سانس میں کئی بار مرتے ہیں

دمے صد بار در یاد تو میرم　　　بایں بے طاقتی نام تو گیرم

ایک دم میں تیری یاد میں سو مرتبہ مرتا ہوں
اور باوجود بے طاقتی کے تیرا ذکر کرتا ہوں

یہ فنا بحکم **موتوا قبل ان تموتوا** (اپنے مرنے سے پہلے مر جاؤ) سالک پر گزرتی ہے اور یہ حالت طاری ہوتی ہے بموجب جملہ اولیٰ اس حدیث شریف کے **ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک** (یہ کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر تو اس کو نہیں دیکھ رہا ہے تو تحقیق وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ پس جس وقت آئینہ دل پر شعاعیں انوار اسماء وصفات الہٰی کی پڑتی ہیں جیسے کہ آئینہ میں شعاعیں آفتاب کی پڑتی ہیں تو جس طرح شعاع نور آفتاب میں آدمی کو اپنا وجود اور وجود آئینہ دونوں نظر نہیں آتے، اسی طرح شعشان انوار اسماء وصفات میں اپنا وجود اور وجود خلق سالک کو نظر نہیں آتا، یا جیسے چراغ کی روشنی دھوپ میں نظر نہیں آتی حالانکہ روشنی موجود ہوتی ہے یا جیسے صفراوی بخار والے کو میٹھا بھی کڑوا معلوم ہوتا ہے حالانکہ مٹھائی میں کڑواہٹ نہیں ہے یا جیسے دریا کی ریت میں ذرات چمکتے ہیں، ذرات موجود ہوتے ہیں مگر چمک میں وجود ذرہ نہیں دکھتا یا جیسے کسی کو مرض پیلیا ہو جاتا ہے تو اس مریض کو تمام جہاں پیلا ہی پیلا نظر آتا ہے حالانکہ جہان پیلا نہیں ہے یا جیسے کہ ضعف زیادہ ہو جاتا ہے تو وقت کھڑے ہونے کے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے، حالانکہ جہاں روشن ہے، یہ اس کی ضعف اور علم کا قصور ہے، اسی طرح بیماری محبت الہٰی میں سالک مجبور و معذور ہے کہ اس کی نگاہ علم و محبت میں تمام جہاں میں سوائے خدا کے کچھ نظر نہیں آتا اور اسی مقام میں سالک پر ذوق و شوق گریہ وزاری، آہ و نعرہ، بے ہوشی و مدہوشی۔

اسی مقام میں دردِ محبت ہوتا ہے کہ جس درد کی آرزو حضرت فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کرتے ہیں:

کفر کافر را ودیں دیندار را　　　ذرہ درد دل عطار را

کفر کافر کیلئے اور دین دیندار کے لئے　　　عطار کیلئے دردِ دل کا ایک ذرہ کافی ہے

یہ فنا و بقا جسمانی فنا و بقا نہیں ہے بلکہ سالک کے لطائف اور علم کی فنا و بقا ہے اور تمثیل اس فنا و بقا کی اچھی طرح یو سمجھ میں آجائے گی کہ کسی مقام پر دس دس پانچ پانچ گز کے فاصلہ سے یکے بعد دیگرے شب کو چراغ رکھ دیئے جائیں اور چراغ اول کو پس پشت کرکے آدمی کھڑا ہو جائے تو اس کا سایہ اس کے سامنے دکھائی دے گا اور جب اس چراغ اول کے پاس سے دوسرے چراغ کی طرف جوں جوں بڑھے گا اسی قدر سایہ اس کا سامنے والا کم ہوتا جائے گا، حتی کہ چراغ دوم کے قریب پہنچنے پر سامنے کا سایہ بالکل کالعدم ہو جائے گا اور دوسرے سامنے کے چراغ کی روشنی کے سبب سے اس کا سایہ پس پشت آجائے گا اسی طرح جب چراغ دویم سے آگے بڑھ کر چراغ سویم کی طرف چلے گا تو پھر اس کا سایہ فوراً اس کے سامنے آجائے گا۔ علی ھذ القیاس ہر چراغ کے قرب اور بعد میں اس کے سایہ کو فنا اور بقا ہوتی رہے گی، حالانکہ اس کے سایہ کو حقیقتاً فنا نہیں ہے بلکہ نور چراغ کی قوت نے اس کے علم میں اس کے سایہ کو ایسا معدوم کر دیا کہ اس کو نظر ہی نہیں آتا، اگر سامنے کا قریب چراغ گل کر دیا جائے جس کی روشنی نے اس کے سایہ کو پیچھے کر دیا ہے تو پچھلے چراغ کی روشنی اس کے سایہ کو فورا! اس کے سامنے قائم کر دے گی، اسی طرح ہر مقام انوار صفات الٰہی میں جب سالک ترقی کرتا ہے تو اس کو اسی طرح تمام جہان کی فنا و بقا دکھتی ہے حقیقتاً اس کی اور تمام جہان کی فنا و بقا نہیں ہوتی، سالک کا ہر مقام میں وجود موجود رہتا ہے لیکن اس کے علم میں نظر نہیں آتا۔

چنانچہ حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

چوں زبانہ شمع پیش آفتاب

نیست باشد ہست باشد در حساب

اگرچہ چراغ کی لو آفتاب کے سامنے معدوم ہوجاتی ہے، حالانکہ وہ حقیقتاً موجود ہوتی ہے

ہست باشد ذات او تا تو اگر بر نہی پنبہ بسوزد آں شرر

وہ تو موجود ہوتی ہے، چنانچہ اگر تم اس کی لو پر روئی رکھو، تو وہ جل جائے گی

نیست باشد روشنی ندہد ترا کردہ باشد آفتاب او را فنا

وہ چراغ معدوم معلوم ہوتا ہے اور روشنی بھی نہیں دے رہا ہے

لیکن یہ سب کچھ آفتاب کی وجہ سے ہے کہ اس نے چراغ کو ماند کردیا

اور اسی واسطے حضرت فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

سیہ روئی ز ممکن در دو عالم جدا ہر گز نہ شد واللہ اعلم

بشریت کی سیاہی دونوں جہاں میں

ہر گز جدا نہیں ہوسکتی آگے خدا جانے

نمی بینی کہ شاہے چوں پیمبر نیافت او فقر کل تو رنج کم بر

تو نہیں دیکھتا کہ خاتم النبیین صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جیسے پیغمبر

بشر سے خدا نہ بن سکے تو اے طالب تو کیسے خدا بن سکتا ہے

غیر مذاہب کا ان بزرگوں کے الفاظ سے استنباط مسئلہ نتائج و آواگون کرنا بالکل غلط اور سراسر کج فہمی ہے، یہ مقام نہایت عشق کا شدید ہوتا ہے اور بلا عشق شدید کے نفس ملعون کی سرکوبی اور

خباثت نفس اور کبر و عجب و ریا و حقد و حسد سے دل پاک نہیں ہوتا، اور اتباع سنت نبوی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اور تعمیل ارشاد الٰہی الا للّٰہ الدّین الخالص (آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے لئے خالص دین ہے) نہیں ہوتی۔

ہر کرا جامہ از عشقش چاک شد | او ز حرص و بغض کلی پاک شد

جس کسی کا خدا کے عشق سے کپڑا چاک ہوا | وہ حرص اور بغض وغیرہ سے حقیقتاً پاک ہوا

اور بلا عبور کئے ہوئے اس مقام فنا و بقا کے جناب باری کی درگاہ میں گزر نہیں ہوتا، چنانچہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ہیچ کس را تا نہ گردد او فنا | نیست رہ در بارگاہ کبریا

جب تک کسی کو یہ فنا حاصل نہ ہو | اس کو درگاہ الٰہی کا راستہ نہیں مل سکتا

اور حسین منصور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

کفرت بدین اللّٰہ و الکفر واجب | لدی و عند المسلمین قبیح

میں نے اللہ کے دین میں کفر کیا ہے اور یہ کفر واجب ہے
اور عام مسلمانوں کے نزدیک یہ ناپسندیدہ ہے

اس حال "ہمہ اوست" کو اصطلاح صوفیہ میں "کفر طریقت" بھی کہتے ہیں اور کفر طریقت یہ ہے کہ امتیاز اٹھ جائے اور بجز ذاتِ حق کوئی نظر میں نہ رہے، اور جب تک یہ حال طالب پر طاری نہ ہو گا فیضانِ الٰہی اخذ کرنے کے لائق بھی نہیں ہو سکتا اور نہ دوسروں کو اپنی ہمت باطن سے فیض پہنچا سکتا ہے۔ لہٰذا یہی عشق شدید عالم غیب سے فیض لینے اور خلق میں فیض پہنچانے کا ذریعہ ہے، اور اسی حال کے گزر جانے کے بعد تمام سلاسل صوفیہ میں وہ شخص اولیاء میں شمار کیا جاتا ہے اور اسی حال کے گزر جانے کے بعد قطب ابدال، اوتاد، نقیب، نجیب، قطب مدار، قطب ارشاد اور اجازت سلسلہ بیعت کے لائق ہو جاتا ہے، اور اسی فنا کے بعد قبور اولیاء سے فیض اخذ کرنے کے لائق ہوتا ہے، اور

اسی فنا کے بعد الحب للہ و البغض للہ پر عمل کرنے کے لائق ہوتا ہے، اور اسی مقام میں کشف اور خرق عادات کثرت سے ظاہر ہوتی ہیں، اسی مقام میں مقام جہان کا نقشی سینہ میں نظر آتا ہے، اسی مقام میں بوقت غلبہ حال اگر مردہ سے وہ کہے کہ زندہ شو تو وہ زندہ ہو جائے، اگر زندہ سے کہے کہ مردہ شو، تو وہ فوراً مر جائے، اسی مقام میں فی انفسکم افلا تبصرون معلوم ہوتی ہے۔ اسی مقام میں تمام زمین و آسمان کی حقیقت وسعت قلب کے مقابلہ میں نقطہ کے مانند معلوم ہوتی ہے۔ کثرت حال میں یہ بندہ خاص اپنے کو بندہ جانتا، بلکہ اپنے علم میں دوئی اٹھ کر ایک ہی جانتا ہے تو خداوند تعالیٰ بھی اس کے گمان کے موافق اس سے پیش آتا ہے اور اس بندۂ خاص کی دعا کو رد نہیں کرتا، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے کہ بعض میرے امتی پریشان حال اور غریب ہوں گے اور لوگوں میں ان کی وقعت نہ ہوگی مگر خدا کے نزدیک وہ مرتبہ والے ہوں گے اور وہ جو قسم کھا بیٹھیں گے خدا ویسا ہی کرے گا اور دوسری حدیث شریف انا عند ظن عبدی بی یعنی جو بندہ مجھ سے جیسا گمان رکھے گا میں اس کے گمان کے موافق اس سے پیش آؤں گا اور پیش آتا ہے۔

اطلاع: بعض اولیاء اللہ اکمل اپنے بعض طلبہ کو بطور طفرہ کے مقام ہمہ اوست کو درمیان میں چھوڑ کر ولایت کبریٰ میں لے جاتے ہیں، (طفرہ کے معنیٰ لغت میں یہ ہیں کہ درمیانی مقام کو چھوڑ کر اوپر کود کر چلے جانا) جیسے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نان بائی کو مقام ہمہ اوست کو چھوڑ کر ایک توجہ میں مقامات عالیہ میں کھینچ کر لے گئے، حضرت مرزا مظہر جانجاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے بعض طلبہ کو اسی طرح لے گئے ہیں اور اولیاء اکمل بھی۔

اطلاع: بعض اولیاء اس راہ سلسلہ طریقت سے علاوہ صرف اتباع سنت اور کثرت عبادت اور خلوص اور مجاہدہ سے بھی خدا تک پہنچتے ہیں اور بعض پیدائشی ولی ہوتے ہیں ان کو اجتبائے صرف میں

حصہ دیا جاتا ہے، بلا تعلیم، بلا عمل، بلا صحبت خود بخود ان کی روح میں کشش ربانی ہوتی ہے اور وہ خدا تک پہنچتے ہیں اور اکثر وہ مجذوب ہوتے ہیں لیکن دونوں قسم کے اولیاء شاذ و نادر ہوتے ہیں، ولایت کا راستہ شاہراہ عام میں سلسلہ طریقتِ صوفیہ ہے۔

۱۸)نیت مراقبہ اقربیت: فیض می آید از ذات بیچون کہ اصل اسماء و صفات است کہ نزدیک تر است از من بہ من و از رگِ گردن من بمن بہ نزدیکی بلا کیف بمفہوم ایں آیہ کریمہ وَنَحنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (ق ١٦) بہ لطیفہ نفسی من با شرکت لطائف خمسہ عالم امر من بواسطہ پیران کبار رحمہم اللہ تعالیٰ۔

توقف۔۔۔۔روز

ترجمہ: ذات حق تعالیٰ جو کہ اصل اسماء و صفات ہے، بموجب آیۃ کریمہ وَنَحنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ(ق ١٦) (ہم اس کی شہ رگ سے بھی قریب ترین ہیں) مجھ سے میرے زیادہ نزدیک ہے اور میری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ اور یہ نزدیکی بلا کیف ہے، اس ذات سے پیران اکابر کے توسل سے میرے لطائف خمسہ عالم امر اور لطیفۂ نفسی میں فیض آرہا ہے۔(توقف)

تشریح: دوسرا دائرہ جو کہ ولایت صغریٰ کا ہے، کے قطع کرنے کے بعد تیسرا دائرہ رونما ہوتا ہے اور اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ یہ تیسرا دائرہ ولایت کبریٰ کا ہے جو حقیقت میں انبیاء علیہم السلام کی ولایت ہے اور ان کی تبعیت میں اور وراثت کے طور پر بعض اولیاء کرام کو بھی نصیب ہوتی ہے۔

یہ تیسرا دائرہ دراصل تین دائروں اور قوس پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلے دائرے کا نچلا نصف اسماء و صفات زائدہ پر مشتمل ہے اور اوپر والا نصف شیونات ذاتیہ کو متضمن ہے۔ لطائف عالم امر کے عروج کی انتہا اس دائرہ اسماء و شیونات کی نہایت تک ہے۔

اس دائرے میں مراقبۂ اقربیت کیا جاتا ہے اور اس مراقبہ میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اقربیت کا فیض میرے لطیفۂ نفسی اور خمسہ لطائف عالم امر میں آرہا ہے۔ اس ذات اقدس کی طرف سے جو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور ولایت کبریٰ کے دائرہ اولیٰ کا منشاء ہے اور یہاں ہی توحید شہودی منکشف ہوتی ہے۔ اس میں نفی واثبات کے ورد کی کثرت بہت مفید اور ترقی کا باعث ہے۔

۱۹) نیت مراقبہ محبت اول: فیض می آید از ذات بیچون کہ اصل اصل اسماء و صفات است کہ دوست میدارد مرا و من دوست میدارم او را مفہوم ایں آیہ کریمہ یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (المائدۃ ۵۴) خاص بہ لطیفہ نفسی من بواسطہ پیران کبار۔

توقف۔۔۔۔روز

ترجمہ: ذات حق تعالیٰ جو کہ اصل اصل اسماء وصفات ہے جو کہ بمطابق اس آیت کریمہ یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (المائدۃ ۵۴) (مجھے دوست رکھتی ہے اور میں اسے دوست رکھتا ہوں) سے بالخصوص میرے لطیفۂ نفسی میں فیض آرہا ہے۔ بواسطۂ پیران کبار کے (توقف)

تشریح: تیسرے دائرے ولایت کبریٰ کا دوسرا دائرہ ہے جو کہ پہلے دائرہ اسماء وصفات وشیونات کے دائرے سے فوق ہے اور شیونات کے اصول پر مشتمل ہے۔ اس دائرے میں مراقبۂ محبت کیا جاتا ہے اور اس میں تصور کیا جاتا ہے کہ مقام فیض لطیفۂ نفسی ہے۔

۲۰) نیت مراقبہ محبت دوم: فیض می آید از ذات بیچون کہ اصل اصل اصل اسماء و صفات است کہ دوست میدارد مرا و من دوست میدارم او را بمفہوم ایں آیہ کریمہ یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (المائدۃ ۵۴) خاص بہ لطیفہ نفسی من بواسطہ پیران کبار رحمہم اللہ تعالیٰ۔ توقف۔۔۔۔روز

ترجمہ:اس ذات بیچوں سے فیض آرہاہے کہ اسماء وصفات کی اصل اصل اصل ہے جو کہ اس آیت کریمہ کے مطابق یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ(المائدة ۵۴) (مجھے دوست رکھتی ہے اور میں اسے دوست رکھتا ہوں)اور جو کہ ولایت کبریٰ کے تیسرے دائرے کا منشاء ہے،بواسطہ ٔمشائخ عظام کے۔ (توقف)

تشریح:یہ دائرہ ولایت کبریٰ کا تیسرا دائرہ ہے جو کہ اصل اصل اصل اسماء وصفات کے اصول پر مشتمل ہے۔ اس دائرے میں بھی مراقبہ ٔمحبت کیا جاتا ہے اور اس میں تصور کیا جاتا ہے کہ بالخصوص میرے لطیفہ ٔنفسی میں فیض آرہاہے۔

۲۱) نیت مراقبہ دائرہ قوسی: فیض می آید از ذات بیچون کہ اصل اصل اصل اصل اسماء و صفات است و دائرہ قوسیست کہ دوست میدارد مرا و من دوست میدارم اورا بمفہوم ایں آیہ کریمہ یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ(المائدة ۵۴) خاص بہ لطیفہ نفسی من بواسطہ پیران کبار۔ (توقف۔۔۔۔روز)

ترجمہ: اس ذات حق تعالیٰ بیچوں سے فیض آرہاہے جو کہ دائرہ نمبر تین کی اصل ہے جو مجھے دوست رکھتی ہے اور میں اسے دوست رکھتا ہوں اور ولایت کبریٰ کے فیض کے منشاء کی قوس ہے اور خاص میرے لطیفہ ٔنفسی میں بواسطہ مشائخ عظام فیض آرہا ہے آیت مذکورہ بالا کے بموجب۔ (توقف)

تشریح: ولایت کبریٰ کے تین دائروں کے اوپر قوس کا سالک مشاہدہ کرتا ہے جو کہ اسماء وصفات کے دائرہ کی نمبر ۴یعنی چوتھے درجے پر اصل ہے۔

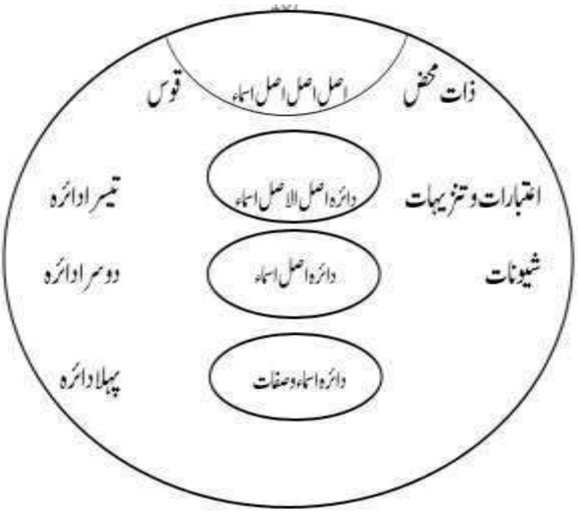

عالم صغیر کی اصل عالم کبیر، اس دائرہ اصل الاصل اسماء کی اصل ظلال اور ظلال کی اصل اسماء و صفات واجبہ اوران کی اصل شیونات اور شیونات کی اصل اعتبارات اور ان کی اصل ذات شکل و دوائرہ ولایت کبریٰ۔

پہلے دائرے میں ذات بمع صفات ثمانیہ ثبوتیہ کا مشاہدہ ہوتا ہے اور وہ صفات بھی آپس میں ایک دوسرے سے ممتاز نظر آتی ہیں۔ دوسرے میں ذات میں شیونات کا ملاحظہ ہوتا ہے اور شیونات بھی ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے ہیں۔

تیسرے دائرے میں اعتبارات و تنزیہات کے ساتھ ذات ہوتی ہے جو کہ ایک دوسرے سے ممتاز نہیں ہوتے اور قوس میں صفات، شیونات، اعتبارات میں سے کسی کا ملاحظہ نہیں ہوتا بلکہ محض ذات بحث ہوتی ہے۔

نیز دائرہ میں دو قوس ہوتے ہیں، قوس ذات محض، قوس محض، قوس صفات یا شیونات یا اعتبارات چونکہ اعتبارات سے فوق کوئی اضافت یا اعتبار نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ ضعف دائرے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور اسے صرف قوس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دائرہ محبت اول و دوم اور قوس میں تہلیل (نفی و اثبات) اور قرآن مجید کی تلاوت زیادہ مفید اور باعث ترقی ہوتی ہے۔ ان میں سالک کو کمال فنا حاصل ہوتا ہے۔ حقیقی اسلام، شرح صدر، عالم کے وجود کا ظل ہونا اور ذات باری تعالیٰ کے وجود کے تابع ہونا (توحید شہودی) پایا جاتا ہے۔ نیز اخلاق رذیلہ کا فنا ہونا اور اخلاق حسنہ سے مستخلق ہونا میسر آتا ہے۔ ان تجلیات کے حاصل ہونے سے اسماء و صفات کا ظلال، اسمائی و صفاتی تجلیات اور اسم ظاہر کی سیر مکمل ہوتی ہے۔

۲۲) نیت مراقبہ اسم ظاہر: فیض می آید از ذات بیچون کہ مسمی باسمِ ظاھر است بمفہوم ایں آیہ کریمہ هُوَ الْأَوَّلُ وَ الْآخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (الحدید ۳) خاص بہ لطیفہ نفسی من بواسطہ پیران کبار۔ **توقف۔۔۔۔روز**

ترجمہ: ذات حق تعالیٰ بے چوں جو کہ اسم ظاہر کے ساتھ موسوم ہے۔ اس آیت کریمہ هُوَ الْأَوَّلُ وَ الْآخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (الحدید ۳) (وہی اول و آخر، ظاہر و باطن ہے اور وہی ہر شے کو جاننے والا ہے) سے مشائخ عظام کے وسیلہ سے میرے لطیفہ نفسی پر خصوصی طور پر فیض آرہا ہے۔ (توقف)

تشریح: اگرچہ ولایت کبریٰ کے تین دائروں اور قوس سے تزکیۂ نفس حاصل ہو جاتا ہے اور بری عادات، اچھے خصائل میں تبدیل ہو جاتی ہیں لیکن فخر و غرور اور رعونت ابھی باقی ہے۔ ان کو دور کرنے کے لئے سالک کو اسم ظاہر کا مراقبہ ضروری ہے تاکہ سیر آفاقی پایۂ تکمیل تک پہنچ سکے۔

تشریح: ولایت کبریٰ کا تعلق اسم "الظاھر" سے ہے، اسم "الظاھر" اللہ تعالیٰ کا ایک مبارک اسم ہے اور کائنات میں چیزوں کا ظہور اسی اسم "الظاھر" کی برکت سے ہے، اس مبارک نام کی وجہ سے ہر چیز ظاہر ہے، چنانچہ ولایت صغریٰ اور ولایت کبریٰ اسم "الظاھر" کے دائرے ہیں، اس لئے اس کے بعد اسم "الظاھر" مراقبہ کیا جاتا ہے۔

مکتوبات معصومیہ دفتر اول مکتوب ۴۷ میں حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ جاننا چاہیئے کہ اسم "الظاھر" کے ظلال میں وصول اور اس کے مراتب میں سیر کو ولایت صغریٰ سے تعبیر کرتے ہیں، جو کہ اولیاءاللہ کی ولایت ہے اور اسماء و صفات کے اصول میں سیر ولایت کبریٰ کے ساتھ وابستہ ہے جو کہ انبیاء علیہم السلام کی ولایت ہے اور یہ دونوں ولایتیں اسم "الظاھر" سے تعلق رکھتی ہیں، اس اسم "الظاھر" میں مراقبہ کرنے کے بعد اس کے نیچے ولایت صغریٰ اور کبریٰ کی ساری کیفیتیں، جیسے شرح صدر، قضا و قدر پہ یقین وغیرہ سب تام اور کامل ہو جاتے ہیں اور "أنا" ختم ہو جاتی ہے، اس کے بعد اسم "الباطن" کا مراقبہ کیا جاتا ہے۔

اسم "الظاھر" جلال و جمال کا مظہر

امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ کائنات اللہ رب العزت کے اسم "الظاھر" کا مظہر ہے، جتنی چیزوں کا ظہور ہے یہ اس اسم کی جلوہ گریاں ہیں۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے اپنے جمال کو دکھانے کے لئے ایسی چیزوں کو پیدا کیا جو بندے کو بہت اچھی لگتی ہیں، کھانے پینے کی چیزیں، پھل اور میوے ہیں، پھول ہیں، انسان کی رغبت ہوتی ہے کہ ان چیزوں سے لطف اندوز ہو، تو فرماتے ہیں کہ جس طرح باقی چیزوں میں اللہ رب العزت نے رغبت

رکھی ہے، سب سے کامل رغبت اللہ تعالیٰ نے مرد کے لئے عورت میں رکھی ہے، چنانچہ عورت کے اوپر اسم "الظاھر" کی تجلی پڑتی ہے اور مرد بے اختیار ہو کر اس سے محبت کرتا ہے۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مکتوبات، دفتر اول میں لکھتے ہیں کہ راہ سلوک طے کرنے کے دوران حق سبحانہ و تعالیٰ اس خادم پر اسم "الظاھر" کی تجلی کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ظاہر ہوا، خاص طور پر عورتوں کے لباس میں، بلکہ اس کے اعضاء میں جدا جدا ظاہر ہوا، اور اس میں میں گروہ عورتوں کا اس قدر مطیع و فرمانبردار ہوا کہ کیا عرض کروں، اور میں اس اطاعت اور فرمانبرداری میں بے اختیار تھا۔ اسم "الظاھر" کی تجلی کا جو ظہور کہ اس لباس یعنی مستورات میں ہو، ایسا اور کسی جگہ میں نہیں ہوا، جس قدر عمدہ و پاکیزہ خصوصیات اور عجیب و غریب خوبیاں اس لباس میں ظاہر ہوئیں، اتنی کسی اور مظہر میں ظاہر نہیں ہوئیں، میں ان کے سامنے پگھل کر پانی پانی ہو جاتا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے معاشرہ قائم کرنے کے لئے مردوں کے دل میں عورتوں کی فطری محبت پیدا کر دی ہے، مگر یہ بھی کہہ دیا کہ دیکھو اگر تم پر سکون زندگی گزارنا چاہتے ہو تو نکاح کے ذریعے ایک دوسرے کی محبتوں پر زندگی گزارو، دنیا میں بھی اجر پاؤ گے اور آخرت میں بھی جنتیں پاؤ گے۔

پھر آگے فرماتے ہیں: اور اسی طرح اسم "الظاھر" کی تجلی کا ظہور پھر کھانے پینے میں اور پہننے کی چیزوں میں الگ الگ ہوا جو عمدگی اور خوبی لذیذ اور پر تکلف کھانے پینے میں تھی وہ کسی کھانے میں نہ تھی اور میٹھے پانی میں بھی دوسرے (کھارے) پانی کے مقابلہ میں یہی فرق تھا بلکہ ہر لذیذ و شیریں چیز میں خصوصیات کمال میں سے اپنے درجے کے مطابق الگ الگ ایک خصوصیت تھی، یہ خادم

اس تجلی کی خصوصیت کو بذریعۂ تحریر عرض نہیں کر سکتا۔ اگر آنجناب کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوتا تو شاید عرض کر سکتا لیکن ان تجلیات کی جلوہ گری کے زمانے میں یہ خادم رفیق اعلیٰ یعنی محبوب حقیقی حق تعالیٰ جل شانہ کی آرزو رکھتا تھا اور حتیٰ الامکان ان ظہورات کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا لیکن چونکہ مغلوب الحال تھا اس لئے اس تجلی کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔

حضرت سید زوار حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مکتوبات مجددیہ کے ترجمہ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

یہ جو بعض عارفوں نے کہا ہے **من عرف اللہ طال لسانہ، ترجمہ:** "جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا اس کی زبان دراز ہو گئی"۔ یہ معرفت اسم **"الظاھر"** کے معارف سے وابستہ ہے۔

اثرات: اس مراقبہ میں زیادہ فیض لطیفۂ نفس پر وارد ہوتا ہے، اس میں انوار سفید مائل بہ سبزی معلوم ہوتے ہیں، ایک قسم کی خنکی و آرام اور استغراق کامل کے ساتھ اسرار و مظاہر وارد ہوتے ہیں۔ ولایت کبریٰ کی نسبت باطن میں فراخی و قوت پیدا ہوتی ہے اور اسی طرح اوپر کے دائرے میں نیچے والی نسبت کی تقویت اور تکمیل ہوتی رہتی ہے۔ ولایت کبری محاذات و مقابل میں دائرۂ سیف قاطع ہے، جب سالک اس دائرہ میں قدم رکھتا ہے تو وہ اپنی ہستی کو کاٹنے والی تلوار کی مانند کاٹ ڈالتا ہے اور اس کا نام و نشان نہیں چھوڑتا۔ یہ دائرہ داخل سلوک نہیں بعض کو پیش آتا ہے اور بعض کو نہیں۔ ولایت کبریٰ کے دائروں اور مراقبہ **اسم "الظاھر"** میں تہلیل لسانی معنی کا خیال رکھتے ہوئے بطریق مذکور کرنا بہت فائدہ دیتا ہے۔ ولایت کبریٰ کی تکمیل یعنی مراقبہ **اسم "الظاھر"** کے بعد ملائکہ عظام کے مبادی تعینات میں سیر واقع ہوتی ہے جو ولیات عُلیا کہلاتی ہے اور اس سیر کو اسم **"الباطن"** کی سیر کہتے ہیں، اس کے مراقبہ کا طریقہ یہ ہے:

۲۳) نیت مراقبہ اسم باطن: فیض می آید از ذات بیچون کہ مسمی باسمِ باطن است کہ منشاء ولایت علیا است کہ ولایت ملاء الاعلیٰ است بمفہوم ایں آیہ کریمہ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (الحدید ۳) بعناصر ثلٰثہ من کہ آب و باد و نار است بواسطہ پیران کبار رحمہم اللہ تعالیٰ۔ توقف۔۔۔۔روز

ترجمہ: ذات حق تعالیٰ بے چوں جو کہ اسم باطن سے موسوم ہے کہ ولایت علیا کی منشا ہے۔ اس آیت کریمہ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (الحدید ۳) سے بزرگان دین کے توسل سے میرے تین عناصر (پانی، آگ اور ہوا) میں فیض آرہا ہے۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے مکتوبات کے دفتر اول مکتوب ۲۶۰ میں تحریر فرماتے ہیں: جب اس فقیر کی سیر یہاں تک ہو چکی تو وہم و خیال میں آیا کہ سب کام مکمل ہو چکا ہے، اتنے میں عالم غیب سے ندا آئی کہ یہ سب کچھ اسم "الظاہر" کی تفصیل تھی جو کہ پرواز کے لئے ایک بازو ہے اور اسم "الباطن" کی سیر ابھی باقی ہے جو کہ عالم قدس کی طرف پرواز کرنے کے لئے دوسرا بازو ہے اور جب تو اس کو بھی مکمل طور پر انجام دے دے گا تو اس وقت تجھے پرواز کے لئے دو بازو عطا ہوں گے اور جب اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اسم "الباطن" کی سیر بھی انجام پا چکی تو دو بازو عطا ہوں گے۔

مکتوبات معصومیہ دفتر اول مکتوب ۴۷ میں تحریر فرماتے ہیں: اور اس اسم یعنی اسم "الظاہر" سے گزرنے کے بعد اسم "الباطن" سے، جو کہ ملاء اعلیٰ فرشتوں کی ولایت ہے اور اسم "الظاہر" اور اسم "الباطن" کا فرق حضرت قطب المحققین قدس اللہ سبحانہ سرہ العزیز کے مکتوب قدسی آیات میں مذکور ہے، وہ یہ ہے کہ اسم "الظاہر" ایک اسم ہے کہ جس میں ذات بالکل ملحوظ

نہیں ہے اور اسم "الباطن" میں اسم کے پردہ میں ذات ملحوظ ہے۔ اسم "الظاھر" اور اسم "الباطن" میں نہایت باریک فرق ہے جس کا سمجھانا بھی ایک مشکل کام ہے، بلکہ حضرت امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مکتوبات مجددیہ دفتر اول مکتوب ۲۶۰ میں تحریر فرماتے ہیں کہ اسم "الباطن" کی سیر کی نسبت کیا لکھا جائے، اس سیر کا حال استتار اور یقین در پردہ رہنے ہی کے مناسب ہے، البتہ اس مقام کے متعلق صرف اس قدر بیان کیا جاتا ہے کہ اسم "الظاھر" کی سیر صفات میں ہے بغیر اس بات کہ اس کے ضمن میں ذات تعالیٰ و تقدس ملحوظ ہو اور اسم "الباطن" کی سیر بھی اگرچہ اسماء میں ہے لیکن اس کے ضمن میں ذات باری تعالیٰ ملحوظ ہے، اور یہ اسماء پرندوں کی مانند ہیں جو حضرت ذات تعالیٰ و تقدس کے حجابات ہیں۔ اسم "الظاھر" میں ذات بالکل ملحوظ نہیں ہوتی اور اسم "الباطن" میں اسم کے پردے میں ذات ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کو آسان لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ اسم "الظاھر" میں سیر "علم" میں سیر ہوتی ہے، اور اسم "الباطن" میں سیر اسم "علیم" میں ہوتی ہے۔

اس بات کو سمجھانے کے بعد حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ باقی تمام اسماء و صفات کا حال بھی اس قیاس پر کریں، یہ اسماء جو اسم "الباطن" سے تعلق رکھتے ہیں، ملائکہ ملاء اعلیٰ کے کے تعینات کے مبادی ہیں اور ان اسماء میں سیر کا آغاز کرنا ولایت علیا میں قدم رکھنا ہے جو کہ ملاء اعلیٰ کی ولایت ہے اگرچہ اسم "الظاھر" اور اسم "الباطن" کے درمیان فرق بہت باریک ہے اسم "الظاھر" و اسم "الباطن" کے بیان میں جو علم و علیم کے درمیان فرق ظاہر کیا گیا ہے، اس فرق کو چھوٹا نہیں سمجھنا چاہیئے، اور یہ نہ کہو کہ علم سے علیم تک بہت کم راستہ ہے بلکہ یہ فرق ایسا ہے جیسا کہ مرکز زمین سے عرش کے درمیان تک۔ نیز اس فرق کی نسبت ایسی ہے جیسے قطرے

کا دریائے محیط سے نسبت کا فرق ہے۔ کہنے کو تو یہ نزدیک ہے لیکن حاصل ہونے میں بہت دور ہے اور ان مقامات کا ذکر جو اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے وہ بھی اسی کی قسم ہے۔

مکتوبات دفتر اول مکتوب ۴۷ میں بھی خواجہ معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ اسم "الباطن" سے گزرنے کے بعد عروج کی جانب میں انبیاء و مرسلین علیٰ نبینا و علیھم الصلوات والتسلیمات کے فرق مراتب کے مطابق کمالات نبوت پیش آتے ہیں اور ان کمالات کا حاصل ہونا اصالۃً تو انبیاء علیھم الصلوٰۃ والسلام کے لئے ہے اور تبعیت و وراثت کے طور پر جسے چاہے نوازے۔

سبحان اللہ! فرماتے ہیں کہ عام بندے کی پرواز بس اسم "الظاھر" اور اسم "الباطن" تک ہوتی ہے، اس سے اوپر انبیاء علیھم السلام کے کمالات ہیں لیکن نبی علیہ السلام نے امت کے لئے دعائیں کی ہیں لہٰذا جو نبی علیہ السلام کی کامل اتباع کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ۳۱)

ترجمہ: "آپ فرما دیجئے! اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگے گا"۔

پھر محبوبوں کو بہت ساری باتوں میں رعایت دے دیتے ہیں، جب محبت ہوتی ہے تو سارے قانون ایک طرف رہ جاتے ہیں اس اتباع کی کمال کی وجہ سے، پھر اس سالک کو بسا اوقات اس لئے اوپر کے مقامات کی بھی سیر کروا دیتا ہے، تو فرماتے ہیں کہ انبیاء علیھم السلام کے مقامات کی سیر کرنے کے بعد کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ میں اس درجہ میں پہنچ گیا، اس کی مثال یوں ہے کہ ایک غلام کو بادشاہ نے اپنا تخت صاف کرنے کے لئے دربار میں بلایا، اب تھوڑی دیر میں تو اس کو سارے دربار کی سیر نصیب ہوئی حتیٰ کہ تخت بھی اس نے صاف کیا۔ لیکن جب واپس ہوا تو اس کا درجہ وہاں کا تھا جہاں سے

چلا تھا اس لئے اولیاء کو انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ان مدارج و مقامات کی سیر تو کرائی جاتی ہے مگر ہوتے تو وہ غلام ہی ہیں، اس لئے انہیں اپنے مقام میں واپس آنا ہی ہے۔ پس اپنی اوقات کو ہرگز نہیں بھولنا چاہیئے۔

اسم "الظاھر" اور اسم "الباطن" دو پر ہیں، جو پرواز میں مدد دیتے ہیں۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مکتوبات مجددیہ دفتر اول مکتوب ۲۶۰ میں فرمایا ہے کہ: جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عنایت سے اسم "الباطن" کی سیر بھی انجام کو پہنچ چکی تو دو پر میسر ہو گئے۔

ذرا غور کیجیئے! کہ اسم "الظاھر" سلوک ولایت صغریٰ اور ولایت کبریٰ تھا، ایک پر ہے اور اسم "الباطن" جو فرشتوں کا سلوک ہے دوسرا پر ہے، جب یہ دونوں پر مل جاتے ہیں تو پرندہ پرواز کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور یہ پرواز اس کی کمالات نبوت و کمالات رسالت میں ہوتی ہے۔

فرشتوں کے سلام

"ھدایۃ الطالبین" میں حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ولایت علیا مغز اور ولایت کبریٰ چھلکے کی مانند ہے بلکہ ہر دائرہ تحتانی بھی دائرہ فوقانی کی نسبت یہی مناسبت رکھتا ہے۔ ولایت کبریٰ چھلکا اور ولایت علیا (یعنی فرشتوں کی ولایت) مغز کی مانند ہے۔

مکتوبات معصومیہ دفتر اول مکتوب ۱۸۳ میں فرماتے ہیں کہ ملاء اعلیٰ (فرشتوں) کی ولایت جو کہ اسم "الباطن" کی سیر پر نصیب ہوتی ہے، خواص بشر کی ولایت کے اوپر ہے اور (حالانکہ) ملائکہ کے حقائق سے عروج کے اعتبارات سے خواص بشر کو فضیلت ہے اور ملائکہ کو اپنے حقائق سے عروج نہیں ہے اور نیز عالم امر عالم خلق سے اوپر ہے اور فضیلت عام خلق ہی کو ہے، کیونکہ عالم خلق کا قرب اصلی ہے اور عالم امر کا ظلی ہے۔ عنصر خاک عالم خلق و عالم امر کے لطائف میں سب سے پست ہے اور

اس کی پستی اس کی بلندی کی وجہ بنائی گئی ہے اور جو قرب کہ خاکیوں کو حاصل ہے وہ مقدسیوں (ملائکہ) کو نہیں ہے۔

عام دستور کے مطابق ولایت ملاء اعلیٰ جس کو ولایت علیا بھی کہتے ہیں، ولایت انبیاء سے اوپر ہے۔ اس کو ایسے بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ اسے ولایت انبیاء علیہم السلام پر فوقیت حاصل ہے لیکن افضل نہیں۔ بلاشبہ بعض امور میں فروتے فوقیت رکھتے ہیں لیکن کثرت ثواب کے لحاظ سے بشر کو فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو ولایت علیا سے بھی ترقی عطاء فرماتا ہے، لہٰذا بشر کو ان مقامات سے اوپر بھی ترقی مل سکتی ہے، دلیل یہ ہے کہ فرشتوں کی ولایت کا مقام متعین ہے۔ وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَعْلُومٌ (الصفٰت ۱۶۴) ”اور ہم میں ہر ایک کا ایک متعین درجہ ہے“۔

تو ان کی ولایت ایک درجہ کی ولایت ہے، اس سے اوپر ان کی ترقی نہیں ہے، ارتقاء کا مادہ اللہ تعالیٰ نے خاک میں رکھا ہے۔ جس بشر کو اللہ تعالیٰ نفس مطمئنہ دے دیتا ہے اور شریعت کی غلامی عطا کر دیتا ہے، شرح صدر نصیب فرما دیتا ہے تو نبی ﷺ کی اتباع کی برکت سے وہ فرشتوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کا فرشتوں کو دکھانا ہے کہ بشر ایسے بھی ہوتے ہیں۔

قربان جائیں ہم اپنے آقا اور سردار ﷺ کے، کہ وہ امت کے لئے اللہ پاک سے کیا کیا نعمتیں لے کر آئے، یہ پرواز ان کی غلامی کے صدقہ میں ملتی ہے۔ سبحان اللہ! شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

مقام شوق تیرے قدسیوں کے بس میں نہیں　　انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں بلند

خواجہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

زمین زادہ برآسمان تاختہ　　زمین وزماں را پس انداختہ

ترجمہ: ”زمین زادہ یعنی انسان (جس سے مراد سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں) آسمان پر تشریف لے گیا اور زمین و زمان کو پیچھے چھوڑ گیا“۔

مکتوبات معصومیہ دفتر اول مکتوب ۱۳۷ میں حضرت خواجہ معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

العمدۃ فی حصول الولایتین الأخریین الذکر اللسانی بالنفی والاثبات۔

یعنی ”آخری دونوں ولایتوں (ولایت کبریٰ وعلیا) کے حاصل کرنے میں نفی اثبات کا زبان کے ساتھ ذکر کرنا (تہلیل لسانی) فائدہ مند ہے“۔

پہلی ولایت ولایت صغریٰ تھی، ولایت علیا اور ولایت کبریٰ آخری دو ولایتیں ہیں، ان دونوں ولایتوں کے حصول کے لئے بہترین معاون چیز تہلیل لسانی ہے۔

فرشتوں کی ولایت

”ھدایۃ الطالبین“ میں حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اس دائرے میں مورد فیض ان تین عناصر (آب، آتش، باد) کی ولایت ہے، اس میں تہلیل لسانی (کلمہ توحید کا زبان سے ذکر کرنا) اور طویل قیام و قراءت والے نفلوں سے ترقی ہوتی ہے۔ چنانچہ فیض تعین عناصر پر آتا ہے یعنی آگ، پانی اور ہوا۔ اسم ”الباطن“ میں فیض عنصر خاک پہ نہیں آتا۔ عنصر خاک کو اس میں سے نکال دیتے ہیں۔ چونکہ فرشتوں کی ولایت ہے اور جب اسم ”الباطن“ کی سیر مکمل ہو جاتی ہے اور کمالات نبوت کا مقام آجاتا ہے تو پھر عنصر خاک کا کام شروع ہوتا ہے۔

حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ اس مقام میں بھی شریعت کی رخصت پر عمل کرنا ٹھیک نہیں ہے بلکہ عزیمت پر عمل کرنے سے ترقی نصیب ہوتی ہے، چنانچہ

ولایت کبریٰ سے اوپر کے اسباق میں شرعی رخصت بھی اختیار نہ کرو، عزیمت پر ہی عمل کرنا ان میں ترقی کا باعث بنتا ہے۔ اللہ اکبر کبیراً! اس کا راز یہ ہے کہ رخصت پر عمل کرنے سے آدمی بشریت کی طرف کھینچ دیا جاتا ہے اور عزیمت پر عمل کرنے سے ملکیت سے مناسبت پیدا ہو جاتی ہے تو اس ولایت میں جس قدر عزیمت پر عمل ہو گا اس قدر اس ولایت میں جلد ترقی نصیب ہو گی۔

حضرت شاہ غلام مجدد دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ "مقاماتِ مظہری" میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس ولایت سے اوپر ملائکہ کی ولایت ہے جسے **"ولایت علیا"** کہتے ہیں، یہاں کمالات **ھو الباطن** کی سیر ہوتی ہے۔ اس ولایت کو حاصل کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ تجلّیٰ ذات کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے، اس سے بلند تر نبوت اور رسالت کے کمالات ہیں۔ **سبحان اللہ!**

اس کا فائدہ یہ ہے کہ ولایت علیا حاصل ہونے کے بعد اب سالک کے اندر تجلیات ذات کو برداشت کرنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے اس کا حاصل کرنا ضروری ہے۔

اسم "الباطن" کے اسرار اظہار قابل نہیں

حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اس ولایت میں جو اسرار معلوم ہوتے ہیں وہ توحید وجودی اور توحید شہودی کی طرح نہیں ہیں کہ بیان میں آ سکیں، بلکہ یہ اسرار پوشیدہ رکھنے کے ہی زیادہ لائق ہیں اور کسی طرح بھی اظہار کے قابل نہیں۔ آگے فرماتے ہیں کہ بالفرض کسی راز کے اظہار کا قصد کیا بھی جائے تو وہ الفاظ کہاں سے لائے جائیں جن میں یہ اسرار بیان کئے جا سکیں۔

اور ان اسرار کا معلوم کرنا، بغیر اس شیخ کی توجہ کے ناممکن ہے البتہ جس نے اس ولایت میں کمال انصاف پیدا کیا ہو اور ان اسرار کے فیض یاب ہو چکا ہو تو میں صرف اس قدر ظاہر کر دیتا ہوں کہ اس منزل میں سالک کا باطن **اسم "الباطن"** کا مصداق و مظہر بن جاتا ہے (سمجھنے والے سمجھ گئے) اور

اس ولایت کے سالک کے تمام بدن میں وسعت و فراخی پیدا ہو جاتی ہے اور لطیفے کی کیفیت تمام جسم میں ہوتی ہے۔

حضرت سید زوار حسین شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مکتوبات مجددیہ کے ترجمہ کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ جو بعض عارفوں نے فرمایا ہے: **من عرف کل لسانہ۔** "جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا اس کی زبان گونگی ہو گئی" یہ معرفت **اسم "الباطن"** کی معرفت سے وابستہ ہے۔

ولایت صغریٰ و کبریٰ وعلیا کے اسباق کے بعد کمالات نبوت کا سبق آتا ہے، کمالات نبوت کے اس سبق کے بارے میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ **مکتوبات دفتر اول مکتوب ۲۶۰** میں تحریر فرماتے ہیں: "اور اس سیر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام ولایتوں کے کمالات، خواہ وہ ولایت صغریٰ ہو یا ولایت کبریٰ یا ولایت علیا، سب کے سب مقام نبوت کے کمالات کے ظلال ہیں اور وہ تمام خاص ان کمالات کی حقیقت کے لئے مثال کی طرح ہیں اور یہ روشن ہو جاتا ہے کہ اس سیر کے ضمن میں ایک نقطے کا قطع کرنا مقام ولایت کے تمام کمالات کو طے کرنے سے زیادہ (یعنی افضل ہے) یعنی پچھلے سارے کمالات ایک طرف اور اس سے آگے ایک نقطہ کو طے کر لیا تو اس کی فضیلت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اللہ رب العزت خیر کا معاملہ فرمائے، ہم عاجز مسکینوں کو اللہ تعالیٰ نفس مطمئنہ عطا فرمائے، ہمیں معصیت کی ذلت سے نکال کر اپنی عبدیت کا مقام عطا فرمائے اور اپنے فرمانبردار بندوں میں شامل فرمائے، آمین۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں کہ بندہ کو جس قسم کی حاجت ہو اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے کوئی نام منتخب کرے اور اس نام کا کثرت سے ورد رکھے تو اس سے بہت جلد کامیابی ہو گی (ان شاء اللہ) مثلاً تنگدستی میں "یا مغنی" کا ورد رکھے (یعنی اے غنی کرنے والی ذات)

یا کوئی شخص ضعیف و کمزور ہے تو وہ "یا قوی" کا ورد رکھے (یعنی اے طاقتور ذات) ہر حاجت میں اسی سے مدد مانگے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جو ایک مشہور تابعی اور ولی اللہ ہیں، جب حجاج بن یوسف نے ان کو قتل کرنے کا حکم دیا تو جلاد تلوار کھینچ کر سامنے آیا، آپ نے "یا باطن" کہا اور غائب ہو گئے، جب جلاد نے تلوار واپس کھینچی تو آپ "یا ظاھر" کہہ کر پھر سامنے آ گئے۔ اسی طرح متعدد بار ہوا تو جلاد عاجز آ گیا تو جب یہ شکایت حجاج کو پہنچی تو اس نے درخواست کی کہ میں شرمندہ ہوں میرے لئے بد دعا نہ کریں۔ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ میں کچھ نہ کہوں گا اللہ تعالیٰ خود انتقام لینے والی ذات ہے۔ پس معلوم ہوا کہ سارے عالم کا نظام اللہ تعالیٰ کے اسماء سے قائم ہے، ہر زندہ کو حیات اسم "الحی" سے ہی عطا ہوتی ہے اور ہر موجود کو بقا اسم "القیوم" کی وجہ سے عطا ہوتی ہے۔ کائنات کی ہر چیز بلکہ ہر ذرہ کی حیات و بقا حق تعالیٰ کی قیومیت اور صفت احیاء کے فیض سے قائم ہے، ہر ذرہ کائنات کو حیات ہر لمحے عطا ہوتی رہتی ہے اور ہر آن حیات جدید عطا ہوتی رہتی ہے لیکن عوام ہر آن کی عطا سے بے خبر ہیں۔ جس طرح بارش میں ایک ایک قطرہ آسمان سے ٹپکتا ہے لیکن دیکھنے والے کو ایک ہی دھار نظر آتی ہے اور الگ الگ قطرہ گرتا ہوا محسوس نہیں ہوتا، تو یہی حال حیات جدید کے عطاء کی ہے لیکن عارفین ہر آن تجلیات صفات الٰہیہ کے پر تو عالم کے ہر ہر ذرے کو اپنی بصیرت سے دیکھتے ہیں۔

مفہوم سیر فی الصفات: عارفین پر ایک خاص وقت اور زمانہ ایسا بھی گزرتا ہے جس میں وہ تفصیلات صفات الٰہیہ یعنی اسماء حسنیٰ کے تمام فیوض کو ملاحظہ کرتے ہیں، صوفیاء اس کو "سیر فی الصفات" کہتے ہیں۔

اثرات: اس مراقبہ میں عناصر ثلاثہ کی توجہ، حضور، عروج و نزول حاصل ہوتا ہے، باطن کے اندر عجیب وسعت اور ملأ اعلیٰ (فرشتوں کی دنیا) کے ساتھ مناسبت پیدا ہو جاتی ہے اور ہو سکتا ہے فرشتے بھی ظاہر ہونے لگیں۔ اس مقام میں ذکر تہلیل لسانی اور نفل طول قرأت کے ساتھ بکثرت پڑھنا ترقی بخشتا ہے اور رخصت پر عمل کرنا بہتر نہیں بلکہ عزیمت پر عمل کرنے سے ترقی ہوتی ہے کیونکہ رخصت پر عمل کرنے سے سالک بشریت کی طرف کھنچ جاتا ہے اور عزیمت پر عمل کرنے سے فرشتوں کی صفت کے ساتھ مناسبت پیدا ہو جاتی ہے، جس قدر فرشتوں کی صفت کے ساتھ مناسبت بڑھے گی، اسی قدر اس ولایت میں ترقی ہو گی، کبھی یہ دائرہ اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ اسماء وصفات حق سبحانہ و تعالیٰ اس دائرہ کو سورج کی شعاعوں کی مانند احاطہ کر لیتی ہیں اور کبھی شعاعوں کے خطوط کے بغیر بھی یہ دائرہ ظاہر ہوتا ہے اور کمال بے رنگی ظاہر ہوتی ہے اور اس میں اسماء وصفات الٰہی اپنے مسمیٰ کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ **اسم "الظاھر"** و **اسم "الباطن"** کی سیر میں فرق یہ ہے کہ **اسم "الظاھر"** کی سیر میں ذات کے ملاحظہ کے بغیر محض تجلیات صفاتی ظاہر ہوتی ہیں اور **اسم "باطن"** کی سیر میں اگرچہ اسماء وصفات کی تجلیاں بھی وارد ہوتی ہیں، لیکن کبھی کبھی ذات تعالیٰ و تقدس بھی مشہود ہو جاتی ہے، اس کے اسرار بہت ہی پوشیدہ رکھنے کے لائق ہیں۔

جب اسم ظاہر و باطن کے دو پر سالک کو حاصل ہو گئے تو اب یہ بات آسان ہو گئی۔ اس مقام تک سالک کی سیر ظلال یا صفات میں تھی، اس کے بعد سالک کا معاملہ حضرت ذات تعالیٰ و تقدس کے ساتھ شروع ہو گا اور اس کی سیر تجلیٔ ذاتی دائمی میں واقع ہو گی۔ تجلی ذاتی دائمی کے تین درجے ثابت کئے گئے ہیں۔ مرتبۂ اول کو کمالات نبوت، مرتبۂ دوم کو کمالات رسالت اور مرتبۂ سوم کو کمالات اولوالعزم کہتے ہیں، تفصیل آگے درج ہے۔

۲۴) نیت مراقبہ کمالات نبوّت: فیض می آید از ذات بیچون کہ منشاء کمالات نبوت است بہ عنصر خاک من بواسطہ پیران کبار۔ (توقف۔۔۔روز)

ترجمہ: بے چوں ذات حق تعالیٰ جو کہ کمالات نبوت کی منشاء ہے سے میرے عنصر خاک میں فیض آرہا ہے۔ بواسطۂ مشائخ عظام علیہم الرضوان (توقف)

تشریح: اسم باطن کی سیر کے بعد اگر فضل الٰہی شامل ہو تو کمالات نبوت یعنی تجلی ذاتی دائمی بے پردہ اسماء و صفات میں سیر شروع ہو جاتی ہے اور مقامات کا یہ پانچواں دائرہ ہے۔ اس کے آگے تین درجات ہیں، پہلا درجہ کمالات نبوت کا ہے اس مقام میں ذات باری تعالیٰ کا مشاہدہ بغیر صفات کے ہوتا ہے کیونکہ صفات کا زائد وجود ہے ذات سے لہٰذا صفات سے ذات کا الگ ہونا ممکن ہے اگرچہ حقیقت میں الگ نہیں ہوتی، عارف بمطابق المرء مع من احب (آدمی اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس سے اسے محبت ہے) کی محبت ذات باری تعالیٰ سے ہے۔ لہٰذا وہ اسی ذات حق کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے۔ گزشتہ ولایت ثلثہ اور تجلیات صفات و شیونات و اعتبارات اس مقام میں ظل کی مانند ہیں اور ذات حق تعالیٰ ان سے وراء الوراء ہے۔ نیز اس دائرہ میں عارف پر حروف مقطعات اور مشتبہات کے اسرار و رموز منکشف ہوتے ہیں اور اب عروج کے بعد نزول شروع ہو جاتا ہے اگر نزول تام نہ ہو تو کمالات نبوت سے متصف نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ ابھی وہ اہل تمکین میں شامل نہیں ہوا اور ابھی تک مشاہدہ ظلال سے آگے تجاوز نہیں کر سکا اور اس کا مشہودی ایمان، ایمان بالغیب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ نیز اس مقام پر تلاوت قرآنی ترقی کا باعث ہوتی ہے، خصوصاً نماز میں۔

صاحب شفاء القلوب فرماتے ہیں کہ اس مقام پر پہلے والے معارف سب مفقود ہو جاتے ہیں اور تمام سابقہ باطنی حالات بیکار اور برے معلوم ہونے لگتے ہیں، نسبت باطن میں کمال وسعت، بے

رنگی وبے کیفی اور یاس و حرمان حاصل ہوتی ہیں اور ایمانیات و عقائد حقہ میں یقین قوی ہو جاتا ہے اور استدلالی علم بدیہی ہو جاتا ہے، **لا تدرکہ الابصار** کے مصداق یافتہ ہو جاتا ہے اور ادراک یہاں پر نارسائی کی علامت ہے، اس مقام کے معارف و حقائق انبیائے کرام علیہم السلام کی شریعتیں ہیں اور اگر خدا تعالیٰ چاہے تو اسرار مقطعات قرآنی حاصل ہوتے ہیں اور باطن میں اس قدر وسعت ہو جاتی ہے کہ ولایت صغریٰ، کبریٰ وعُلیا اس کے سامنے بالکل لاشئ اور محض تنگ معلوم ہوتی ہیں۔

ان مذکورہ تینوں ولایتوں میں البتہ ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت پائی جاتی ہے، اگرچہ وہ صورت و حقیقت کی مناسبت ہوتی ہے لیکن اس مقام میں یہ نسبت بھی مفقود ہے۔ سابقہ حالات باطن کے مفقود ہو جانے، یا ناامیدی پیدا ہو جانے اور اپنے آپ کو قصوروار دیکھنے، حتیٰ کہ اپنے آپ کو کافر فرنگ سے بھی بدتر جاننے کے باوجود اس کو وصل حقیقی حاسل ہو جاتی ہے، اس سے پہلے جو وصل حاصل تھا وہ دائرۂ وہم و خیال میں داخل تھا، اس جگہ وصول ہے حصول نہیں اور اس مقام میں رؤیت کی تشبیہ حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ رؤیت کا وعدہ آخرت میں ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حکایت سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو سکتا ہے کیونکہ قرآن شریف میں **فلما تجلی ربہ** صاف موجود ہے جس کے معنی یہ ہیں جس وقت اللہ تعالیٰ نے تجلی فرمائی بس یہی دیدار و رؤیت ہے۔ حالانکہ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے کیونکہ دیدار و رؤیت کے معنی ہیں اور دیکھنا اور یہ فعل موسیٰ علیہ السلام کا ہے جس کا انکار قرآن شریف میں صاف موجود ہے یعنی **قال لن ترانی** تو مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکے گا (مراد ہے اس دنیاوی زندگی میں) اور تجلی کے معنی ہیں کھل جانا اور ظاہر ہونا۔ یہ فعل حق سبحانہ و تعالیٰ کا ہے۔۔ قرآن شریف کی آیت **فلما تجلی ربہ** میں اسی کو ثابت کیا گیا ہے ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے یعنی ایک کے ثابت ہونے

سے دوسرے کا ثبوت لازم نہیں آتا۔ پس اس آیت کا حاصل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ تو ظاہر ہوا اور حجابات اٹھا دیئے گئے مگر موسیٰ علیہ السلام نہ دیکھ سکے اور بے ہوش ہو گئے (خوب سمجھ لیجئے) اور بعض بزرگ مثلاً امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ و امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وغیرہم کے متعلق لکھا گیا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو خواب یا حال و مکاشفہ میں دیکھا ہے یہ البتہ ممکن و واقع ہے، کیونکہ یہ دیکھنا عالم مثال میں ہے نہ کہ عالم اجساد میں ظاہر کی (حسی) آنکھوں سے۔ بعض عارفوں کے کلام میں حق سبحانہ و تعالیٰ کو مختلف چیزوں جیسے سورج، دریا، ہوا وغیرہ سے مثال دی جاتی ہے حالانکہ مقصود ان مثالوں سے تشبیہ نہیں ہوتی جیسا کہ بعض خشک مزاج لوگ یہی سمجھ کر بزرگوں و برا کہتے ہیں اور ناواقف صوفی بھی یہی سمجھ کر اپنے عقیدوں کو شریعت مطہرہ کے خلاف کر لیتے ہیں بلکہ یہ امثال کسی خاص چیز میں ہوا کرتی ہے مثلاً ذات حق کو دریا سے صرف اس بات میں مثال دی جاتی ہے کہ دریا میں خشکی کی نسبت بسط اور واحد ہونے کی صفت ہوتی ہے اور مچھلی کی طبیعت اس سے نہیں بھرتی اسی طرح ذات حق کی وحدت ہے کہ طالب حق کو اس سے سیری نہیں ہوتی۔ اگرچہ خود ان دونوں وحدتوں میں فرق ہے کہ دریا کی وحدت عارضی اور دوسرے تعلق سے ہے اور ذات حق کی وحدت حقیقی ہے۔ بات یہ ہے کہ عالم مثال میں واجب سے لے کر ممکن تک ہر چیز مثال ہے اگرچہ اس چیز کی کوئی مثل (''م'' کے زیر اور ''ث'' کے جزم کے ساتھ) کے معنی ہیں کسی چیز کا دوسری چیز کی صفتوں میں شریک ہونا اور اس جیسا ہونا۔ پس ذات و صفات الٰہی میں اس مثل کی مجال نہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (شوریٰ ۱۱)۔

ترجمہ: اس جیسا کوئی نہیں۔

اور مثل (''م'' اور ''ث'' کے زبر کے ساتھ) اور مثال کی حقیقت یہ ہے کہ دو چیزوں کی صفت میں کسی بھی لحاظ سے شرکت ہو۔ اگرچہ ان دونوں میں ہزاروں درجہ فرق ہو، جیسا کہ اکثر دفعہ بادشاہ کی مثال سورج کے ساتھ دیتے ہیں جس سے مراد بادشاہ کی عظمت و جلال بیان کرنا ہوتا ہے کہ سورج کی طرح روشن وعیاں ہے۔ اس کی مثال یوں بھی دی جاسکتی ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں بادشاہ مصر نے خواب میں قحط کے سالوں کو دبلی اور لاغر گایوں اور گیہوں کے خشک خوشوں کی صورت میں دیکھا تھا اور ارزانی اور فصل کے سالوں کو موٹی تازی گایوں اور گیہوں کے تروتازہ خوشوں کی صورت میں دیکھا تھا۔ اور صحیح بخاری شریف میں حضرت ابی سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

بينا أنا نائم رأيت الناس يعرضون علي وعليهم قمص منها ما يبلغ الثدي ومنها ما دون ذلک وعرض علي عمر بن الخطاب وعليه قميص يجره) . قالوا فما أولت ذلک يا رسول الله؟ قال الدين۔[65]

ترجمہ: ''ایک دفعہ جبکہ میں سو رہا تھا میں دیکھتا ہوں کہ لوگ میرے روبرو پیش کئے جاتے ہیں اور ان کے جسموں پر کرتے ہیں بعض کے کرتے سینے تک پہنچے ہیں اور بعض کے اس سے کم و بیش ہیں اور (حضرت) عمر بن الخطاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اس حال میں پیش کئے گئے کہ ان کے جسم پر جو کرتہ تھا وہ اتنا بڑا تھا کہ وہ اس کو لمبا ہونے کی وجہ سے زمین پر کھینچتے تھے بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ نے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس کرتہ کھینچنے کی کیا تعبیر فرمائی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا دین''۔

---

[65] صحيح البخاري، ج ١، ص ١٧۔ الناشر: دار ابن كثير، اليمامة - بيروت

پس اسی طرح اس ذات حق کی تمثیل بیان کرنا بھی صحیح ہے اور اس کو کشف کی نظر سے مشاہدہ کرنا بھی صحیح ہے۔ اگرچہ رویت حق تعالیٰ دنیا میں ممکن نہیں (اس کا ذکر آئے گا) ذات حق کے لئے اس تمثیل کا جواز قرآن شریف سے بھی ثابت ہے:

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی (٨) فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى (النجم ٩) کا بھید اس مقام میں ظاہر ہوتا ہے اور اس معاملے کی ایسی حقیقت سالک پر ظاہر ہوتی ہے کہ تحریر اور تقریر میں نہیں آسکتی، یہ انبیاء کرام علیہم السلام کا مقام ہے اور متبعین کو انبیاء علیہم السلام کی متابعت اور وراثت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے اس مقام میں آداب وترتیل کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت، آداب کی رعایت کے ساتھ نماز نوافل کی کثرت، حدیث شریف کے پڑھنے پڑھانے کا شغل، اتباع سنت رسول مقبول ﷺ اور وہ اذکار جو احادیث سے ثابت ہیں، بہت فائدہ اور ترقی بخشتی ہیں بلکہ یہ چیزیں حقائق سبعہ میں بھی جو آگے آئیں گے مفید اور موجب ترقی ہیں۔

۲۵) نیت مراقبہ کمالات رسالت: فیض می آید از ذات بیچون کہ منشاء کمالات رسالت است بہ ہیئت وحدانی من بواسطہ پیران کبار۔ توقف۔۔۔روز

ترجمہ: ذات بیچوں حق تعالیٰ کہ کمالات رسالت کی منشاء ہے سے میری ہیئت وحدانی میں فیض مشائخ عظام کے توسل سے آرہا ہے۔ (توقف)

اثرات: صاحب شفاء القلوب فرماتے ہیں کہ اس مراقبہ میں بھی کیفیات مراقبۂ نبوت یعنی بے رنگی وبے کیفی اور لطافت وغیرہ مزید ترقی کے ساتھ حاصل ہوتی ہیں۔ سالک کو حصول فنا وتصفیہ اور تزکیۂ لطائف عشرہ کے بعد عالم امر و خلق کے دس لطیفوں میں جو اعتدال پیدا ہوتا ہے، اس ہیئت کو ہیئت وحدانی کہتے ہیں، اس مقام میں اور بعد کے تمام مراقبات میں عروج ونزول اور انجذاب تمام

بدن کا حصہ ہےیعنی یہاں سے آخری سبق تک مورد فیض سالک کی ہیئت وحدانی ہے، ان سب مقامات میں تلاوت قرآن مجید اور نماز بطول قرأت ترقی بخشتی ہے۔

۲۶) نیت مراقبہ کمالات انبیاء اولو العزم: فیض می آید از ذات بیچون کہ منشاء کمالات انبیاء اولوالعزم است بہ ہیئت وحدانی من بواسطہ پیران کبار رحمہم اللہ تعالیٰ۔توقف۔۔۔روز

ترجمہ: بے چوں حق تعالیٰ کی ذات جو کہ اولوالعزم انبیاء کے کمالات کی منشاء ہے، سے مشائخ عظام کے توسل سے میری ہیئت وحدانی میں فیض آرہاہے۔

یہ مقام اولوالعزم انبیاء سے مخصوص ہے۔ تجلی ذاتی دائمی کا تیسرا درجہ ہے اور اولوالعزم انبیاء علیہم السلام صرف چھ ہیں۔سیدنا وسندنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم، سیدنا ابراہیم خلیل اللہ، سیدنا نوح، سیدنا موسیٰ اور سیدنا عیسیٰ اور ابوالبشر آدم علیٰ نبینا و علیہم السلام یہ بھی درجات میں مختلف ہے۔سب سے بلند درجہ ہمارے رسول ﷺ کا ہے۔آپ کے بعد جس کا زمانہ جتنا نبی کریم ﷺ کے قریب ہوگا وہ اتنا ہی بلند درجہ ہوگا لہٰذا آپ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام بلند درجہ پر فائز ہیں ان کے بعد حضرت موسیٰ پھر حضرت ابراہیم پھر نوح علیہ السلام انبیاء میں سے بلند مقام پر فائز ہیں اور یہی حکمت ہے لطیفہ خفی زیر عیسیٰ علیہ السلام سری کے زیر قدم موسیٰ علیہ السلام روحی کے زیر قدم ابراہیم و نوح علیہ السلام کے اور قلبی کا زیر قدم حضرت آدم علیہ السلام کے ہے اور سب سے ارفع لطیفہ ہے اخفیٰ وہ سب سے فائق نبی خاتم الانبیاء علیہم السلام کے زیر قدم ہے۔ان کا عزم خواہ اللہ سے ماموریا نہ ہو مطلقاً اللہ تعالیٰ کی رضا سے واقع ہوتا ہے۔یہ کمالات رسالت کا نقطہ اخیرہ ہے جو

صرف اولوالعزم رسل علیہم السلام کو حقیقت میں حاصل ہے اور ان کے توسل و تبعیت و وراثت سے کاملین اولیاء کو بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

یہ کمالات بھی دائرہ کی شکل میں رونما ہوتے ہیں۔ دائرہ کمالات نبوت کے اندر کمالات رسالت کا دائرہ اور اس کے مرکز میں کمالات اولوالعزم کا دائرہ اور اس دائرے کے مرکز میں ختم الرسالت کا دائرہ۔ صاحب کمالات خاتم الرسالت ولایت و کمالات و حقائق و اسرار و معارف کا ختم کرنے والا یعنی خاتم ہے۔

صاحب شفاء القلوب فرماتے ہیں کہ ولایت صغریٰ و کبریٰ کے مراقبات اور مراقبات نبوت و رسالت اولوالعزم کے ذکر کرنے کے بعد اب اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ولایت اور اس کے ملحقات یعنی کرامات و مکاشفات کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (یونس ٦٢)

سن لو بے شک اللہ کے ولیوں پر نہ کچھ خوف ہے نہ کچھ غم۔

اور اس کے بعد ارشاد پاک ہے: الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ (یونس ٦٣)

وہ جو ایمان لائے اور پرہیز گاری کرتے ہیں۔

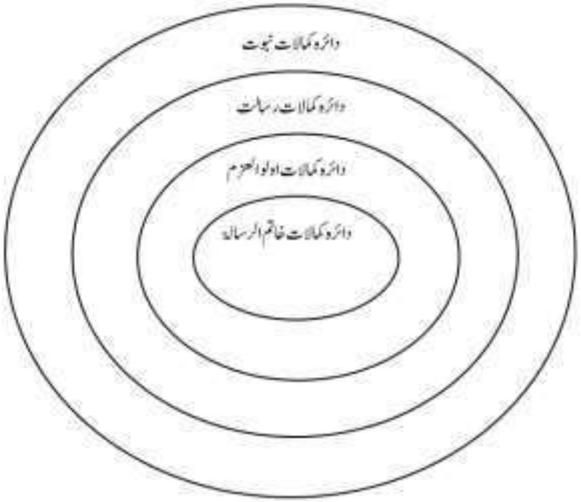

تو اس آیت میں ولایت کا دارومدار دو چیزوں پر رکھا گیا ہے ایک ایمان دوسرا تقویٰ، تو جس مرتبہ کا ایمان و تقویٰ حاصل ہو گا اسی درجہ کی ولایت نصیب ہو گی۔ اگر ادنیٰ درجہ کا ایمان و تقویٰ ہو گا یعنی صحیح عقائد اور اعمال صالحہ ہوں تو ادنیٰ درجہ کی ولایت ہو گی جیسے کہ ہر مومن کو حاصل ہے اور اگر ایمان و تقویٰ اعلیٰ درجہ کا ہو گا تو ولایت بھی اعلیٰ درجہ کی ہو گی۔ جس کو "ولایت خاصہ" بھی کہتے ہیں اور اصطلاحاً ولی اس شخص کو کہتے ہیں جو ولایت خاصہ کے ساتھ موصوف ہو اور ہمارا مقصود بھی اس ولایت کے احکام بیان کرنے ہیں۔ تو اب ولایت خاصہ کے لئے دو چیزیں اہم اور ضروری ٹھہریں ایک ایمان کامل دوسرا تقویٰ کامل۔ ان دونوں چیزوں میں کمال بغیر اصلاح باطن کے نہیں آسکتا۔ کیوں کہ ایمان کامل تو ظاہر ہے قلب ہے، رہا تقویٰ تو اس کا محور بظاہر ظاہری اعمال ہیں پھر بھی اصل تقویٰ دل ہی کا ہوتا ہے یعنی حقیقی تقویٰ کا تعلق دل ہی سے ہوتا ہے۔

ایک حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

التقویٰ ھھنا و أشار الی الصدر۔[66]

ترجمہ: ”تقویٰ یہاں ہے اور اشارہ فرمایا سینے کی طرف“۔

اور فرمایا:

ان اولی الناس بی المتقون من کانوا حیث کانوا۔[67]

ترجمہ: ”مجھ سے قریب تر متقی لوگ ہوں گے جو بھی ہوں جہاں کہیں ہوں“ تو معلوم ہوا کہ دو چیزیں طالب ولایت کے لئے لازم ٹھہریں۔ ایک ایمان دوسرا تقویٰ اور تقویٰ اصلاح باطن سے آتا ہے اور اصلاح باطن کا مطلب یہ ہے کہ اوصاف حمیدہ پیدا ہوں اور صفات رذیلہ ختم ہوں کیونکہ یہ امراض معنوی ہیں، ان امراض سے شفایاب ہونا ہی اصلاح باطن ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تصوف کی حقیقت اللہ تعالیٰ سے تعلق بڑھانا ہے، اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

اثرات: اس مراقبہ میں ہر دو کمالات سابقہ کی مثل فیض کے اثرات مرتب ہوتے ہیں، پس ہر سہ کمالات میں تجلی ذاتی دائمی کا فیض بے پردہ اسماء و صفات حاصل ہوتا ہے، نفس کے اندر کامل اضمحلال، وسعت باطن، وصل حقیقی، حضور بے جہت، اتباع شریعت وار معارف و حقائق کا فیضان ہوتا ہے۔ ہر مقام میں پہلے سے زیادہ وسعت و بے رنگی پیدا ہو جاتی ہے، اسرار مقطعات قرآنی اور متشابہات فرقانی کا انکشاف ہوتا ہے جو کسی طرح بیان و تحریر میں نہیں آسکتا اور عاشق (محب) و معشوق (محبوب) کے رموز، کہ جن کے کہنے اور سننے کی مجال نہیں ہے، اس جگہ موصول ہوتے ہیں، اس جگہ تلاوت قرآن مجید، خاص کر نفل نمازیں ترقی بخشتی ہیں۔

---

[66] سنن ترمذی، کتاب بر و الصلۃ عن رسول اللہ ﷺ ۲۸، باب ما جاء فی شفقۃ المسلم علی المسلم ۱۸، حدیث ۱۹۲۷

[67] مسند احمد بن حنطل باب حدیث معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حدیث: ۲۲۱۰۵

دائرہ قیومیت:

ان کمالات کے حصول کے بعد قیومیت کا دائرہ مشہود ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ دائرہ اولوالعزم سے مترشح ہے۔
لیکن اس کے ارفع و اعلیٰ بالشان ہونے کی وجہ سے علیحدہ بیان کی جاتی ہے۔ کمالات اولوالعزم دائرہ کے بعد قیومیت و خلافت کا دائرہ مشہود ہوتا ہے۔

چونکہ اس مقام میں کمال درجہ نزول تام ہوتا ہے اور رسول اکرم ﷺ کا مکمل ترین نائب ہوتا ہے۔ عام انسان میں اس طرح نظر آتا ہے کہ جیسا کہ وہ عام انسان ہو۔ لہٰذا اس مقام کے عارف کی پہچان دوسروں سے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ اسی لئے مخالفت بھی سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ البتہ اس کی توجہ نہایت قوی التاثیر ہوتی ہے۔
اور عصر حاضر کے قیوم میرے مرشد کامل و اکمل شیخ المشائخ حضرت سیدی سیف الرحمٰن اخوندزادہ پیر ارچی خراسانی آف فقیر آباد (لاہور، پنجاب، پاکستان) ہیں۔

مذکورہ بالا تمام کمالات وفیوضات جو اب تک عارف حاصل کر چکا ہے، کمالات قیومیت کے سامنے مانند ظل و شبح ومثال کے ہیں اور یہ منصب تمام مقامات مذکورہ سے ارفع وعالیٰ ہے۔

کمالات ثلاثہ کے بعد سلوک کے دوراستے ہیں۔ ایک بجانب حقائق الٰہیہ اور دوسرا بجانب حقائق انبیاء علیہم السلام مرشد جس طرف چاہے کہ طالب کو چلائے چونکہ سب سے قبل ان حقائق کو بیان فرمانے والے امام ربانی عارف حقانی سیدنا مجدد الف ثانی قدس اسرارہ ہیں اور آپ نے حقائق الٰہیہ کا پہلے ذکر فرمایا ہے، اسی لئے میرے مرشد گرامی مجدد عصر ھذا قیوم زماں حضرت مبارک صاحب قدس اسرارہ بھی حقائق الٰہیہ کے مراقبات پہلے ہی کراتے ہیں۔

۲۷)نیت مراقبہ حقیقت کعبہ ربّانی: فیض می آید از ذات بیچون کہ مسجود جمیع ممکنات است و منشاء حقیقتِ کعبہِ ربّانی است بہ ہیئت وحدانی من بواسطہ پیران کبار۔توقف۔۔۔روز

ترجمہ: بے چوں وبے مثل ذات تعالیٰ جو کہ تمام ممکنات کی مسجود اور حقیقت کعبہ ربانی کی منشاء ہے سے بوسیلہ مشائخ عظام علیہم الرضوان میری ہیئت وحدانی میں فیض آرہا ہے۔(توقف روز)

تشریح: حقیقت کعبہ سے مراد سرادقات عظمت کبریا یا نور صرف ہے جو تمام کا مسجود اور تمام تعینات کا اصل ہے۔ سرادقات عظمت وکبریا میں اضافت بیانیہ یعنی عظمت وکبریا جو ذات پاک کے سرادقات ہے(سر، پردے)حدیث قدسی میں ہے:

لکبریاءُردائي والعظمةُإزاري فمَن نازَعني واحدًا منهما ألقيتُه في النّارِ۔[68]

کبریائی میری ردا(چادر) اور عظمت میری ازار (تہ بند) ہے۔ پس جو شخص ان دونوں میں میرے ساتھ منازعت کرے، میں اسے آگ میں پھینک دوں گا۔

---

[68] مختصر المقاصد، ص ۷۳۶، ابوداؤد، ۴۰۹۰، ابن ماجہ ۴۱۷۴

جس طرح چادر اور تہ بند انسان کے بدن کو چھپاتے ہیں اسی طرح صفت عظمت و کبریاء اللہ تعالیٰ کی حقیقت وادراک بصر سے مانع ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔ لاتدرکہ الابصار آنکھ اس کا ادراک نہیں کر سکتی۔ نور صرف کا حال نور آفتاب کے انتشار کا سا ہے جو اس کے قرب کا حجب ہے، نور عین قرص سے منتشر ہو کر اس کا حجاب بن جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔ حجابہ النور بلکہ حقیقت کعبہ ذات الٰہی ہے۔ بحیثیت مسجودیت و معبودیت اور مرتبۂ احدیت ہے اور صور علمیہ جو کہ ذات باری کا مرتبۂ و احدیت ہے، اس سے بھی فوق ہے۔ حضرت وجود سے بھی فوق ہے، کیونکہ حضرت امام ربانی قدس اسرارہ کے قدیم قول کے مطابق وجود تعین جبی سے بھی فوق ہے۔ اسی بناء پر حضرت امام ربانی مذکور ارشاد فرماتے ہیں کہ صورت کعبہ صورت محمدیہ اور حقیقت کعبہ حقیقت محمدیہ کی مسجود ہے اور چونکہ حقیقت محمدیہ مراتب تعینات سے مترشح ہوتی ہے۔ یہ حقیقت کعبہ مراتب تعینات سے فوق ہے۔

اس مقام پر سالک کو ذات پاک کی عظمت و کبریائی نظر آتی ہے اور دریائے ہیبت و جلال میں مستغرق ہو جاتا ہے جب لاکھوں میں سے ایک عارف کو اس مرتبہ میں فنا و بقاء حاصل ہوتی ہے تو وہ ممکنات کی توجہ اپنی طرف پاتا ہے۔

صاحب شفاء القلوب فرماتے ہیں کہ مراقبۂ حقیقت کعبۂ ربانی کی نیت کر کے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور تمام ممکنات کا مسجود لہ ہونے کا مراقبہ کرے، اس مقام میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی مشہود ہوتی ہے، سالک کے باطن پر ایک قسم کی ہیبت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اس شان سے متصف پاتا ہے اور ممکنات کی توجہ اپنی جانب جانتا ہے، جب اس مرتبۂ پاک کی فنا و بقا حاصل ہو جائے تو مراقبہ حقیقت قرآن مجید تلقین کرے۔

۲۸)نیت مراقبہ حقیقت قرآن مجید: فیض می آید از وسعتِ بیچون حضرت ذات کہ منشاء حقیقت قرآن مجید است بہ ہیئت وحدانی من بواسطہ پیران کبار۔ **توقف۔۔۔روز**

ترجمہ: ذات بے چوں حق تعالیٰ جو کہ حقیقت قرآن مجید ہے کی وسعت سے بواسطہ مشائخ عظام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم میری ہیئت وحدانی میں فیض آرہا ہے۔

تشریح: حقائق الٰہیہ میں سے دوسرا دائرہ حقیقت قرآن ہے۔ حقیقت قرآن سے مبدء وسعت بے چوں ذات باری تعالیٰ مراد ہے اور یہ حقیقت کعبہ ربانی سے فوق ہے۔ حقیقت کعبہ کو تو نور محض سے تعبیر کیا جا سکتا تھا مگر حقیقت قرآن پر نور کے اطلاق کی بھی گنجائش نہیں۔ اسی طرح سہ گانہ ولایت اور کمالات نبوت سے بھی برتر ہے۔ اہل سنت وجماعت کا عقیدہ ہے کہ حضرت حق تعالیٰ ازل ابد واحد بسیط کلام کے ساتھ متکلم ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ کلام الٰہی کے واحد بسیط ہونے کے باوجود تفصیل موجود ہے۔ انشاء (اوامر و نواہی) اور اخبار کا نور جدا جدا ہے کیونکہ عین اجمال میں وسعت و تفصیل کا پایا جانا صفات و وسعت کمال سے ہے۔ اس مرتبہ کی اجمال و تفصیل فہم و عقل انسان سے بالاتر ہے۔ اس مقام پر عارف کامل پر قرآن مجید کے مقطعات اور متشابہات منکشف ہو جاتے ہیں۔ قرآنی مقطعات جو کہ محبوب و محب کے درمیان بلا واسطہ اسرار ہیں۔ اوپر والا نصف دائرہ ہیں اور متشابہات جو کہ محبوب و محب کے درمیان بالواسطہ رموز ہیں وہ نچلا نصف دائرہ ہیں۔

نیز قرآن مجید کا ایک ایک حرف ایک دریا نظر آتا ہے۔ جو کعبہ مقصود تک پہنچانے والا ہے۔ تلاوت قرآن مجید میں نہایت درجہ کی حلاوت محسوس ہوتی ہے اور احکم الحاکمین سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے، بسا اوقات تمام بدن ہی زبان بن جاتا ہے۔

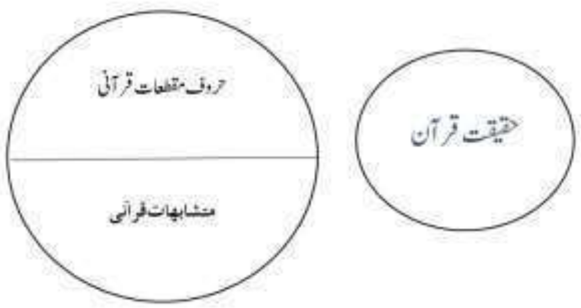

صاحب **شفاء القلوب** فرماتے ہیں کہ ایمان ویقین کا نور جب قلب کے شیشے میں پہنچتا ہے تو اُس نور سے قلب نرم ہو جاتا ہے اور اس کی نرمی جسم میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ بھی دل کی نرمی کے اثر سے نرم ہو جاتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ۔ (الزمر ۲۳)

ترجمہ: ”ان کی جلدیں اور ان کے قلوب خدا کے ذکر سے نرم ہو جاتے ہیں“۔

جب قلب نور سے معمور ہو جائے اور سرور و محبت کی وجہ سے جسم بھی نرم پڑ جائے تو زمان و مکان قلب کے نور میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ کلمات، آیات اور سورتیں بھی شامل ہوتی ہیں بلکہ قالب خاکی کی سرزمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اُٹھتی ہے، ایسی صورت میں قلب آسمان کی طرح اور جسم زمین کی مانند ہوتا ہے۔ کلام اللہ کی تلاوت کی لذت دنیا ومافیہا کو اس سے چھپا دیتی ہے اور قرآن مجید صاف شہود کی مزاحمت کرنے میں تمام کائنات کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ اس وقت نہ تو نفسانی کلام کا وجود رہتا ہے اور نہ کسی وسوسہ کی آہٹ سنائی دیتی ہے بلکہ ابتداء سے انتہاء تک تلاوت قرآن کریم کا کسی وسوسہ اور نفسانی کلام کے بغیر تصور کیا جاسکتا ہے جو خدا کا بہت بڑا فضل و کرم ہے۔

جب قرآن مجید پڑھنے کا ارادہ کرے تو تھوڑی دیر کے لئے یہ اچھی طرح سوچ لے کہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے روبرو بیٹھا ہوں جس طرح شاگرد اُستاد کے روبرو بیٹھا ہو اور اپنا سبق اللہ تبارک و تعالیٰ کو سنا رہا ہوں تو اس مراقبہ سے جو کیفیت حاصل ہوگی وہ خود بخود معلوم ہوگی۔

بعض اکابر نے اس مقام میں اسے طرح دیکھا ہے کہ میں خانہ کعبہ کے اوپر آگیا ہوں اور وہاں ایک زینہ رکھا ہوا ہے جس کے ذریعے سے اوپر چڑھ کر حقیقت قرآن مجید میں داخل ہوا ہوں۔ اس مقام میں شرح صدر ہو جاتا ہے، وسعت و بے چونی میں احوال ظاہر ہونے لگتے ہیں، کلام الٰہی کے بطون و اسرار اس مقام میں ظاہر ہوتے ہیں اور کلام اللہ کے ہر حرف میں معانی کا ایک بے پایاں دریا نظر آتا ہے، پند و نصائح، قصص و حکایات کو اور اوامر و نواہی وغیرہ کی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

قرآن مجید پڑھنے کے وقت قاری کی زبان شجرۂ موسوی کا حکم حاصل کر لیتی ہے اور قاری کا تمام قالب (جسم) زبان بن جاتا ہے۔ قرآن مجید کے انوار کے ظاہر ہونے کی علامت غالباً عارف کے باطن کے اوپر ایک ثقل (بوجھ) کا وارد ہونا ہے بموجب آیت کریمہ:

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا (المزمل ۵)

ترجمہ: بے شک عنقریب ہم تم پر ایک بھاری بات ڈالیں گے۔

نسبت حقیقت کعبہ معظمہ باوجود اس سب عظمت و کبریائی کے حقیقت قرآن مجید سے نیچے دکھائی دیتی ہے۔

تنبیہ: اس کے محاذات میں دائرۂ حقیقت صوم واقع ہے، اس کے انوار و اسرار بھی اسی کے متعلق ہیں اور یہ دائرہ بھی سلوک میں داخل نہیں ہے۔

۲۹) نیت مراقبہ حقیقت صلوٰۃ: فیض می آید از کمال وسعت بیچون حضرت ذات کہ منشاء حقیقت صلوٰۃ است بہ ہیئت وحدانی من بواسطہ پیران کبار۔ توقف۔۔۔روز

ترجمہ: ذات حق تعالیٰ کے وسعت کمال سے جو کہ منشاء حقیقت صلوٰۃ ہے بوسیلہ مشائخ عظام میرے ہیئت وحدانی میں فیض آرہا ہے۔(توقف روز)

تشریح: حقیقت صلوٰۃ سے مراد کمال وسعت بیچوں ذات پاک حق تعالیٰ ہے۔ حقیقت کعبہ اور حقیقت قرآن اس کے جزء نظر آتے ہیں اور حقیقت صلوٰۃ سب کمالات کی جامع ہے۔ شب معراج میں جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قف یا محمد فان ربک یصلی تو ممکن ہے کہ اسی حقیقت صلوٰۃ کی طرف اشارہ ہو۔ مضمون حدیث ان تعبد اللہ کانک تراہ اس جگہ پر بوجہ کمال ظاہر ہوتا ہے۔ سرور عالم ﷺ نے اسی حالت کرتے ہوئے فرمایا۔ الصلوٰۃ معراج المومن نیز فرمایا اقرب مایکون العبد من الرب فی الصلوٰۃ نیز قرۃ عینی فی الصلوٰۃ اور ارحنی یا بلال اور جو کمالات ومشاہدات نماز کے باہر مشہور ہوتے ہیں، وہ نماز کے دوران ظاہر سے مطلقاً تعلق ختم کر کے عالم غیب سے ملحق ہو جاتا ہے جس کی کیفیت معلوم نہیں ہو سکتی۔ یہ تمام کمالات اور حقائق اس وقت منکشف ہوتے ہیں کہ جبکہ کتب فقہ کے مطابق نماز کے فرائض، شرائط، واجبات، سنن ومستحبات کا لحاظ رکھا جائے۔ اسی لیے فرمایا: إِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ (البقرۃ ۴۵)

صاحب شفاء القلوب فرماتے ہیں کہ مراقبۂ صلوٰۃ یعنی نماز میں حضوری حاصل کرنے کے کئی طریقے ہیں:

۱۔ یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں۔

۲۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے۔

۳۔ یہ کہ معنیٰ کا خیال رکھے۔

۴۔ یہ کہ ہر لفظ بالقصد منہ سے نکالے کہ کوئی لفظ محض یاد سے ادا نہ ہو بلکہ یہ قصد کرے کہ اب یہ لفظ نکالنا ہے۔

۵۔ یہ سمجھنا کہ یہ میری عمر کی آخری نماز ہے شاید اس کے بعد دوسری نماز پڑھنے کی مہلت نہ ملے تو ان طریقوں میں سے جو طریقہ چاہے، اختیار کریں۔

اثرات: وہ پاکیزہ قلوب، جن کی اصلاح جسم کی اصلاح کی بدولت ہو چکی ہے، آسمانی ہیں، چنانچہ جب وہ تکبیر کہہ کر نماز شروع کرتے ہیں تو اس وقت وہ آسمان میں داخل ہو جاتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے آسمان کو شیاطین کے تصرفات سے محفوظ کر رکھا ہے اسی طرح آسمانی قلب بھی شیطان کی دسترس سے محفوظ رہتا ہے۔ البتہ نفسانی وسوسے باقی رہتے ہیں جو آسمان کی قلع بندی کے باوجود منقطع نہیں ہوتے، اس وقت شیطانی تصرف منقطع ہو جاتا ہے مگر مقربین بارگاہ کے قلوب بتدریج مقامات قرب کی طرف بڑھتے رہتے ہیں جب وہ آسمانوں کے مختلف طبقات پر چڑھتے رہتے ہیں تو ہر آسمانی طبقہ میں نفس کی کچھ نہ کچھ تاریکی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں، اور اس کے مطابق نفسانی وسوے بھی کم ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ جب وہ تمام آسمانوں سے گزر کر عرش کے سامنے پہنچتے ہیں تو عرش کی تیز روشنی کے سامنے تمام نفسانی وساوس بالکل فنا ہو جاتے ہیں یعنی نفس کی تاریکیاں نور میں قلب میں اسی طرح غائب ہو جاتی ہیں جس طرح رات دن میں غائب ہو جاتی ہے، اس مقام پر پہنچنے کے بعد آداب نماز کے تمام حقوق مکمل ادا ہوتے ہیں۔

اس مقام میں حضرت ذات بے چوں کی کمال درجہ کی وسعت ظاہر ہوتی ہے اور نماز کی حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔ یہ مقام نہایت اعلیٰ وارفع ہے اور الصلوٰۃ معراج المؤمنین ترجمہ: ”نماز مومنین کے لئے معراج ہے“۔

عن أبی ہریرۃ أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال أقرب ما یکون العبد من ربہ وھو ساجد فأکثروا الدعاء۔[69] ترجمہ: (بندہ نماز میں رب کے سب سے زیادہ نزدیک ہے۔) کا راز ظاہر ہوتا ہے، اس کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔ حقیقت قرآن مجید اس کا ایک جز اور حقیقت کعبہ اس کا دوسرا جز ہے۔ سالک جب اس حقیقت مقدسہ سے بہرہ ور ہوتا ہے تو نماز ادا کرتے وقت اس دار فانی سے باہر ہو کر دار آخرت میں داخل ہو جاتا ہے،

اور حدیث: ان تعبد اللہ کانک تراہ۔ بطریق کمال جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ سالک کو چاہیئے کہ نماز کی ادائیگی میں تمام سنن و آداب کی کما ینبغی رعایت کرے تاکہ حقیقت صلوٰۃ جلوہ گر ہو جائے، لوگ نماز کی حقیقت سے ناواقف ہیں، یہی وجہ ہے کہ صوفیوں کا ایک جم غفیر اپنے اضطراب اور قبض کی تسکین و علاج، راگ و نغموں کے پردوں میں دیکھتے ہیں اور اپنے مطلوب کو سماع اور وجد و تواجد میں تلاش کرتے ہیں، اسی لئے وہ رقص و رقاصی کو اپنی عادت بنا لیتے ہیں۔ اگر نماز کے کمالات کا تھوڑا کرشمہ بھی ان پر ظاہر ہوتا تو کبھی سماع و نغمہ کا دم نہ بھرتے اور وجد و تواجد کو یاد نہ کرتے۔ ان ہر سہ حقائق الٰہیہ میں سالک کے تمام وجود میں اضمحلال سرایت کر جاتا ہے اور وسعت باطن بتدریج اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ ہم نے نماز کے بارے میں جو ذکر کئے وہ بہت کم ہیں نماز کی شان ہمارے بیان سے کہیں زیادہ اونچی ہے۔

حقائق کے اسباب: کمالات کے ان تین اسباق کے بعد دو راستے ہیں، جیسے آپ ایک سڑک پر چلتے جائیں اور سامنے ایک دوراہا آ جائے، تو آپ دائیں بھی جا سکتے ہیں اور بائیں بھی یعنی ان دونوں میں سے آپ جو بھی راستہ چاہیں اپنا سکتے ہیں۔ پہلے یہ ایک راستہ تھا جس کو حقائق کا راستہ کہتے تھے۔ چنانچہ اس میں حقیقت کعبۂ ربانی، پھر حقیقت قرآن مجید اور اس کے بعد حقیقت نماز کے اسباق تھے اور اس

---

[69] سنن أبي داود، ج ١، ص ٣٢٦۔ الناشر: دار الكتاب العربي-بيروت

میں حقیقت کعبہ ٔربانی، پھر حقیقت قرآن مجید اور اس کے بعد حقیقت نماز کے اسباق تھے اور اس کے بعد پھر معبودیت صرفہ کا سبق آجاتا۔ سب مشائخ اسی کے ذریعے سالک کو لے کر چلتے لیکن آخری عمر میں مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ پر منکشف ہوا کہ اس کا ایک متبادل راستہ بھی ہے اور وہ حقائق انبیاء کا راستہ ہے۔ پہلے حقائق اعمال کے تھے جن کو ''حقائق الٰہیہ'' بھی کہا گیا ہے۔ اب حقائق انبیاء کا راستہ ہے دونوں راستے ایک ہی منزل تک پہنچتے ہیں۔

کتب معتبرہ میں تو شیخ کی مرضی پر موقوف رکھا گیا ہے کہ وہ سالک کو جس راستے پر چاہے چلائے مگر ہمارے مشائخ سلکین کو دونوں راستوں کی سیر کراتے ہیں۔ اس طرح سالک کو حقائق الٰہیہ کے کمالات بھی مل جاتے ہیں اور حقائق انبیاء کے کمالات سے بھی مستفید ہو جاتا ہے۔ اب آگے جو اسباق ہیں وہ حقیقت کعبہ ٔربانی، حقیقت قرآن مجید اور حقیقت نماز کے ہیں۔ یہ ترتیب اس لئے ہے کہ حقیقت کعبہ ٔربانی بنیاد ہے اور حقیقت قرآن اس کے اوپر ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی مثال امام کی سی ہے اور کعبہ کی مثال مقتدی کی سی حقیقت کعبہ ٔربانی میں انسان اپنے آپ کو ایسا محسوس کرتا ہے جیسے میں کعبہ کی چھت پر ہوں اور جو انوارات وہاں برس رہے ہیں وہ میرے اوپر بھی آرہے ہیں لیکن حقیقت قرآن میں اس سے اوپر ترقی ہو جاتی ہے حقیقت قرآن سے اوپر مرتبہ حقیقت نماز ہے۔ در حقیقت قرآن سے اوپر مرتبہ حقیقت نماز ہے۔ درحقیقت اصل تو حقیقت نماز ہے اور اس کے دو جزو ایک کو حقیقت کعبہ ٔربانی اور دوسرے کو حقیقت قرآن مجید کہتے ہیں۔ جب یہ دونوں اجزاء ملتے ہیں تو نماز کی حقیقت نصیب ہو جاتی ہے۔ جس کی وضاحت آئندہ ملاحظہ فرمائیں۔

کمالات اور حقائق الٰہیہ کا تعلق

"ھدایت الطالبین" میں حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ تحقیق مرتبۂ کمالات اور حقائق الٰہیہ ثلاثہ کے درمیان ایک نوع کی نسبت ہے بلکہ محققین نے تو یہ بھی فرمایا ہے کہ حقائق الٰہیہ کمالات کی بہ نسبت ایسی ہیں جیسے دریا کی موجیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ چونکہ کمالات میں تجلیات ذاتی دائمی کا ظہور ہوتا ہے اس لئے ضرور ہر وہ نسبت، جو فرق سے تعلق رکھتی ہے، مرتبۂ ذات سے خالی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا لفظ امواج کا اطلاق یہاں پر بالکل صحیح ہے اور جو کچھ مجھ ناچیز کے فہم و ادراک میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ حقائق کے مقام پر جو منکشفات ہوتی ہیں وہ کمالات کی نسبت کے مقام پر ظاہر نہیں ہوتی مثلاً کعبۂ معظمہ کی حقیقت میں عظمت و کبریائی کا ظہور ہوتا ہے اور تمام ممکنات کی مسجودیت اس طرح ظہور کرتی ہے کہ اس کے ادراک سے عقل عاجز اور زبان گنگ رہ جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ کے گھر کی حقیقت، اللہ کے کلام کی حقیقت اور پھر نماز کی حقیقت، ان سب کا اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلق ہے۔ کیا کعبۂ معظمہ کی صرف ظاہری صورت ہے؟۔

مکتوبات دفتر سوم مکتوب ۱۲۴ میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں: جاننا چاہیے کہ صورت کعبہ سے مراد (موجودہ) اینٹ، پتھر نہیں ہے کیونکہ اگر بالفرض یہ اینٹ پتھر درمیان میں نہ ہوں تو بھی کعبہ، کعبہ اور مسجود خلائق ہے بلکہ صورت کعبہ، باوجود اس کے کہ عالم خلق سے ہے دوسری موجودات کی مانند نہیں ہے، بلکہ ایک مبطن (پوشیدہ) امر ہے جو حس و خیال کے احاطہ سے باہر ہے، اگرچہ بظاہر اس کا تعلق عالم محسوسات سے ہے۔ لیکن پھر بھی محسوسات سے ماوراء ہے اور (اگرچہ) وہ تمام اشیاء کا متوجہ (جس کی طرف توجہ کی جائے) ہے لیکن بظاہر وہ چیز نہیں ہے جو حقیقت ہے، وہ ایک ایسی ہستی ہے جو نیستی کا لباس پہنے ہوئے ہے اور

ایک ایسی نیستی ہے جس نے اپنے آپ کو ہستی کے لباس میں ظاہر کیا ہے اور جہت میں ہو کر بے جہت اور سمت میں ہو کر بے سمت ہے۔

بفرض تقدیر اگر یہ ظاہری عمارت نہ بھی ہو تو بھی حقیقی کعبہ موجود ہو گا، ہم اینٹ پتھر کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ اس کے اندر جو تجلیات ذاتیہ اتر رہی ہیں، وہ ہماری مسجود ہیں چنانچہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں واضح فرق بھی یہی ہے کہ ہندو پتھر کی بنی ہوئی مورتیوں کو سجدہ کرتے ہیں جبکہ ہم پتھر سے بنے ہوئے کعبہ پر جو تجلیات اُتر رہی ہیں، ان کو سجدہ کرتے ہیں۔

فرض کریں کہ ایک شخص خلا میں چلا گیا تو وہ بیت اللہ کی عمارت کی طرف تو رُخ کر ہی نہیں سکتا لیکن چونکہ عرش کے اوپر سے تجلیات ذاتیہ آ رہی ہیں اور آسمانوں پر بیت المعمور بھی ہے، فرشتے جس کا طواف کر رہے ہیں اسی کے بالکل نیچے زمین پر مسلمان بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں، اور درمیان میں سب ستارے وغیرہ ان تجلیات کا طواف کرتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی عجیب شان ہے۔ اسی طرح کوئی شخص سمندر کی تہہ میں چلا جائے تو عمارت تو وہاں بھی سامنے نہیں آسکتی مگر تجلیات تو تحت الثریٰ تک موجود ہیں وہاں بھی اس کی نماز ہو جائے گی۔

تو مقصود یہ بتانا تھا کہ ہم متوجھا الیٰ جھة الکعبة الشریفة "بیت اللہ کی طرف رخ کرتے ہیں" اس کو سجدہ نہیں کرتے، جو مسجود الیہ ہے وہ تجلیات ذاتیہ ہیں جو کعبہ پر اتر رہی ہیں، کعبہ ایک جگہ ہے جس نے ہمارے لئے جہت کو متعین کر دیا ہے، اگر جہت نہ ہوتی تو لوگوں کو یہ سمجھ نہ آتی کہ ہم کس طرف رخ کریں، کوئی دائیں رخ کرتا تو کوئی بائیں، کوئی آگے رخ کرتا تو کوئی پیچھے۔ اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا اور ہمیں اس پریشانی سے بچا لیا، ایک جگہ کو متعین کر دیا ہے کہ دیکھو یہ میرا گھر ہے،

اب چاروں طرف سے سب بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھو۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اگر بالفرض یہ اینٹ پتھر درمیان میں نہ بھی ہوں تو بھی کعبہ مسجود خلائق رہے گا۔

کعبہ کی حقیقت تمام مخلوقات کی مسجود الیہ ہے:

مکتوبات امام ربانی دفتر اول مکتوب ۴۶۳ میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں: فقیر کے نزدیک، جس طرح کعبۂ ربانی کی ظاہری صورت مخلوق کی صورت کے لئے، خواہ وہ بشر ہوں یا ملک (یعنی فرشتہ) مسجود الیہ ہے اسی طرح اس کی حقیقت بھی تمام مخلوقات کے لئے مسجود الیہ ہے، پس لازمی طور پر وہ حقیقت (کعبۂ ربانی) تمام حقائق پر فوقیت رکھتی ہے اور اس کے متعلقہ کمالات تمام حقائق کے متعلقہ کمالات سے فائق تر ہیں۔ گویا حقیقت کعبہ ”حقائق کونی“ ہیں (یعنی کائنات کے جو حقائق ہیں) اور ”حقائق الٰہی“ سے مراد عظمت و کبریائی کا پردہ ہے کیونکہ کوئی رنگ و کیف اس (تعالیٰ شانہ) کے دامان قدس تک نہیں پہنچتا اور کوئی ظلیت اس تک راہ نہیں پاتی۔

آگے فرماتے ہیں: جہت کعبہ حقائق الٰہی تعالیٰ و تقدس کے ظہورات کا مقام ہے لہٰذا کعبہ دنیا میں عجوبۂ روزگار ہے جو بظاہر دنیا سے ہے لیکن حقیقت میں آخرت سے متعلق ہے۔

مکتوبات معصومیہ دفتر اول مکتوب ۲۴ میں حقیقت کعبۂ ربانی کے برزخ ہونے کو اس طرح بھی سمجھایا گیا ہے کہ حقیقت کعبہ، حقائق مخلوقات اور حقیقت واجب جل سلطانہ کے درمیان، جو کہ مرتبۂ احدیت ذات تعالیٰ و تقدس ہے، برزخ ہے کیونکہ کعبہ مخلوق کا مسجود الیہ ہے (اسی لئے) اس کی حقیقت تمام مخلوق کے حقائق سے ضرور ممتاز ہونی چاہیئے۔ چونکہ مسجود، ذات حق سبحانہ و تعالیٰ ہے (اس لئے) کعبہ کی حقیقت تمام مخلوق کے حقائق سے ضرور ممتاز ہونی چاہیئے۔ چونکہ مسجود، ذات حق سبحانہ و تعالیٰ ہے (اس لئے) کعبہ کی حقیقت بھی اس مقدس بارگاہ سے ہونی چاہیئے۔ ہمارے

حضرت مجدد الف ثانی قدسنا اللہ تعالیٰ بسرہ الاقدس نے ایک مکتوب گرامی میں، (جو کہ مکتوبات کی کسی شامل نہیں ہے) لکھا ہے کہ حقیقت کعبہ ذات واجب تعالیٰ ہے اس لئے کہ مسجود، حقیقت میں وہی مقدس مرتبہ ہے۔ لہٰذا جاننا چاہیئے کہ مسجود اگرچہ ذات بیچون ہے لیکن اعتبار مسجودیت کو اس کے ساتھ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس لئے مرتبۂ احدیت، ذات سے جو کہ نسبتوں اور اعتبارات سے پاک ہے، نیچے کے درجے میں ہوگا، وہی دیدو دانش و گرفتاری سے متمیز ہو جائے گا۔

حقیقت کعبہ سے مراد ذات بے چون واجب الوجود ہے:

مکتوبات امام ربانی دفتر سوم مکتوب ۱۲۴ میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اے بھائی! جب تم نے صورت کعبہ کا تھوڑا بیان سن لیا تو اب حقیقت کعبہ کے بارے میں بھی تھوڑا سا سن لو: حقیقت کعبہ سے مراد ذات بے چون واجب الوجود (یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات) ہے کہ ظہور اور ظلیت کی گرد بھی وہاں تک نہیں پہنچتی اور جو مسجودیت و معبودیت کی شان کے لائق ہے۔ پھر آگے فرماتے ہیں کہ اس حقیقت جل سلطانہ کو اگر حقیقت محمدی ﷺ کا مسجود کہیں تو اس میں کیا خطرہ لازم آتا ہے اور آپ ﷺ کی افضلیت میں اس سے کس طرح قصور واقع ہوتا ہے؟ وہاں حقیقت محمدی ﷺ باقی تمام افراد عالم کے حقائق سے افضل ہے لیکن حقیقت کعبہ معظمہ عالم کی جنس سے نہیں ہے تاکہ اس کی طرف یہ نسبت ظاہر کی جائے اور اس کی فضیلت میں توقف کیا جائے۔ سجدے کی شان تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، اسی کو سجتا ہے کہ لوگ اسے سجدہ کریں۔ اسی لئے اگر یہ سوال کیا جائے کہ حقیقت محمدی ﷺ اور حقیقت کعبۂ ربانی میں کون افضل ہے؟ تو فرماتے ہیں کہ بیت اللہ شریف کی حقیقت افضل ہے اس لئے کہ حقیقت کعبۂ ربانی، اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، یہ اسی کی تجلیات ہیں اور حقیقت محمدی ﷺ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات ہے۔ بحر حال اگر

حقیقت کو دیکھیں تو بیت اللہ کی تجلیات کو فوقیت ہو گی۔ اسی بات کو حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مکتوبات معصومیہ کے دفتر دوم میں فرماتے ہیں، کسی نے ان سے پوچھا کہ ہمارے حضرت عالی یعنی حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ قدس سرہ نے تحریر فرمایا ہے کہ حقیقت کعبۂ ربانی، حقیقت محمدی ﷺ کے اوپر ہے۔ اس سے حقیقت کعبہ کا حقیقت محمدی ﷺ سے افضل ہونا لازم آتا ہے حالانکہ آں سرور عالم علیہ و علی آلہ الصلوٰۃ والسلام تمام مخلوقات سے افضل ہیں۔ لولاہ لما خلق الأفلاک و لما أظهر الربوبیة۔ (کشف الاخفاء) یعنی ”اگر وہ نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ آسمانوں کو پیدا نہ کرتا اور اپنے رب ہونے کو ظاہر نہ فرماتا“ جیسا کہ حدیث قدسی میں وارد ہوا ہے۔ جواب میں حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اول یہ کہ حقیقت کعبۂ ربانی معبودیت و مسجودیت کے مقام سے پیدا ہوتی ہے اور آں سرور علیہ و علیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کامل عبدیت و عابدیت (بندہ اور بندگی کرنے والا ہونے) کے مقام میں ہیں، اس بنا پر ہو سکتا ہے کہ حقیقت کعبہ ذات الٰہی جل سلطانہ ہو کیونکہ حقیقت میں معبود یعنی وہ حقیقت، اس صورت کی مسجودیت کا منشاء ہے ور اس میں شک نہیں ہے کہ وہ حقیقت ذات حق عز برھانہ ہے۔ پس اگر اس حقیقت کو حقیقت محمدی ﷺ پر فوقیت و فضیلت ہو تو کیا خطرے کی بات ہے۔

یہاں کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ چونکہ کعبۂ معظمہ کی ظاہری صورت ممکنات میں سے ہے تو کیا اس کی حقیقت ممکنات میں سے نہیں ہو گی؟ حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مکتوبات معصومیہ کے دفتر دوم میں فرماتے ہیں ”اور یہ جو بعض حضرات کہتے ہیں کہ ممکن، جو کہ صورت کعبہ ہے اس کی حقیقت بھی ممکن ہی ہونی چاہیئے وہ ذات کس طرح ہو گی؟

جواب: صاحب شفاء القلوب فرماتے ہیں کہ اس بزرگ گروہ کے طریقے پر کسی چیز کی حقیقت اس چیز کی ذات اور ما بہ الشئ ھو ھو ماہیت سے عبارت نہیں ہے بلکہ اس کے وجودی و توابع وجودی، فیوض کے مبداء سے عبارت ہے اور وہ چیز اس کے لئے علت کی مانند ہے۔ ایک کعبۂ معظمہ کی ظاہری صورت ہے جو کہ ہمیں نظر آتی ہے، یہ ممکنات میں سے ہے اور عالم خلق سے اس کا تعلق ہے اگر کعبۂ معظمہ کے ظاہر کی ذات اور ماہیت کو دیکھا جائے تو پتھر اور اینٹ نظر آئیں گے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ممکن کی حقیقت سے مراد یہ ظاہری ماہیت ہو جو ہمیں ظاہر کی آنکھوں سے نظر آتی ہے بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ اس فیوضی برکات کی مبدا یعنی اصل کیا ہے اور وہ اللہ رب العزت کی ذات کی تجلیات ہیں۔ اللہ کی ذات ہی کعبۂ معظمہ کی حقیقت ہے جیسے کہ ہم نے اوپر پڑھا، اس لئے امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ حقیقت کعبہ سے مراد وہ ذات ہے جو بے چون واجب الوجود یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ حقیقت کعبۂ ربانی کا تعلق ہیئت وحدانی کے ساتھ مخصوص ہے۔

حقیقت کعبۂ ربانی اور ہیئت وحدانی:

مکتوبات امام ربانی دفتر اول مکتوب ۲۶۰ میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں ہ بعض کامل مرادمند ایسے ہیں جن کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے طفیل عظمت و کبریائی کے ان پردوں میں جگہ دی جاتی ہے اور ان کو محرم بارگاہ بنایا جاتا ہے۔ فعومل ماعومل معھم "ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جاتا ہے جو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ کیا گیا"۔

اے فرزند! یہ معاملہ انسان کی اس ہیئت وحدانی کے ساتھ مخصوص ہے جو عالم خلق اور عالم امر کے مجموعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ باوجود اس کے ان سب کا سردار اس مقام میں عنصر خاک ہے۔

ہیئت وحدانی:

صاحب شفاء القلوب فرماتے ہیں: ہمارے مشائخ نے اس کو ایسے سمجھایا ہے کہ سالک کو جب فنا حاصل ہو جاتی ہے ور اس کے دس لطائف کا تصفیہ اور تزکیہ ہو جاتا ہے تو لطائف میں جو اعتدال پیدا ہوتا ہے ان لطائف کے مجموعہ کو "ہیئت وحدانی" کہتے ہیں۔ ہم نے پڑھا تھا کہ جس طرح سارے لطائف ایک بن جاتے ہیں یعنی سب کو اکٹھا کر دیا جائے تو اس طرح سارے لطائف ایک بن جاتے ہیں اور ایک دوسری شکل پیدا کر کے اگلے مقامات پر عروج کرتے ہیں۔

حقائق ثلاثہ کے وصول کا تعلق:

حقیقت کعبۂ ربانی، حقیقت قرآن مجید اور حقیقت صلوٰۃ کو "حقائق ثلاثہ" کہتے ہیں اور جو دوسرا راستہ ہے اس میں چار حقائق آتے ہیں جو کہ حقیقت ابراہیمی علیہ السلام، حقیقت موسوی علیہ السلام، حقیقت محمدی ﷺ اور حقیقت احمدی ﷺ ہیں۔

جب بھی حقائق ثلاثہ کہیں گے تو فوراً سمجھ لیں کہ ان سے حقیقت کعبۂ ربانی، قرآن مجید اور نماز مراد ہیں۔ مکتوبات معصومیہ دفتر سوم مکتوب ۱۴۰ میں تحریر فرماتے ہیں: آپ نے لکھا تھا کہ حقائق ثلاثہ (کعبہ، قرآن اور نماز) تک وصول تفضل (فضل وکرم) میں داخل ہے یا نہیں؟

جواب: ان حقائق کا معاملہ کمالات نبوت سے اوپر ہے اس لئے داخل تفضل ہونا چاہیئے۔

ہر مسجد میں ظہور حقیقت کعبۂ ربانی:

مصنف "کنز الهدایات" حضرت مفتی محمد باقی لاہوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے شیخ حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے نقل کرتے ہیں، لکھتے ہیں کہ عبد ضعیف نے حضرت پیر دستگیر اپنے امام یعنی حضرت خواجہ محمد معصوم قدسنا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بسرہ السامی کی موتی بکھیرنے

والی زبان مبارک سے سنا ہے کہ ہر مسجد میں کعبۂ معظمہ کی حقیقت کا ظہور ہوتا ہے یعنی رب العزت کی جو تجلیات ذاتیہ وہاں وارد ہوتی ہیں ان ہی کی شعاعیں ہر مسجد کے اندر نازل ہوتی ہیں اور نماز پڑھنے والوں کے دلوں کو منور کرتی ہیں بلکہ نماز پڑھنے والا بندہ جب تک نماز پڑھتا رہتا ہے اس کے سامنے ذات منکشف رہتی ہے، چونکہ مسجد کے اوپر تجلیات وارد ہو رہی ہوتی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنا گھر کہا ہے، اس لئے جب قیامت قائم ہو گی تو زمین کے وہ ٹکڑے جو مسجدیں ہیں ان سب کو بیت اللہ کا حصہ بنا کر جنت میں شامل کر دیا جائے گا۔ یہ کوئی معلومی بات نہیں ہے کہ فلاں جگہ پر اللہ تعالیٰ کا گھر بن گیا، بلکہ امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تو فرماتے ہیں کہ نماز اتنی اہم عبادت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تجلی اس کے سامنے جلوہ گر رہتی ہے، جب بندہ اپنی جگہ سے اُٹھتا ہے تب تجلی گھٹتی ہے۔ جتنی دیر بیٹھ کے نماز کے بعد تلاوت کرتا ہے، تسبیحات پڑھتا ہے اور مراقبہ کرتا ہے ذات کی تجلی رہتی ہے۔

حقیقت کعبۂ ربانی سے حقیقت قرآن مجید تک:

”ھدایۃ الطالبین“ میں حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مقام یعنی حقیقت کعبہ پر حضرت حق سبحانہ کی عظمت اور کبریائی مشہود ہوئی اور میرے باطن پر ایک عظیم ہیئت طاری ہوئی۔ فرماتے ہیں کہ جب حضرت پیر دستگیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس عاجز پر قرآن مجید کی حقیقت میں توجہ فرمائی تو میں نے اس مقام پر عظمت و کبریائی کے شاہی پردوں کے اندر اپنے آپ کو پایا اور عالم مثال میں ایسا دیکھا کہ گویا میں خانۂ کعبہ کی چھت پر چڑھ گیا ہوں اور وہاں ایک زینہ رکھا ہوا ہے، میں اس زینے سے عروج کر کے حقیقت قرآن مجید میں داخل ہو گیا۔

حضرت شاہ ابوسعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ "ھدایۃ الطالبین" میں تحریر فرماتے ہیں: "حقیقت قرآنی سے مراد حضرت ذات کی بے چونی وبے کیفی کی وسعت و فراخی ہے، حضرت ذات سبحانہ کی وسعت اسی مقام سے شروع ہوتی ہے اور ایسے حالات و کیفیات ظاہر ہوتے ہیں جو وسعت کے مشابہ ہیں، ورنہ اس مقام پر لفظ ووسعت کا اطلاق میدان کی تنگی ہے پس خوب سمجھ لو اور کسی قسم کی کوتاہی نہ کرو۔

اس مقام پر کلام اللہ تعالیٰ کے مخفی راز ظاہر ہوتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ لکل اٰیۃ من القراٰن ظھر و بطن: "قرآن کی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے"۔ پھر اس کے ہر باطن کے آگے سات باطن ہیں تو مشائخ صوفیہ نے اس روایت کو نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ ظاہر کے معنیٰ ہیں، یہ تو ہم سمجھتے ہیں، اس کے آگے اور بھی معارف ہیں، ان معارف کے سمجھنے کا تعلق دل کی نورانیت کے ساتھ ہے، جتنی نورانیت ہوگی، اس کے باطن کے معارف بھی اتنے زیادہ ہوں گے۔ آگے فرماتے ہیں: میں نے قرآن مجید کے حروف میں سے ہر حرف کو ایک بے پایاں سمدر پایا، جو کعبہ تک پہنچانے والا ہے مگر ایک عجیب تر نکتہ سنو! باوجود ان تمام مختلف قصص وحکایات اور اوامر ونواہی، قرآت کے وقت بہت سی چیزیں ظاہر ہوتی ہیں، بہت سے اسرار کھلتے ہیں اور حق سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت، حکمت اور اس کے اسرار ظاہر ہوتے ہیں۔ غور کرو تمام عوام کی نصیحت و تعلیم کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام کے قصص وحکایات کا کیوں ذکر کیا گیا ہے؟ بنی آدم کی ہدایت کے لئے احکام شریعت کیوں بیان فرمائے گئے ہیں؟ اور قرآن مجید کے حروف کے اندر کیا کیا کیفیات اور معاملات ہیں؟ کہ حیرت پر حیرت ہوتی ہے، وہ ہر حرف میں ایک خاص شان کے ساتھ ظہور فرماتا ہے اور طالبین حق کے دلوں کو معارف سے لبریز کر دیتا ہے۔ بقول شاعر!

نہ حسنش غایتے دارد، نہ سعدی را سخن پایاں   بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

نہ اُس کے حُسن کی حد ہے نہ سعدی کی زباں گونگی

نہ خالی ہوگا دریا خواہ، کہ مر ہی جائے مستسقی

اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ ایک ایک حرف کے اندر ہمارے مشائخ پر کیا کیا راز کھلے ہیں۔ چنانچہ حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ "هداية الطالبين" میں فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کی قراءت کے وقت پڑھنے والے کی زبان شجرۂ موسوی کا حکم رکھتی ہے یعنی جس کو حقیقت قرآن مجید کا مراقبہ کرنے کی سعادت ملے اور اس کو پورا فیض ملے تو وہ کئی مرتبہ قاری کے منہ سے نور کا اخراج ہوتا ہوا آنکھوں سے دیکھتا ہے جیسے شجرۂ موسوی سے آگ نکلتی نظر آرہی تھی۔ ایسے ہی قاری کی زبان سے قرآن کا نور نکل رہا ہو تو اہل کشف کو محسوس ہوتا ہے کہ شاید ایک روشنی ہے جو وہاں سے نکل رہی ہے۔ ہمارے مشائخ نے فرمایا ہے کہ شاید یہی وجہ ہے کہ قاری قرآن پڑھتا ہے تو حدیث پاک کے مطابق فرشتے اس کے قریب آتے ہیں، حتیٰ کہ قریب آکے اس قاری کے منہ پر اپنا منہ رکھ دیتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے منہ کو بوسہ دیتے ہیں، یہ انسان کتنا خوش نصیب ہے جس کے منہ سے ایسا نور نکلتا ہے، ہم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ قرآن مجید کی تلاوت کے وقت کیا کیفیات ہوتی ہیں، اسی لیئے فرمایا:

تبرک بالقرآن فانه كلام الله خرج منه۔ (كنز العمال: ٢٣٤٦)

"قرآن سے تم تبرک پاؤ کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس کی طرف سے صادر ہوا ہے" آگے فرماتے ہیں کہ: اس مقام پر حضرت ذات کی بے چونی، جو مبدأ وسعت ہے اس کا مراقبہ کیا جاتا ہے اور ان مقامات کا مورد فیض سالک کی ہیئت وحدانی ہے۔

حقیقت کعبہ ٔربانی حقیقت قرآن سے بلند ہے:

مکتوبات دفتر اول مکتوب ۲۵۵ میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک رسالہ میں یہ تحریر دیکھی ہے کہ حضرت خواجہ احرار قدس سرہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ قرآن، بحقیقت از مرتبہ ٔعین جمع است (یعنی قرآن مجید، حقیقت میں مرتبہ ٔعین سے جمع ہے) یعنی ذات تعالیٰ و تقدس کی احدیت سے ہے، لہٰذا جو کچھ رسالہ "**مبدأو معاد**" میں تحریر کیا گیا کہ حقیقت کعبہ ربانی حقیقت قرآنی سے بلند وبالا ہے، اس کے معنی کیا ہوں گے؟

اس کے جواب میں فرماتے ہیں: میرے مخدوم! احدیت ذات سے مراد احدیت مجردہ نہیں ہے کہ جس میں کوئی صفت و شان ملحوظ نہ ہو کیونکہ حقیقت قرآن کا منشاء صفت کلام سے ہے جو صفات ثمانیہ (آٹھ صفات) میں سے ایک صفت ہے اور حقیقت کعبہ کا مبدأ و منشاء وہ مرتبہ ہے جو شیونات و صفات کی تلوینات سے برتر ہے، اس لئے اس کی فوقیت کی گنجائش ہو گی۔

چنانچہ **مکتوبات مجددیہ دفتر سوم مکتوب ۷۷** میں فرماتے ہیں کہ نور صرف (خالص نور) کے بعد جس کو اس فقیر نے حقیقت کعبہ ٔربانی پایا ہے کہ یہ ایک نہایت ہی عالی مرتبہ ہے جو کہ حق تعالیٰ سلطانہ کے مطابق کعبہ ٔمعظمہ آفاق کا قبلہ بنا اور تمام مخلوق کے مسجود ہونے کی دولت سے مشرف ہوا۔

لہٰذا امام قرآن مجید ہے، ماموم یعنی مقتدی، پیش معظمہ ہے اور یہ مرتبہ ٔمقدسہ حضرت ذات تعالیٰ و تقدس کی بے چون وسعت کا مبدا ہے۔ اور اس بارگاہ کی بے چونی و بے چگونی کے امتیاز کا مبدأ بھی یہی درجہ ٔعالیہ ہے۔ اس درجہ ٔمقدسہ کی وسعت و عظمت اس کے طول و عرض کی درازی کی وجہ

سے نہیں ہے کیونکہ وہ نقص وامکان کی علامت ہے بلکہ یہ ایک ایسا امر ہے کہ جب تک اس کے ساتھ متحقق نہ ہو (یعنی جب تک اس مقام تک نہ پہنچے) معلوم نہیں ہو سکتا۔

"ھدایة الطالبین" میں حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

نسبت کی بلندی اس مقام (یعنی حقیقت قرآن مجید پر) پر تو اس درجہ کی ہے کہ گویا نہ صرف کمالات کی نسبت اپنی بلندی اور وسعت کے باوجود بلکہ حقیقت کعبۂ معظمہ بھی (عظمت و کبریائی کے باوجود) حقیقت قرآن مجید کے تحت میں نظر آتی ہے اس مقام پر حضرت ذات کی بے چونی، جو مبدا وسعت ہے، اس کا مراقبہ کیا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دفتر سوم مکتوب ۱۲۸ میں بھی فرماتے ہیں: حقیقت قرآنی کا اس مقام میں ظاہر ہونا، جو کہ معبودیت صرفہ ہے، محل تامل ہے جیسا کہ پوشیدہ نہیں ہے اور نیز حقیقت قرآنی ہمارے حضرت عالی (مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ قدس سرہ) کے مطابق حضرت ذات تعالیٰ کی وسعت بیچون کا مبداء ہے اور یہ حقیقت ذات مجردہ پر زائد ہے، پس معبودیت صرفہ کے لائق نہیں ہو گی اور اس بارگاہ عالی سے نیچے ہو گی۔ اس بیان سے وہ شبہ ساقط ہو گیا جو کہ وارد کیا گیا تھا کہ حقیقت قرآن حقیقت کلام یا شایان کلام سے پیدا ہوتی ہے، اس لئے ولایت کبریٰ میں داخل ہو گی کیونکہ یہ معنی کہ وسعت بے چون کا مبدا حضرت ذات تعالیٰ ہے، ولایت سہ گانہ و کمالات نبوت و حقیقت کعبہ سے بالاتر ہے۔

قرآن مجید کے انوارات کے انکشاف کی علامت دل پر ثقل:

حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ "ھدایة الطالبین" میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس طرح قرآن کریم کی سماعت ہے کہ اگر خوش الحان شخص سے سنا جائے تو نسبت ولایت کا ظہور ہوتا ہے اور

اگر درست پڑھنے والے سے سنا جائے تو فوق کی نسبت حقائق ظہور کریں گے کیونکہ خوش آوازی کو قلب سے پوری پوری مناسبت ہے جو ضرور ظاہر ہوگی اور اگر الفاظ کی فصاحت، صحیح مخارج کی ادائیگی اور ترتیل کے ساتھ پڑھا جائے خواہ خوش آواز نہ بھی ہو تب بھی وہ حقائق فوقانی جلوہ گر ہوں گے"۔

چنانچہ اس سبق پر اگر ترتیل، الفاظ کی صحت اور مخارج سے قرآن مجید کی تلاوت کی جائے تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حقائق نصیب ہوتے ہیں۔

مصنف "کنز الھدایات" حضرت مفتی محمد باقی لاہوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ "حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بن حضرت خواجہ سیف الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی موتی بکھیرنے والی زبان (مبارک) سے میں نے سنا ہے کہ قرآن مجید کے انوار کے انکشاف کی علامت غالباً عارف کے دل پر ایک ثقل (بوجھ) کا وارد ہونا ہے، گویا آیت کریمہ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا (المزمل ۵) میں اس معرفت کی طرف اشارہ ہے،یعنی جو شخص حقیقت قرآن مجید کا مراقبہ کرتا ہے، مراقبہ کے دوران اس کو ایک ثقل محسوس ہوتا ہے، یہ اس بات کی بین دلیل ہے کہ قرآن مجید کا فیض مل رہا ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کو بھی بوجھ محسوس ہوتا تھا حتیٰ کہ اگر اونٹنی پر سوار ہوتے تھے تو وہ بیٹھ جاتی تھی اور جو بندہ قریب ہوتا تھا اگر اس کی ران پر ٹیک لگائے ہوتے تو وہ ٹوٹنے کو آتی تھی تو یہ بوجھ سالک بھی محسوس کرتا ہے۔

سالک حقیقت کی طرف متوجہ رہے یا صورت کی طرف:

کسی نے حضرت خواجہ معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے پوچھا کہ، "اگر کعبہ یا قرآن مجید کی طرف متوجہ ہو تو ان کی حقیقت کی طرف متوجہ ہو یا ان کی صورت کی طرف، اگر ان کی حقیقت کی طرف متوجہ ہو تو وہ شخص جو ان کی حقیقت تک نہیں پہنچا ہے وہ کس طرح ان کی حقیقت کی طرف متوجہ ہو

گا اور اگر ان کی صورت کی طرف متوجہ ہو تو یہ بات قرآن مجید کے بارے میں تو درست ہو سکتی ہے کیونکہ وہاں الفاظ و معانی اور قصص ہیں لیکن کعبہ کے بارے میں ذرا بھی درست نہیں آتی کیونکہ محض سنگ و کلوخ کو قبلہ نہیں بنا سکتے، خاص کر اس کے سامنے نہ ہونے (کے وقت) میں"۔

مکتوبات معصومیہ کے دفتر دوم مکتوب ۱۱۹ میں حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جواب دیتے ہیں: "اے سعادت آثار! نمازی کو چاہیئے کہ اس کی صورت کی طرف متوجہ ہو، اگر وہ اہل حقیقت میں سے ہے تو وہ صورت سے حقیقت کی طرف چلا جاتا ہے اور حقیقت کو صورت میں دیکھتا ہے اور اگر وہ اہل حقیقت میں سے نہیں ہے تو صورت کی طرف متوجہ ہونا بھی اس کے لئے غنیمت ہے۔ اور یہ جو لوگوں نے پتھروں اور ڈھیلوں کو کعبہ کی صورت قرار دیا ہے ایسا نہیں ہے کیونکہ اگر پتھر اور ڈھیلے درمیان میں نہ ہوں اور چھت اور دیواریں بھی نہ ہوں، کعبہ تب بھی کعبہ ہی ہے اور مخلوقات کا مسجود الیہا ہے بلکہ صورت کعبہ ایک ایسا معنی ہے کہ عقلیں اس کو سمجھنے سے عاجز ہیں۔ یہ صورت، حقیقت کی صفت رکھتی ہے اور حقیقت کعبہ اس سے ماوراء ہے جبکہ عقلیں اُس صورت کو سمجھنے سے عاجز ہیں، تو وہ حقیقت تک کیا پہنچیں گی، اس کی جہت کی طرف توجہ کرنے سے ہی کعبہ کی برکات سے فیض یاب اور اس کی حقیقت سے بہرہ مند ہونا ہے۔

حقیقت کعبہ اور حقیقت قرآن، حقیقت نماز کا جزء:

مکتوبات مجددیہ دفتر سوم مکتوب ۷۷ میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس مرتبۂ مقدسہ (یعنی حقیقت قرآن مجید) کے اوپر ایک بہت بلند مرتبہ ہے جس کو حقیقت صلوٰۃ کہتے ہیں اور عالم شہادت میں اس کی صورت مصلیان ارباب نہایت (منتہی نمازیوں) کے ساتھ قائم ہے۔ آگے فرماتے ہیں: اس مرتبۂ مقدسہ میں کمال درجہ وسعت اور امتیاز بے چون ہے کیونکہ اگر "حقیقت کعبہ" ہے تو وہ

بھی اسی (یعنی حقیقت نماز) کا جزو ہے اور اگر "حقیقت قرآن" ہے تو وہ بھی اسی کا حصہ ہے کیونکہ نماز، مراتب عبادات کے ان تمام کمالات کی جامع ہے جو اصل الاصل کی نسبت سے ثابت ہے کیونکہ معبودیت صرفہ اسی کے لئے ثابت ہے۔

حقیقت قرآن اور حقیقت نماز:

حضرت خواجہ معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے صاحبزادے حضرت شیخ عبد الاحد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مکتوبات معصومیہ میں دفتر سوم مکتوب ۱۴۰ میں تحریر فرماتے ہیں: فرزند ارجمند شیخ عبد الاحد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے پوچھا ہے کہ حقیقت قرآنی مبداء وسعت بے چونی ذات تعالیٰ سے عبارت ہے، آپ بیان کریں کہ حقیقت صلوٰۃ کس اعتبار و شان سے عبارت ہے، آپ جان لیں کہ حضرت عالی (مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ قدس سرہ) نے حقیقت صلوٰۃ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس مقام میں کمال وسعت بے چونی ہے، پس حقیقت قرآنی مبداء وسعت ہے اور اس جگہ (حقیقت صلوٰۃ میں) کمال وسعت ہے، لیکن اس کو ماننے کی صورت میں شبہ وارد ہوتا ہے کہ مبداء شیئ کو شیئ پر سبقت و فوقیت حاصل ہے، پس حقیقت قرآنی، حقیقت قرآن پر مقدم ہونا چاہیئے، حالانکہ انہوں نے (مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے) حقیقت صلوٰۃ کو حقیقت قرآنی سے اوپر لکھا ہے۔ جواب میں خواجہ معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: ہو سکتا ہے کہ یہ مبداء ہونا سالک کے عروج کی جانب میں ہو یعنی عروج کے مدارج میں وسعت کا شروع حقیقت قرآنی سے ہو اور اس کا کمال اوپر کی حقیقت میں ہو اور اس اعتبار سے مبداء ہونے کی تاخر ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ تفوق دونوں جانب سے ہے (اور) دو اعتبار سے ہے، حقیقت قرآنی چونکہ حقیقت صلوٰۃ کا جزو ہے جیسا کہ حضرت عالی (مجدد قدس سرہ) نے لکھا ہے کہ اگر حقیقت کعبہ ہے تو اس کا جزو ہے اور اگر حقیقت قرآنی ہے تو وہ بھی

اس کا جزو ہے، کیونکہ نماز عبادات کے تمام کمالات و مراتب کی جامع ہے کہ اصل الاصل کی نسبت کے ساتھ ثابت ہے اور (اس میں) شک نہیں ہے کہ جز کو کل پر تقدم حاصل ہے اور کل کو فضیلت حاصل ہے کیونکہ کل اس جزو پر بھی مشتمل ہے اور دوسرے اجزاء پر بھی۔ پس ظاہر کے اعتبار سے جزو کو اور باطن اور مرتبے کے اعتبار سے کل کو فوقیت حاصل ہے۔

نماز کی لذت میں نفس کا دخل نہیں:

مکتوبات دفتر اول مکتوب ۱۳۷ میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک اور خاص بات کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ "وہ لذت جو عین نماز کی حالت میں حاصل ہوتی ہے اس میں نفس کا بھی کچھ فائدہ نہیں ہے بلکہ وہ عین اس لذت کے وقت نالہ وفغاں میں ہوتا ہے"۔

وہ فرماتے ہیں کہ نماز ایسی عبادت ہے کہ نفس کو اس میں لذت مل ہی نہیں سکتی، اگر ملتی ہے تو دل کی لذت ہوتی ہے۔ اس مکتوب میں عجیب عبارت لکھی ہے کہ پہلے ذوق و شوق ہوتا ہے جو ولایت کے درجات ہیں اور جو ولایت انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہے اس میں بے حلاوتی ہو جاتی ہے، حیرت ہو جاتی ہے اور قرب بڑھ جاتا ہے۔

حقیقت صلوٰۃ کے متعلق اشارات:

مکتوبات مجددیہ دفتر دوم مکتوب ۸۷ میں فرماتے ہیں:

كان رسول الله ﷺ دائم الحزن متواصل الفكر۔

"رسول اللہ ﷺ متواتر مغموم فکر مند رہتے تھے"۔

ان بزرگوں کی لذت، محبوب کی اطاعت میں ہے اور بس! اور ان کا اُنس اس کی بندگی پر موقوف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد پاک ہے: **أرحني يا بلال** "اے بلال (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)!

مجھے راحت پہنچاؤ'' میں اسی طرف اشارہ ہے اور قرۃ عینی فی الصلوٰۃ ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے'' اسی کی ایک رمز ہے، دوسرے حضرات شہود کی لذت کے ساتھ لطف اندوز ہوتے ہیں اور وصال کے خیال پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ ان حضرات نے اس شہود سے آنکھ بند کی ہوئی ہے اور اس وصال کو خیال تصور کر کے غیب کے ساتھ، جو کہ شہود پر ہزاروں درجہ فضیلت رکھتا ہے مطمئن ہیں اور کمر ہمت کو اس کی بندگی پر چست باندھے ہوئے ہیں تحریمہ اولیٰ (تکبیر اولیٰ) کو جسے وہ امام کے ساتھ پاتے ہیں، تجلیات و ظہورات سے بہتر جانتے ہیں اور خشوع (عاجزی) اور سجدہ کی جگہ پر نگاہ جمانے کو، کہ حدیث شریف متع بصرک بموضع سجودک ''تو اپنی نگاہ کو اپنے سجدہ کی جگہ پر رکھ'' جس پر دال ہے، اور آیت کریمہ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ (١) الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ (المومنون ٢) وہ مومنین کامیاب ہوئے جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں''۔ جس کی مخبر ہے، شہود و مشاہدہ سے زیادہ تصور فرماتے ہیں۔ نماز اسی (ظاہری) صورت پر موقوف نہیں ہے (بلکہ) عالم غیب الغیب میں ایک حقیقت رکھتی ہے جو کہ تمام حقیقتوں سے بلند اور مشاہدات و تجلیات سے بالاتر ہے۔ مشاہدہ کی حدیث (قدسی) شریف قف یا محمد فان اللہ یصلی ''اے محمد ﷺ! ٹھہر جایئے پس بے شک اللہ تعالیٰ نزول رحمت میں ہے'' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس قدر اس (نماز) کی (ظاہری) صورت کی تکمیل میں کوشش کی جائے اور خشوع و آداب کو کامل طور پر ادا کرنے میں کوشش کی جائے، اس حقیقت کے ساتھ (اسی قدر) مناسبت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اسی برکات سے بہت زیادہ بہرہ ور ہو جاتا ہے اور جو شخص کہ شہود کی بندش اور ظہورات کی قید میں ہے اس حقیقت سے محروم و مستور ہے، اسی بناء پر اس کی صورت کی تکمیل کو، جو کہ حقیقت کی طرف

ایک راستہ رکھتی ہے، مشاہدات و تجلیات سے بہتر سمجھتا ہے اور بلند ہمتی کے باعث ان پر قناعت نہیں کرتا۔

حقیقت نماز میں مختلف کیفیات:

"ھدایۃ الطالبین" میں حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ جو سالک اس حقیقت مقدسہ سے بہرہ ور ہوا، وہ اقامت صلوٰۃ کے وقت گویا اس دنیا سے باہر آجاتا ہے اور دوسری دنیا (یعنی عالم غیب) میں چلا جاتا ہے اور رؤیت اخروی کے مشابہ حالت حاصل کر لیتا ہے، تکبیر تحریمہ کے دوران دونوں جہان سے ہاتھ اُٹھا کر اور ان کے کو پس پشت ڈال کر اللہ اکبر کہتا ہوا حضرت سلطان ذیشان جل جلالہ کے حضور حاضر ہوتا ہے اور حضرت حق جل جلالہ کی عظمت و کبریائی کی ہیبت سے خود کو محض ذلیل اور ناچیز سمجھ کر محبوب حقیقی پر قربان ہو جاتا ہے اور قراءت کے وقت وجود مرہوب ہو، جو اس مقام کو سزاوار ہے، موجود ہو کر حضرت حق سبحانہ کے ساتھ متکلم اور اس جناب مقدس سے مخاطب ہوتا ہے یعنی جب قراءت کر رہا ہوتا ہے تو حدیث پاک میں بھی ہے کہ بندہ اپنے رب سے ہم کلام ہوتا ہے، جب بندہ کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِینَ (الفاتحہ ۱) تو اللہ تعالیٰ ہی فرماتا ہے: حمدنی عبدی (صحیح مسلم ۳۹۵) "میرے بندے نے میری حمد بیان کی" پھر فرماتے ہیں: گویا اس کی زبان شجرۂ موسوی بن جاتی ہے جیسا کہ حقیقت قرآن مجید کے سلسلے میں ذکر ہوا اور جب وہ رکوع میں جاتا ہے اور حد درجہ خشوع ظاہر کرتا ہے تو مزید قرب سے ممتاز ہو جاتا ہے اور تسبیح پڑھتے وقت ایک خاص کیفیت سے مشرف ہوتا ہے، پھر نعمت پر شکر کرتا ہوا قومہ کرتا ہے اور حضرت حق سبحانہ کے حضور میں سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے، قومہ کا راز جیسا کہ میری فہم ناقص میں آیا ہے، یہ کہ چونکہ اب ادائے سجود کا قصد رکھتا ہے سا لئے قیام کے بعد سجدے میں

جانا مزید عاجزی کا موجب ہے، جب وہ رکوع سے سجدے میں جاتا ہے تو سجہ ادا کرتے وقت جو قرب اسے حاصل ہوتا ہے وہ نا قابل بیان ہے، عقل اس کے ادراک سے عاجز اور قاصر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری نماز کا خلاصہ سجود ہی سجود ہے۔ حدیث قدسی میں ہے کہ سجدہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے دو قدموں پر سجدہ کرتا ہے اور یہ آیت کریمہ:

وَاسۡجُدۡوَاقۡتَرِبۡ (العلق ۱۹)

ترجمہ: اور سجدہ کرو اور ہم سے قریب ہو جاؤ۔

اسی قرب کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ:

سر در قدمش بر دہر بار چہ خوش باشد

راز دل خود گفتن با یار چہ خوش باشد

سر کو ہر بار اس کے قدموں پر جھکانا خوب ہے   اس کے آگے دل کی باتیں لب پہ لانا خوب ہے

نماز کے سنن و آداب بجالانے کے حقائق کا حصول:

صاحب شفاء القلوب فرماتے ہیں کہ جب نماز ادا کرتے وقت سنن اور آداب کو، جیسا کہ چاہیئے بجالایا جاتا ہے مثلاً نماز کے آداب میں سے ہے کہ نماز میں قیام کے وقت سجدے کی جگہ پر نظر رکھے اور رکوع میں دونوں قدموں پر، سجدے میں ناک کی نرمی پر، قعود (بیٹھنے) میں دونوں گھٹنوں پر، اور اسی طرح دوسرے تمام آداب کی بھی رعایت کرے تو ضرور حقیقت نماز جلوہ فرماتی ہے اور یہ کہ بعض لوگ حضور اور جمعیت کے لئے قیام میں آنکھیں بند کر کے متوجہ ہوتے ہیں، ان چیزوں سے لطائف کا حضور تو البتہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن فوق کی نسبتوں کے ظہور کے لئے آنکھیں بند کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہاں ہر قسم کا حضور قالب ہی کے لئے ہوتا ہے اور قالب کا حضور سنت کے مطابق

آداب کی رعایت سے ہوتا ہے اور نماز کے قیام میں آنکھوں کو بند کرنا خلاف اولیٰ ہے اگرچہ حضوری توجہ کے لئے جائز کیا گیا ہے"۔ **مکتوبات معصومیہ دفتر دوم مکتوب ۷۸** میں حضرت مجدد الف ثانی اسی بات کو سمجھاتے ہیں کہ "نماز اسی ظاہری صورت پر موقوف نہیں ہے بلکہ عالم غیب میں ایک حقیقت رکھتی ہے جو کہ تمام حقیقتوں سے اوپر اور مشاہدات و تجلیات سے بالاتر ہے"۔

پھر آگے فرماتے ہیں: "جس قدر اس (نماز) کی (ظاہری) صورت کی تکمیل میں کوشش کی جائے اور خشوع اور آداب کو کامل طور پر ادا کرنے میں جدوجہد کی جائے اس حقیقت کے ساتھ (اس قدر) مناسبت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس کی برکات سے بہت مستفید ہو جاتا ہے"۔

۳۰) نیت مراقبہ معبودیت صرفہ: فیض می آید از حضرت ذات بیچون کہ منشاء معبودیت صرفہ است بہ ہیئت وحدانی من بواسطہ پیران کبار۔

توقف۔۔۔روز

ترجمہ: حضرت ذات حق تعالیٰ بے چوں کہ جو منشاء معبودیت صرف ہے سے مشائخ عظام کے وسیلہ جلیلہ سے میری ہیئت وحدانی میں فیض آرہا ہے۔ (توقف روز)

تشریح: یہ مقام مرتبہ صلوٰۃ سے فوق ہے کیونکہ اس کے اوپر محض مرتبہ وجوب ہے۔ حضرت تقدس وتعالیٰ کے مرتبہ تجرد و تنزیہہ کے واسطے سے صادر ہے۔ عارفین کاملین کی سیر قدمی کی نہایت حقیقت صلوٰۃ کی نہایت تک ہے اس کے اوپر معبودیت صرف ہے۔ اس دولت میں کسی کو کسی طرح بھی شرکت کی اجازت نہیں تا کہ اوپر کوئی قدم رکھے یہاں تک تو عبادت و عابدیت کی آمیزش تھی، نظر کی طرح قدم کی بھی گنجائش ہے اور جب معاملہ معبودیت محضہ تک پہنچتا ہے تو قدم کوتاہی کرتا ہے اور اس کی سیر ختم ہو جاتی ہے لیکن بحمدہ تعالیٰ وہاں سیر نظری کی ممانعت نہیں اور عارف کی

استعداد کے مطابق نظر کی اجازت ہے اور یہاں کلمہ طیبہ کی حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے۔ غیر مستحقہ آلہہ کی عبادت کی اس جگہ نفی متصور ہوتی ہے اور معبود حقیقی کا اثبات کہ جس کے سوا کوئی عبادت کے مستحق نہیں، اس مقام میں حاصل ہوتا ہے۔ عابدیت و معبودیت میں فرق بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ مبتدی و متوسط کے حال کے مناسب لاموجود اور **لا مطلوب الا اللہ** ہے۔ اس سے فوق **لا مقصود الا اللہ** ہے، سب سے فوق **لا معبود الا اللہ** ہے۔ اس مقام کے مناسب ہے۔ یہ بھی یاد رکھیئے کہ اس مقام میں ترقی اور نظر میں تیزی عبادت کے واسطہ سے وابستہ ہے۔ دوسری عبادتیں شاید اس کی تکمیل میں مدد کریں **(خلاصہ مکتوب نمبر ۷۷ دفتر سوم)** تفصیل شرح مراقبات میں آئے گی۔ **انشاءاللہ العزیز**۔

صاحب **شفاء القلوب** فرماتے ہیں کہ صرفہ کہتے ہیں خالص کو یعنی یہ خالص معبودیت ہے جو کہ حقیقت نماز سے بھی اونچا مقام ہے۔ حقائق الٰہیہ کی سیر یہاں ختم ہو جاتی ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ مکتوبات ۷۷ میں فرماتے ہیں؛ ''اور ''حقیقت صلوٰۃ'' جو کہ تمام عبادات کی جامع ہے، اس مرتبہ میں وہ (یعنی نماز) اس مرتبۂ مقدسہ کی بھی عبادت ہے جو اس سے اوپر ہے کیونکہ معبودیت صرفہ کا استحقاق بھی اسی مرتبۂ فوق کے لئے ثابت ہے جو کہ ''اصل کُل'' ہے اور سب کی جائے پناہ ہے، اس مقام میں سعت بھی کوتاہی کرتی ہے اور امتیاز بھی راستہ میں رہ جاتا ہے اگرچہ وہ بے چون و بے چگون ہو''۔

جس طرح حقیقت صلوٰۃ کے مرتبہ کی عبادت نماز ہے اسی طرح معبودیت صرفہ کے مقام کی عبادت بھی نماز ہے۔ معبودیت صرفہ کا تعلق قدم سے نہیں، نظر سے ہے، اگرچہ معبودیت صرفہ کے مقام کی عبادت بھی نماز ہے، لیکن حقیقت صلوٰۃ میں اور معبودیت صرفہ کے مقامات میں ایک

بنیادی فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام انبیاء و اولیاء کے قدم صرف حقیقت صلوٰۃ تک ہی پہنچ سکتے ہیں، حقیقت صلوٰۃ کے بعد معبودیت صرفہ کا مقام ہے وہاں سیر نظری تو ہو سکتی ہے لیکن اس مقام پر سیر قدمی کسی کو بھی نصیب نہیں ہو سکتی، قدمی سیر ختم ہو گئی۔ کیونکہ سیر قدمی عابدیت کے مقام تک تھی جو کہ حقیقت صلوٰۃ کا مقام تھا۔ ''اربع انہار'' میں حضرت شاہ احمد سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ''نظر یعنی فکر سے فیض لے سکتا ہے کیونکہ نظر ہر جگہ پہنچ سکتی ہے''۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے مکتوبات کے دفتر سوم مکتوب ۷۷ میں فرماتے ہیں: ''کامل انبیاء و اکابر اولیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات اولاً و آخراً کے اقدام کا منتہا ''حقیقت صلوٰۃ'' کے مقام کی انتہا ہے اور اس مقام سے اوپر معبودیت صرفہ کا مقام ہے، جہاں کسی کو کسی طرح اس دولت میں جرأت نہیں ہے کہ اس سے اوپر قدم رکھ سکے کیونکہ ہر وہ مقام جہاں عبادت اور عبادیت کی آمیزش ہے وہاں تک تو نظر کی طرح قدم کے لئے بھی گنجائش ہے لیکن جب معاملہ ''معبودیت صرفہ'' تک پہنچ جاتا ہے تو قدم بھی کوتاہی کرتا ہے اور سیر بھی انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ نظر کو اس جگہ سے منع نہیں، فرمایا اور اس کی استعداد کے مطابق گنجائش بخشی ہے۔

بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے — یعنی ''مصیبت تھی اگر یہ بھی نہ ہوتا''

روایات میں منقول ہے کہ معراج کے واقعہ میں ایک ایسا موقع آیا تھا کہ محبوب ﷺ سے فرمایا گیا تھا ''قف یا محمد'' ''اے محمد ﷺ ٹھہر جائیں'' فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ اس امر میں اسی قدم کی طرف اشارہ ہو یعنی آپ ﷺ ٹھہر جائیں اور قدم آگے نہ رکھیں کیونکہ یہاں مرتبۂ صلوٰۃ سے بلند مرتبہ، جو کہ مرتبۂ وجوب سے صادر ہے وہ حضرت ذات تعالیٰ و تقدس کا مرتبہ تجرد و تنزہ ہے، جہاں نہ قدم کی جولاں گاہ ہے اور نہ گنجائش ہے''۔

چنانچہ حضرت شاہ ابوسعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے شیخ حضرت مرزا جان جاناں نے مرتبۂ معبودیت صرفہ میں توجہ فرمائی تو حضرت شاہ ابوسعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس بارے میں "ھدایۃ الطالبین" میں فرماتے ہیں کہ "پھر حضرت پیر صاحب نے اس عاجز پر اس عالی مقام میں توجہ فرمائی تو عاجز نے دیکھا کہ میں ایک مقام پر ہوں جس کے اوپر ایک بہت بڑا بلند اور بے رنگ مقام ہے میں نے ہر چند چاہا کہ وہاں تک پہنچ جاؤں لیکن نہ پہنچ سکا، اس وقت معلوم ہوا کہ یہ مقام "معبودیت صرفہ" کا ہے کہ وہاں قدم رکھنے کی گنجائش نہیں، مگر جہاں تک نظر پہنچے اس کی گنجائش ہے کہ دیکھ لے"۔

پھر ایک شعر نقل فرماتے ہیں:

تماشاکنان کوتاہ دست　　　　تو درخت بلند و بالائی

ترجمہ: "تو وہ سرو بلند و بالا ہے دیکھنے والے کیا بڑھائیں ہاتھ"۔

معبودیت صرفہ میں کلمہ طیبہ کی حقیقت متحقق ہو جاتی ہے۔ دفتر سوم کے مکتوب ۷۷ میں ہی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں: کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کی حقیقت اس مقام (یعنی معبودیت صرفہ) میں متحقق ہو جاتی ہے اور غیر متحقق کی عبادت کی نفی میں صورت اختیار کرتی ہے اور معبود حقیقی کا اثبات، یعنی اس (حق تعالیٰ) کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، اس مقام میں حاصل ہو جاتا ہے اور عابدیت اور معبودیت کے درمیان کمال درجہ کا اختیار اس جگہ ظاہر ہوتا ہے اور عابد معبود سے کماحقہ جدا ہو جاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کے معنی بعض منتہیوں کے حال کی نسبت سے لا معبود الا اللہ (نہیں معبود مگر اللہ) ہیں، جیسا کہ شرع شریف میں اس کلمہ کے معنی مقرر ہو چکے ہیں اور لا موجود، ولا وجود اور لا مقصود کہنا ابتدائی اور درمیانی نسبت سے

ہے اور **لا مقصود** کا مرتبہ **لا موجود** اور **لا وجود** کے مرتبے سے بلند ہے کیونکہ وہ **لا معبود الا اللہ** کا دریچہ ہے۔

حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی **"ھدایت الطالبین"** میں تحریر فرماتے ہیں: "اسی مقام پر کلمہ طیبہ **"لا معبود الا اللہ"** کے معنیٰ کا راز جلوہ گر ہوا اور صاف طور پر ظاہر ہو گیا کہ فی الحقیقت ہر طرح کی عبادت کا حق سوائے اللہ تعالیٰ کی احدیت کے کسی کو نہیں پہنچتا، اگرچہ اسماء و صفات کیوں نہ ہوں اور تمام ممکنات کے لئے اس امر کی لیاقت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جو بھی ہو شرک کی یہاں کوئی حقیقت نہیں رہتی بلکہ وہ بیخ و بن سے اکھڑ جاتا ہے۔ اس مقام میں نظر کی ترقی عبادت نماز سے وابستہ ہے۔

اسی مکتوب کے آخر میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جاننا چاہیئے اس مقام میں نظر کی ترقی اور نگاہ میں تیزی صلوٰۃ (نماز) کی عبادت سے وابستہ ہے جو منتہیوں کا کام ہے، دوسری عبادات بھی شاید مدد فرمائیں اور اس کے نقصان کی تلافی کریں، اس لئے نماز کو بھی ایمان کی طرح **حسن لذاتہ** (یعنی اصل اور ذات میں خوب اور بہتر) کہتے ہیں اور دوسری عبادتیں **حسن لذاتھا** (اپنی ذات میں حسن) نہیں ہیں۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ وصول نظری سے کیا مراد ہے؟ مکتوبات معصومیہ کے دفتر دوم مکتوب ۱۱۹ میں حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: اگر کہیں کہ رؤیت بصری و مشاہدہ قلبی دنیا میں واقع نہیں ہوتا تو اس بارگاہ میں وصول نظری کس معنیٰ میں ہوگا؟ ہم کہتے ہیں کہ یہ نظر رؤیت و مشاہدہ سے ماوراء ایک بے کیف امر ہے، جب تک تو اس کو نہ پہنچے اس کے معنیٰ کو نہیں سمجھ سکے گا۔ گویا کہ متشابہات کی قسم سے ہے۔

ہمارے عالی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تحریر فرمایاہے کہ "وصول نظری اور وصول قدی اس معنی میں نہیں ہیں، کہ وہاں شہود و مشاہدہ ہے یا قدم کی گنجائش ہے۔ اس جگہ تو بال برابر بھی گنجائش نہیں کجا کہ قدم کی، بلکہ یہ ایک مجہول کیفیت والا وصول ہے۔ اگر صورت مثالیہ میں نظر کے ذریعے سے منقش ہوا تو (اس کو) وصول نظری کہتے ہیں اور اگر قدم کے ذریعے سے ہوا تو وصول قدمی ہے، ورنہ نظر و قدم دونوں اس بارگاہ میں بے خود و حیران ہیں"۔

نماز تمام عبادتوں کی جامع ہے:

مکتوبات مجدیہ دفتر اول مکتوب ۲۶۱ میں ہے: معلوم ہوا کہ اسلام کے پنجگانہ ارکان میں سے "نماز" رکن دوم ہے جو تمام عبادتوں کی جامع ہے اور ایک ایسا جزو ہے کہ جس نے اپنی جامعیت کی وجہ سے کل کا حکم پا لیا ہے اور تمام مقرب اعمال پر سبقت لے گئی ہے، اور وہ دولت رؤیت (باری تعالیٰ) جو سرور عالمین علیہ و علی آلہ الصلوٰۃ والتسلیمات کو شب معراج، بہشت میں میسر ہوئی تھی دنیا میں نزول فرمانے کے بعد اس جہان کے مناسب آپ ﷺ کو وہ دولت نماز میں میسر ہوتی تھی"۔

آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ:

أقرب مایکون العبد الی الرب فی الصلوٰۃ۔ (کنز العمال: ۳۳۴۸)

یعنی "سب سے زیادہ اعلیٰ قرب، جو بندے کو رب سے حاصل ہوتا ہے، وہ نماز میں ہے"۔

اب آگے نماز کی عظمت کے بارے میں چند الفاظ تحریر فرماتے ہیں: آپ کے کامل فرماں برداروں کو بھی اس جہاں میں اس دولت کا بہت بڑا حصہ نماز میں حاصل ہے اگرچہ حقیقی رؤیت میسر نہیں ہے کیونکہ یہ جہاں اس کی تاب و طاقت نہیں رکھتا، اگر (حق تعالیٰ) نماز کا حکم نہ فرماتا تو مقصود

کے چہرے سے نقاب کون اُٹھاتا اور طالب کو مطلوب کی طرف رہنمائی کون کرتا۔ نماز ہی ہے جو غمگساروں کے لئے لذت بخش ہے اور نماز ہی ہے جو بیماروں کے لئے راحت جاں ہے۔

چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے:

أرحني یا بلال۔

"اے بلال (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! مجھے (نماز کے ذریعہ) راحت پہنچاؤ"۔

اس حقیقت کا رمز ہے اور **قرۃ عیني في الصلوٰۃ** "میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے"۔ میں اسی آرزو کی طرف اشارہ ہے وہ ذوق و مواجید، معالم و معارف، احوال و مقامات، انوارات الوان، تلونیات و تمکینات، (بے قراری و اطمینان)، تجلیات متکیفہ و غیر متکیفہ (کیفیت والی اور بے کیفیت والی) اور ظہورات متلونہ و غیر متلونہ (رنگارنگ اور بے رنگ)، ان میں سے جو کچھ نماز کے علاوہ (اوقات میں) میسر ہوں اور نماز کی حقیقت سے آگاہی بغیر ظاہر ہوں، ان سب کا منشاء ظلال و امثال ہیں بلکہ وہم اور خیال سے پیدا ہوئے ہیں۔ (بس نماز میں ذات کی طرف دھیان ہونا چاہیئے، اس کے علاوہ جو کیفیات اور واردات ہیں ان کی طرف سالک کو توجہ نہیں کرنی چاہیئے۔ سبحان اللہ! عجیب بات لکھی ہے)، وہ نمازی جو نماز کی حقیقت سے آگاہ ہے، نماز کی ادائیگی کے وقت گویا عالم دنیا سے باہر نکل جاتا ہے اور عالم آخرت میں پہنچ جاتا ہے لہٰذا وہ اس وقت اس دولت سے، جو آخرت کے ساتھ مخصوص ہے حاصل کرلیتا ہے اور اصل سے ظلیت کی آمیزش کے بغیر فائدہ اُٹھاتا ہے۔

بعض لوگوں نے سماع و نغمہ وغیرہ سے لذت پانے کی طرف اشارہ کیا ہے تو ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ایسی باتیں "حقیقت نماز" سے عدم آگاہی (بے خبری) کی وجہ سے ہیں۔ بلکہ اس طائفہ (صوفیہ) کی ایک کثیر جماعت نے اپنے اضطراب و بے قراری کی تسکین کو سماع و نغمہ اور وجد و تواجد

میں تلاش کیا اور اپنے مطلوب کو نغمہ کے پردوں میں مطالعہ کیا اور رقص اور رقاصی کو اپنا مسلک بنا لیا، حالانکہ انہوں سے سنا ہو گا۔ ما جعل اللہ فی الحرام شفاء۔ ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے حرام چیز میں شفاء نہیں رکھی ہے'' ہاں! الغریق یتعلق بکل حشیش و حب الشئیء یعمی و یصم۔ ترجمہ: ''ڈوبنے والا شخص ہر ایک تنکے کا سہارا لیتا ہے اور کسی چیز کی محبت اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے'' اگر نماز کے کمالات کی کچھ بھی حقیقت ان پر منکشف ہو جاتی تو وہ ہر گز سماع و نغمہ کا دم نہ بھرتے اور وجد و تواجد کو یاد نہ کرتے۔

نیز ایک بہت ہی عجیب بات فرماتے ہیں کہ ''اس مکتوب کے مطالعہ کے بعد اگر آپ کو نماز سیکھنے اور اس کے بعض مخصوص کمالات حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا اور وہ (شوق) آپ کو بے آرام کر دے تو استخارہ کے بعد اس طرف متوجہ ہو جائیں اور عمر کا ایک حصہ نماز سیکھنے میں گزاریں''۔ اور فرماتے ہیں کہ اگر نماز کے کمالات کی اہمیت سمجھ میں آگئی ہے تو پھر آپ اس طرف متوجہ ہوں اور میرے پاس آئیں اور عمر کا ایک حصہ نماز کے سیکھنے میں صرف کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نماز کی حقیقت نصیب فرمادیں، آمین!

اثرات: اس دائرے میں سیر قدمی کی گنجائش نہیں یعنی پرواز سے اس میں نہیں پہنچ سکتا، بلکہ سیر نظری ہے، نظر یعنی فکر سے فیض لے سکتا ہے کیونکہ نظر ہر جگہ پہنچ سکتی ہے، قدم صرف مقامات عابدیت میں پہنچتا ہے اور یہ مقام معبودیت صرفہ ہے، اس جگہ عابدیت اور معبودیت میں فرق ظاہر ہوتا ہے اور اس بات کا تعین کامل بھی اسی مقام میں حاصل ہو جاتا ہے کہ معبود حقیقی یعنی احدیت مجردہ کے سوا کوئی اور کسی قسم کی عبادت کا مستحق نہیں اگرچہ اسماء وصفات ہی کیوں نہ ہوں، گویا کلمۂ طیبہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کی اصل حقیقت اس جگہ منکشف ہوتی ہے کہ منتہیوں کے لئے اس کلمہ کے معنی

"لا معبود الا اللہ" اور عابد معبود سے کما ینبغی جدا ہو جاتا ہے اور شرک کی جڑ یہاں بنیاد سے اکھڑ جاتی ہے۔ اس مقام مقدسہ میں نماز کی عبادت پر ترقی منحصر ہے۔

فائدہ: حقائق الہٰیہ کی سیر یہاں تک تھی، اب حقائق انبیاء علیہم السلام کا بیان ہوتا ہے اور یہ حقائق انبیاء جو کہ تعین حبی میں واقع ہیں اصل میں ولایت کبریٰ میں داخل ہیں، چونکہ آخر میں منکشف ہوئے ہیں اس لئے سیر و سلوک میں بھی آخر میں واقع ہوئے ہیں۔

جاننا چاہیئے کہ جس طرح حقائق الہٰیہ میں ترقی اللہ تبارک و تعالیٰ کے محض فضل پر موقوف ہے اسی طرح حقائق انبیاء میں ترقی سید الابرار ﷺ کی محبت پر موقوف جانیں۔ جیسا کہ حق سبحانہ و تعالیٰ اپنی ذات کو دوست رکھتا اسی طرح اپنی صفات و افعال کو بھی دوست رکھتا ہے، پس محبت کی دو قسمیں ہوئیں:

۱۔ محبیت	۲۔ محبوبیت

محبیت ذاتیہ کے کمالات کا ظہور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں ہوا اور محبوبیت کی بھی دو قسمیں ہیں: محبوبیت ذاتی اور محبوبیت صفاتی و اسمائی۔

محبوبیت صفاتی و اسمائی کا ظہور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام و دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں متحقق ہوا اور محبوبیت ذاتی کا ظہور حقیقت محمدی و احمدی ﷺ میں متحقق ہوا۔ پس اول کمالات صفاتی و حقیقت ابراہیمی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں سیر شروع ہوتی ہے پھر حقیقت موسوی میں، پھر حقیقت محمدی و احمدی ﷺ میں سیر واقع ہو گی۔

۳۱)نیت مراقبہ حقیقت ابراہیمیؑ: فیض می آید از حضرت ذات بیچون کہ محبِ صفات خود است و منشاء حقیقتِ ابراہیمی علیہ السلام است بہ ہیئت وحدانی من بواسطہ پیران کبار۔ توقف۔۔۔روز

ترجمہ: حضرت بے چوں ذات حق تعالیٰ جو کہ اپنی صفات کی محب اور منشاء حقیقت ابراہیمی علیہ السلام ہے سے مشائخ عظام علیہم السلام کے توسل سے میری ہیئت وحدانی میں فیض آ رہا ہے۔ (توقف)

تشریح: اس مقام پر سالک کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے ایک خاص قسم کا انس پیدا ہو جاتا ہے اور تمام مخلوق سے اس قدر بے توجہی و بے التفاتی ہو جاتی ہے کہ کسی توسط و توسل پر راضی نہیں ہوتا گویا حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ السلام نے آتش نمرود میں جو جواب حضرت جبریل علیہ السلام کو دیا تھا (اما الیک فلا) یعنی مجھے تیری کوئی حاجت نہیں، اس کا مصداق بن جاتا ہے اور یہاں درود ابراہیم علیہ السلام کا پڑھنا زیادہ مفید اور باعث ترقی ہے۔

اثرات: اس بلند مقام میں سالک کو حضرت حق سبحانہ کے ساتھ خاص اُنسیت اور محبوبیت ظاہر ہو کر کمالات صفاتی و محبوبیت اسماء کا ظہور ہوتا ہے، مقام خلت اسی سے کنایہ ہے اور اس کا دائرہ کو "دائرہ خلت" بھی کہتے ہیں اور یہ نہایت عجیب و کثیر البرکات مقام ہے، انبیاء علیہم السلام اس مقام میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے تابع ہیں اور سید الابرار حبیب خدا ﷺ کو بھی حکم اتباع ملت ابراہیم حنیف علیہ السلام سے مامور فرمایا، اسی لئے حضور ﷺ نے اپنے درود کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درود سے تشبیہ فرمائی جیسا کہ نماز میں پڑھا جاتا ہے۔ پس اس مقام میں درود ابراہیمی (نماز والا درود) پڑھنا بہت خیر و برکت کا باعث ہے اور سالک کو ذات حق سبحانہ کے ساتھ

خاص انس و خلت و بے خودی پیدا ہو جاتی ہے اور محبوبیت صفاتی جو کہ عالم مجاز میں خط و خال اور قد و عارض وغیرہ سے تعبیر کی جاتی ہے بطور عکس جلوہ گر ہوتی ہے، سای لئے سالک ماسوائے ذات کے کسی طرف متوجہ نہیں ہوتا اگرچہ وہ اسماء وصفات ہوں یا ظلال اور مزارات مشائخ کرام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہوں یا ارواح طیبہ و ملائکہ کرام علیہ السلام ربی اعلم بحالی یو غنینی عن سؤالی۔ ترجمہ: ”میرا رب میرے حال کو میرے سوال سے زیادہ جانتا ہے“ اس پر وارد رہتا ہے لیکن اس مقام میں اس قدر بے رنگی نہیں ہے جتنی کہ محبوبیت ذاتی میں ہے جیسا کہ آگے آتا ہے۔

اس مقام میں سالک کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خصوصیت معلوم ہوتی ہے لیکن چاہیئے کہ سوائے حبیب خدا ﷺ کے ایسی خصوصیت کے ساتھ کسی کی طرف متوجہ نہ ہو بلکہ سب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کا طفیل سمجھے۔

۳۲) نیت مراقبہ حقیقت موسویٰ: فیض می آید از حضرت ذات بیچون کہ محب ذات خود است و منشاء حقیقت موسویٰؑ است بہ ہیئت وحدانی من بواسطہ پیران کبار رحمھم اللہ تعالیٰ۔ توقف۔۔۔ روز

ترجمہ: اس ذات بے چوں حق تعالیٰ سے جو کہ اپنی ذات کی محب اور حقیقت موسوی کی منشاء ہے سے میری ہیئت وحدانی میں بوسیلۂ مشائخ عظام فیض پہنچ رہا ہے۔ (توقف)

تشریح: اس مقام میں محبت ذاتیہ ہے۔ اس کے باوجود شان استغنائی اور بے نیازی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہی راز ہے کہ بعض مواقع پر حضرت کلیم اللہ علیٰ نبینا وعلیہ السلام سے بظاہر خلاف ادب کلمات سرزد ہوئے۔

جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

أَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا إِنْ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ (الاعراف ۱۵۵)

کیا تو ہمیں اس کام پر ہلاک فرمائے گا جو ہمارے بے عقلوں نے کیا وہ نہیں مگر تیرا آزمانا۔

اور نیز یہ مقام، مقام شوق بھی ہے جیسا کہ فرمایا:

رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْکَ (الاعراف ۱۴۳)

اے رب میرے مجھے اپنا دیدار دکھا۔

اس مقام کے عارف کو یہ درود شریف تقریباً تین ہزار کے قریب روزانہ پڑھنا مستحسن اور بہتر ہے لازم نہیں۔

اللھم صل علیٰ سیدنا محمد و علیٰ اخوانہ من الانبیاء و المرسلین خصوصاً علیٰ کلیمک سیدنا موسیٰ۔

اثرات: صاحب شفاء القلوب فرماتے ہیں کہ اس مقام کو "دائرۂ محبت ذاتیہ صرفہ" بھی کہتے ہیں۔ اس مقام میں سالک کو کمالات محبیت یعنی محبت ذاتی کے ظہور کے باوجود استغناء اور بے نیازی کا بھی ظہور ہوتا ہے حالانکہ یہ اجتماع ضدین ہے اور بعض طبیعتوں سے بعض وقت بے ساختہ:

رب ارنی انظر الیک۔

ترجمہ: "اے میرے رب! تو مجھے اپنی ذات کا جلوہ دکھا تاکہ میں تیری طرف دیکھوں" نکلنے لگتا ہے۔ بعض متحمل ہوتے ہیں اور برداشت کر لیتے ہیں اور اس عالی مقام میں ایسے کمالات کا ظہور کم ہی ہوتا ہے اور کم ہونا ہی مناسب ہے۔

شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مقام میں درود شریف: اللھم صل علی سیدنا محمد و الہ و أصحابہ و علی جمیع الانبیاء و المرسلین خصوصاً علیٰ کلیمک موسیٰ علیہ السلام بکثرت پڑھنا ترقی بخشتا ہے۔

۳۳)نیت مراقبہ حقیقت محمدی صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلَّم: فیض می آید از حضرت ذات بیچون کہ محب ذات خود است و محبوب ذات خود است و منشاء حقیقتِ محمد صَلی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہ وَسلم ؐیست بہ ہیئت وحدانی من بواسطہ پیران کبار رحمہم اللہ تعالیٰ۔توقف۔۔۔روز

ترجمہ: بے چوں ذات حق تعالیٰ جو کہ اپنی ذات کی محب اور محبوب بھی ہے اور منشاء حقیقت محمدیہ ہے سے بوسیلہ مشائخ عظام میری ہیئت وحدانی پر فیض آرہا ہے۔

تشریح: یہ حقائق کی اصل اور حقیقت الحقائق ہے اور دیگر حقائق خواہ انبیاء علیہم السلام کی ہوں یاملائکہ کی اس حقیقت الحقائق کے سامنے ظلال کی مانند ہے۔اسی لیے آپ کی شان میں فرمایا:

لولاک لما خلقت الافلاک و لما اظہرت الربوبیة۔

اسی بناءپ خود حضور سرور عالم ﷺ فرماتے ہیں:

اول ما خلق اللہ نوری اور اس کے اوپر کوئی حقیقت نہیں کیونکہ تعین اول کے دائرہ کا یہ مرکز ہے۔سب سے افضل اولیاء محمدی المشرب کے سلوک کی یہ انتہاہے اور اس سے ترقی جائز نہیں کیونکہ اس سے اوپر قدم رکھنا دائرہ امکان سے نکل کر وجوب میں قدم رکھنے کے مترادف ہے جو کہ شرعاًاور عقلاً محال ہے۔

میاں فقیر اللہ جلال آبادی فرماتے ہیں کہ قطب الاقطاب مجدد الف ثانی قدس اسرارہ کو تعین اول تعین جبی سے فوق جو عروجات نصیب ہوئے وہ مرض موت میں اس رات حاصل ہوئے جس شب کو آپ نے رحلت فرمائی،اس کی پوری تفصیل انشاءاللہ شرح مراقبات میں بیان کروں گا۔

اور اس مقام پر سالک کو نبی کریم ﷺ سے خاص محبت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر امر میں حضور انور ﷺ کا ہی اتباع اچھا معلوم ہوتا ہے۔امام الطریقہ امام ربانی مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ کے قول

مبارک (خدارا ازاں مے پرستم کہ او رب محمد است) کے معنی اس جگہ ظاہر ہوتے ہیں یہاں یہ درود پڑھنا نہایت مفید ہے:

اللھم صل علیٰ سیدنا محمد و علیٰ اٰل سیدنا محمد افضل صلواتک بعدد معلوماتک وبارک وسلم۔

اثرات: صاحب شفاء القلوب فرماتے ہیں کہ اس مقام میں محبوبیت ذاتیہ کا محبیت ذاتیہ کے ساتھ مل کر ظہور ہوتا ہے اس لئے اس کو "دائرہ محبوبیت ذاتیہ ممتزجہ" کہتے ہیں اور اس کو "حقیقت الحقائق" اور "تعین اول" بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ دوسرے انبیاء و ملائکہ علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حقائق کی اصل ہے اور دوسروں کے حقائق اس کے لئے ظل کی مانند ہیں، اس مقدس مقام میں خاص طرز پر فنا و بقا حاصل ہوتی ہے اور سرور دین و دنیا ﷺ کے ساتھ ایک خاص قسم کا اتحاد میسر ہو جاتا ہے اور رفع توسط (جس کے اکابر اولیاء قائل ہوئے ہیں) کے معنی اس مقام میں ظاہر ہوتے ہیں اور تابع (سالک) متبوع (آنحضرت ﷺ) کے رنگ میں ایسی مشابہت پیدا کر لیتا ہے گویا کہ ہر دو ایک ہی چشمے سے پانی پیتے ہیں اور دونوں شیر و شکر کی مانند ہیں اور ان سب امور کے باوجود اس کو آں سرور عالم ﷺ سے اس درجہ محبت پیدا ہو جاتی ہے کہ امام الطریقت حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے اس قول کے معنی ظاہر ہوتے ہیں کہ "میں خدائے عزوجل کو اس لئے دوست رکھتا ہوں کہ وہ محمد ﷺ کا رب ہے"۔

یہ مقام حقائق انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کے اسرار کا جامع ہے، سالک اس مقام میں تمام جزوی و کلی، دینی و دنیوی امور میں حبیب خدا ﷺ کے ساتھ مناسبت و مشابہت ہونے کو بہت ہی دوست رکھتا ہے۔ اس مقام کے اسرار بے حد ہیں جو نہ زبان پر لائے جاسکتے ہیں اور نہ ظاہری علم والوں کے لئے ان میں سے کوئی حصہ ہے اس مقام میں علم حدیث کی تعلیم کا شوق اور رغبت کلی

حاصل ہو جاتی ہے۔ اس مقام میں درود شریف: اللھم صل علیٰ سیدنا محمد و علیٰ اٰل سیدنا محمد و اصحاب سیدنا محمد افضل صلواتک عدد معلوماتک و بارک و سلم بکثرت پڑھنا ترقی بخشتا ہے۔

(۳۴) نیت مراقبہ حقیقت احمدی صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہٖ وَسلَّم: فیض می آید از ذات بیچون کہ محبوب ذات خود است و منشاء حقیقت احمد صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ وَاٰلہٖ وَسلم است بہ ہیئت وحدانی من بواسطہ پیران کبار رحمہم اللہ تعالیٰ۔ توقف۔۔۔روز

ترجمہ: فیض آرہا ہے میری ہیئت وحدانی پر اس ذات پاک سے جو اپنی محبوب آپ ہے اور جو منشاء حقیقت احمدی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہے۔

تشریح: یہ مقام محبوبیت محضہ ہے لیکن اس کا تعلق روحی ہے اور اس کو دائرہ محبوبیت صرفہ بھی کہا جاتا ہے یہاں بھی درود مفید ہے یعنی اس مقام میں درود شریف موجب ترقیات ہوتا ہے اسم احمد صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم میں جو میم ہے وہ مقام محبوبیت کا اشارہ کرتا ہے اور میم الگ کرنے کے بعد (احد) باقی رہتا ہے، جس کے معنیٰ فرد یا یکتا کے ہیں، ای المحبوب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرد فی العبودیۃ و المحبوبیۃ۔ محبوب رب العالمین یکتا و فرد ہے اور عبدت اور محبوبیت میں حضرت فرید الدین عطار قدس سرہ نے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کیسے عمدہ اشعار کہے ہیں، جن کا مفہوم اس طرح ہے۔

محمد (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) ہیں اول خدا کے بنائے ہوئے — اگرچہ ہیں آخر میں تشریف لائے ہوئے

بظاہر ہیں وہ گو کہ اولاد آدم — ہیں تخلیق میں خلق سے وہ مقدم

قبول عمل کا ذریعہ وہی ہیں
حصول جزا کا وسیلہ وہی ہیں
محمد شریعت میں ہے نام نامی
حقیقت میں احمد ہے اسم گرامی
اگر میم احمد کا پردہ اُٹھے گا
تو راز احد چشم دل پر کھلے گا
خدا ہے احد اپنی معبودیت میں
جناب محمد ہیں فرد عبدیت میں
خدا جیسے ساری خدائی میں یکتا
نبی بندگی میں ہیں بے مثل وہمتا
خدا ہی کو جب تک نہ پہچان لوگے
تو کیا قدر شان نبی کی کروگے
تمہیں جب دونوں کا عرفان ہو گا
دو عالم کا ہر کام آسان ہو گا

حضرت شاہ ابو سعید فاروقی قدس سرہ نے لکھا ہے:

حضرت مجدد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی تحریرات میں کسی مقام پر یہ تحقیق فرمائی ہے کہ حقیقت کعبہ ٔمعظمہ بعینہ حقیقت احمدی ﷺ ہے، اس بات کا مطلب اپنی فہم ناقص میں نہیں آیا۔ کیونکہ حقیقت کعبہ حقائق الہیہ میں ہے اور حقیقت احمدی ﷺ حقائق انبیاء علیہم السلام میں۔ پس یہ دونوں ایک ہی حقیقت کیسے ہوں گی۔ ایک روز میں حقیقت احمدی ﷺ میں متوجہ تھا کہ اچانک دیکھا کہ حقیقت کعبہ ٔمعظمہ کا ظہور واقع ہوا، اور ندا دی کہ عظمت و کبریائی بھی محبوب کا خاصہ ہے اور محبوبیت و مسجودیت دونوں آنحضرت ﷺ کے شیونات سے ہیں تو پھر صاحب الطریقہ حضرت مجدد قدس سرہ کی بات میں شک و تردد نہیں (الخ) صاحب مدارج الخیر و مناھج السیر فرماتے ہیں کہ دونوں حضرات قدس اللہ اسرارہما نے جو کچھ فرمایا قطعاً درست اور صحیح ہے۔ جیسا کہ اگلے بیان میں آرہا ہے۔

اثرات: صاحب شفاء القلوب فرماتے ہیں کہ یہ مقام محبوبیت ذاتی سے پیدا ہوا ہے، اس لئے اس کو "دائرہ محبوبیت ذاتیہ صرفہ" بھی کہتے ہیں، اس لئے اس مقام میں استغناء اور بے نیازی کی شان زیادہ کامل ہوتی ہے اور اس مراقبے میں نسبت سابقہ غلبۂ انوار کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور عجیب و غریب کیفیت حاصل ہوتی ہے کہ بیان و تحریر میں نہیں آسکتی۔

بعض سالک اس جگہ اپنے آپ کو بین یدی الرحمٰن (اللہ تعالیٰ کے سامنے) دیکھتے ہیں اور اسی خاصہ محبوبیت کی وجہ سے حقیقت کعبہ بعینہ حقیقت احمدی ہے، کیونکہ محبوبیت و مسجودیت دونوں حق تعالیٰ کے شیونات میں سے ہیں اور اس مقام میں محبوبیت ذاتی منکشف ہوتی ہے یعنی سالک ذات حق سبحانہ کو بلالحاظ صفات دوست رکھتا ہے، کیونکہ اس کی ذات ہی ایک ایسی ہے جو اس کے تمام نقش و نگار کی موجب ہے۔ احمد عجب اسم سامی ہے جو کلمۂ مقدسہ احد سے حلقہ میم کے ساتھ مرکب ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے پوشیدہ بھیدوں میں سے ہے پس احد **لا شریک لہ** ہے۔ حلقہ میم عبودیت کا طوق ہے جو کہ بندہ کو مولیٰ سے متمیز کرتا ہے، پس بندہ وہی حلقہ میم ہے اور احد اس کی تعظیم کے لئے آیا ہے جس نے آنحضرت ﷺ کی خصوصیت کو ظاہر کیا ہے۔

چو نام ایں ایست نام آور چہ باشد مکرم تر بود از ہر چہ آباشد

ترجمہ: "جب ایسا نام ہے تو صاحب نام، مکرم اور معزز سب سے ہوگا"

اس جگہ بھی درود شریف مذکورہ حقیقت محمدی ﷺ کا ورد مفید ہے۔ غرض حقائق انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام میں الف و انسیت انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اور خصوصاً سردار دوجہاں فخر انس و جاں ﷺ کے ساتھ کامل طور پر ہو جاتی ہے۔

صاحب شفاء القلوب مزید فرماتے ہیں کہ جاننا چاہیئے کہ وہ فنا و بقا جس پر ولایت موقوف ہے شہودی فناوبقاہے جو کہ نظر کے اعتبار سے ہے، صفات بشری اس فناوبقامیں صرف پوشیدہ ہو جاتی ہیں، زائل اور فانی نہیں ہوتیں، لیکن فنائے تعین محمدی ﷺ میں صفات بشری کے لئے زوال وجودی متحقق ہے اور جسد سے نکل کر روح کی طرف منتقل ہونا ثابت ہے اور بقا کی جانب میں بھی اگرچہ بندہ حق نہیں ہو جاتا اور بندگی سے نہیں نکلتا لیکن حق سبحانہ وتعالیٰ کے بہت نزدیک ہو جاتا ہے اور معیت زیادہ ترپیدا کرلیتاہے اور اپنے آپ سے دور تر ہو کر احکام بشری اس سے مسلوب ہو جاتے ہیں۔

۳۵)نیت مراقبہ حبّ صرف: فیض می آید از ذات بیچون کہ منشاء حبّ صرف است بہ ہیئت وحدانی من بواسطہ پیران کبار رحمہم اللہ تعالیٰ۔توقف۔۔۔روز

ترجمہ: فیض آرہاہے میری ہیئت وحدانی پر اس ذات پاک بیچوں سے جو منشاء حب صرفہ ہے، بواسطہ مشائخ عظام علیہم السلام۔

تشریح:اس مقام پر نسبت کا کمال علو اور باطن کی بے رنگی ظاہر ہوتی ہے کیونکہ یہ مرتبہ اطلاق و لاتعین کے بہت قریب ہے۔ یہ مقام ہمارے پیارے نبی محمد ﷺ کے خاص مقامات سے ہے۔ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے حقائق کا یہاں نشان تک نہیں ملتا کیونکہ یہی تعین حبی اور حقیقت محمدی ﷺ ہے جس کا اوپر بیان ہوا۔

اس مقام کے بارے میں "ھدایۃ الطالبین" میں حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مقام پر نسبت باطن میں کمال بلندی وبے رنگی ظاہر ہوتی ہے کیونکہ یہ مقام بھی حضرت اطلاق ولاتعین سے بہت ہی قریب ہے قریب اس لئے ہے کہ جو چیز سب سے پہلے ظہور میں

آئی وہ حب ہے، اس مقام سے متعلق شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ **كنت كنزاً مخفيا فأحببت أن أعرف۔**[70] **ترجمہ:** ”میں (اللہ تعالیٰ) پوشیدہ خزانہ تھا، پس میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے خلق کو پیدا کیا تاکہ پہچانا جاؤں۔“ والی روایت نقل کر کے فرماتے ہیں کہ یہ حدیث شریف ہمارے اس مدعا پر قطعی دلیل ہے اور وہی تعین اول حقیقت ہے جناب محبوب کبریاء ﷺ کی۔ علامہ قسطلانی وملا علی قاری اور دوسرے اکابر نے کہا ہے کہ احادیث صحیحہ سے یہ مضمون ثابت ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ سے خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ:

”اگر تو نہ ہوتا تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا اور اپنی خدائی کو ظہور میں نہ لاتا“۔

پس معلوم ہوا کہ مبداء خلقت آں سرور عالمیان کا وجود ہے جس کے فیض سے سب کا وجود ہوا۔ اول آپ ﷺ کا نور پاک ظہور میں آیا اور اسی نور پر ظہور سے عرش و کرسی و لوح و قلم اور آسمان و زمین اور ملائکہ و جن و انس اور تمام کائنات سب وجود میں آئے۔

چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

كنت نبيا و آدم بين الروح و الجسد.[71]

ترجمہ: میں اس وقت بھی نبی تھا جب کہ آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے۔

ابھی ان کا وجود مکمل نہیں ہوا تھا آں جناب بدرجۂ اتم مظہر صفات حضرت احدیت ہوئے اور مخلوق میں جو بھی ظہور کمال ہے حقیقت میں وہ کمال محبوب کبریا ﷺ کے کمالات میں سے ہے اسی نور کے ظہور سے آدم علیہ السلام مسجود ملائکہ ہو گئے اور اسی نور کی تجلیات سے کعبۂ معظمہ مسجود خلائق ہوا ہے۔

---

[70] كشف الخفاء و مزيل الالباس رقم الحديث ۲۹۸، ٦ ۱ ۰ ۲ دار الكتب العلمية بيروت ص ۱۷۹

[71] كنز العمال فی سنن الاقوال والافعال، ج ۱ ۱، ص ۴۰۹۔ الناشر: مؤسسة الرسالة

اللھم صل علی سیدنا محمد و علی اٰلہ و اصحابہ و اھل بیتہ افضل صلوتک عدد معلوماتک و بارک و سلم۔

حقائق انبیاء ﷺ میں اس مقام کے آخر تک سالک کے لئے سیر قدمی تجویز فرمائی ہے اور اس کے بعد کہیں اور کوئی مقام قدم رکھنے کا نہیں ہے۔

ھدایۃ الطالبین میں حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: اور یہ بھی ہمارے آقا حضور انور ﷺ کے مخصوص مقامات میں سے ہے، دوسرے انبیاء علیہم السلام کے حقائق میرے نزدیک اس مقام پر ثابت نہیں ہوتے کیونکہ حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک حضرت لاتعین کے ساتھ جو پہلا تعین لاحق ہوا ہے وہ تعین حب ہی ہے اور اسی پہلے تعین کو حقیقت محمدی ﷺ قرار دیا گیا ہے اسی لئے ہمارے مشائخ نے فرمایا کہ اصل میں حقیقت محمدی ﷺ یہی ہے اور جو پہلے بیان ہوا، وہ اس کا ظل ہے۔

اثرات: صاحب **شفاء القلوب** فرماتے ہیں کہ اس مقام میں نسبت باطن میں کمال بلندی و بے رنگی ظاہر ہوتی ہے اور یہ مرتبہ حضرت ذات مطلق و لاتعین کے بہت قریب ہے اس لئے کہ جو چیز سب سے پہلے ظہور میں آئی وہ حب ہے جو منشاء ظہور و مبدأ خلق ہے۔ اصل میں حقیقت محمدی ﷺ یہی ہے اور جو پہلے بیان ہوئی وہ اس کا ظل ہے۔ یہ مقام حضرت سید المرسلین ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے حقائق اس مقام میں ثابت نہیں ہوتے اور اس میں سیر قدمی نہیں ہے بلکہ سیر نظری ہے اور نظر بھی عاجز و درماندہ اور سرگرداں ہے۔

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار　　　گل چین بہار تو ز داماں گلہ دارد

ترجمہ: "ہماری نگاہ کا دامن تنگ ہے اور آپ کے حسن کے پھول بے شمار ہیں، آپ کے حسن کی بہار کے پھول چننے والے کے دامن کی تنگی کی شکایت ہے"۔

درود شریف کا ورد حقیقت محمدی ﷺ میں ترقی بخشتا ہے۔

۳۶) نیت مراقبہ لا تعیّن: فیض می آید از ذات مطلق بیچون کہ موجود است بوجود خارجی و منزّہ است از جمیع تعینات بہ ہیئت وحدانی من بواسطہ پیران کبار۔ توقف۔۔۔روز

ترجمہ: فیض آرہا ہے میری ہیئت وحدانی پر اس ذات پاک سے جو تعینات سے مبرا ہے، بواسطۂ مشائخ عظام علیہم السلام کے۔

تشریح: یہاں سیر قدمی کی گنجائش نہیں اگر کسی پر فضل الٰہی ہو جائے تو صرف سیر نظری ہو گی۔ یہ مقام بھی حضور سرور انبیاء علیہم السلام کے خصائص سے ہے۔ لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل اسی مقام کی طرف اشارہ ہے۔ حضور علیہ السلام کے طفیل سے آپ کے بعض امتیوں کو بھی اس خوان نعمت سے اُلش عطا ہوا ہے۔

اگر بادشاہ بردر پیرزن | بیاید تواے خواجہ سبلت مکن

اس سے حضور نبی اکرم ﷺ کی عظمت نمایاں ہو جاتی ہے کہ آپ کے نمک خوار اور اُلش خوار بھی اس دولت سے مشرف ہوتے ہیں۔

ھدایۃ الطالبین میں حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ان تمام مراتب کے بعد مراقبۂ لا تعین و حضرت اطلاق کا مراقبہ ہے۔ اس مقام کو لا تعین اس لئے کہتے ہیں کہ یہ تعین اول یعنی حبی سے پہلے ہے اور اس ذات سے فیض حاصل کرنے کا مراقبہ کیا جاتا ہے جو تعینات سے پاک و مبرا ہے۔

حضرت شاہ ابو سعید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ یہ مقام بھی حضرت رسالت پناہ ﷺ کے مقامات مخصوصہ میں سے ہے، یہاں پر سیر قدمی نہیں ہوتی لیکن سیر نظری ضرور ہوتی ہے، مگر نظر کہاں تک کام کرے گی۔ اسی لئے "شرح رباعیات خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ" میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے کہ اولیاء کرام نے مراقبۂ شہود کی انتہاء تعین اول تک بیان فرمائی ہے اور اس سے اوپر لاتعین کا مرتبہ ہے اور ان بزرگوں نے شہود کے لئے وہاں کوئی گنجائش نہیں سمجھی ہے۔

صاحب شفاء القلوب فرماتے ہیں کہ جاننا چاہیئے کہ اگرچہ یہ بزرگ مرتبۂ لاتعین میں شہود کو جائز نہیں سمجھتے لیکن شہود سے بالاتر بہت سے مراتب ہیں جو سب کے سب اس مرتبۂ لاتعین میں جائز قرار دیئے گئے ہیں۔ پھر آگے فرماتے ہیں کہ شہود وصول کی دہلیز ہے اور وصول کے مراتب اس کے اوپر ہیں، لیکن ہر شخص کے فہم کی رسائی وہاں تک نہیں بلکہ قریب ہے کہ وہ انکار کر گزرے۔ ہمارے حضرت (خواجہ باقی باللہ قدس سرہ) کے مخلصوں میں سے ایک درویش (غالباً حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات گرامی کی طرف اشارہ ہے) پر یہ حالت طاری ہوئی اور اس کی سیر مرتبۂ لاتعین سے بھی اوپر تک واقع ہو گئی اور اس کو اس مقام میں ایک استہلاک (فنائیت) پیدا ہوا جس کے بارے میں اس نے ان (حضرت خواجہ قدس سرہ) کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ نے اس کو جائز قرار دیا اور قبول فرمایا تھا۔

آیت کریمہ: وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ (البقرۃ ۱۰۵)

ترجمہ: "اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ مخصوص کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے"۔

اس کے بعد حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک سوال پیش کرتے ہیں کہ جب تعین اول سے اوپر مرتبۂ لاتعین محض ہے تو پھر لازماً اس مقام پر امتیاز اور فرق معدوم ہو جائے گا، لہٰذا اس مرتبہ میں سیر کے معنی کیا ہوں گے۔

جواب میں فرماتے ہیں: واضح رہے کہ اس سوال کا حل نہایت گہرے اسرار میں سے ہے، اس مقام کے متعلق بات کرنا خلاف مصلحت ہے۔ پھر ایک عجیب بات فرماتے ہیں: جاننا چاہیئے کہ آخر تمہیں جب دیدار ہو گا اس کا تعلق مرتبۂ لاتعین سے ہو گا اور تعینات کے تمام پردے اُٹھ جائیں گے کیونکہ اس جگہ (یعنی اس دنیا میں) تمام تعینات علمی ہیں نہ کہ خارجی اور علمی تعین ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کے لئے پردے بن جاتے ہیں شہود دنیوی کے خلاف، کہ وہ بھی تعین کی ایک قسم ہے اور اس کا تعلق ذہن سے ہے، ہو سکتا ہے کہ علمی تعین اس کا حجاب بن جائے۔

آخر میں فرماتے ہیں:

نؤمن بالرؤیۃ الأخرویۃ ولا نشتغل بکیفیتھا لقصور فھم العوام لا لجھل عن کیفیتھا فان أخص الخواص من الأولیاء نصیبا فی ھذہ النشأۃ من ھذا المقام و ان لم نسمہ رؤیۃ فافھم۔

ترجمہ: ’’ہم دیدار آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور اس کی کیفیت کے درپے نہیں ہوتے اس لئے کہ عوام کی فہم اس سے قاصر ہے، اس وجہ سے نہیں کہ اس کی کیا کیفیت معلوم نہیں کیونکہ اولیاء میں نہایت خاص خاص لوگ اس دنیا میں اس مقام سے بہرہ یاب ہوئے ہیں اگرچہ ہم اس کو رویت کا نام نہیں دے سکتے‘‘۔

حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ محب کی بات محبوب کے لب پر کہاں پہنچتی ہے جیسا کہ (خود) اس کی بات کو اس کے ساتھ قرب و منزلت ہے، اس کی بات سے اس تک پہنچا جا سکتا ہے، نہ کہ اپنی بات سے، کیونکہ اس (محب) کی بات کوتاہ اور راستہ ہی میں (رہ جانے

والی) ہے۔ یہ حقیر کہتا ہے کہ **من عرف اللہ کل لسانہ**۔ ترجمہ: ”جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا اس کی زبان گونگی ہو گئی“ اس کے لئے گواہ ہے۔

دفتر ۳ مکتوب ۱۲۲ میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک بہت پیاری بات فرماتے ہیں کہ جب کمال عنایت سے ظلال کی منازل تک طے کرتے کرتے اصل تک پہنچتا ہے تو محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسا پاتا ہے کہ اصل بھی ظل کا حکم رکھتا ہے اور مطلوبیت کے لائق نہیں ہے کیونکہ وہ امکان کے داغ سے داغدار ہے اور مطلوب کا احاطۂ ادراک اور وصل و اتصال سے ماوراء ہے۔ اسی لئے ہمارے بزرگوں نے اس مقام کے بارے میں فرمایا:

العجز عن درک الذات ادراک　　　　والقول بدرک الذات اشراک

ترجمہ: ”ذات حق کے ادراک سے عاجز ہونا ہی ادراک ہے، اور ادراک ذات حق کا دعویٰ شرک ہے“۔

اسی مکتوب میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

”کوئی یہ نہ کہے کہ معرفت سے عاجز ہونا، جو کہ معرفت کی نقیض ہے، معرفت کیونکر ہوا کیونکہ معرفت سے عاجز ہونا ہی معرفت ہے“۔

پھر فرماتے ہیں: حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

العجز عن درک الذات ادراک۔

(معرفت ذات کے) ادراک سے عاجز ہونا ہی (اس کی معرفت کا) ادراک ہے۔

فسبحان من لم یجعل للخلق الیہ سبیلا الا بالعجز عن معرفتہ۔

ترجمہ: ”پس پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی معرفت سے عاجزی کے سوا اپنی مخلوق کے لئے کوئی راستہ نہیں بنایا“۔

اس بحث کے آخر میں فرماتے ہیں "اور یہ معرفت سے عاجز ہونا مراتب عروج کی نہایت کی انتہاء ہے اور قرب کے مدارج کی غایت درجہ منتہا ہے۔ اور جب تک سالک نقطۂ آخر تک نہ پہنچے اور تجلیات و ظہورات کے مراتب کو طے نہ کرلے اور وصل واتصال کو، جس پہ مدتوں خوش رہا تھا، اس کو عین فصل و انفصال نہ پائے، اس وقت تک اس عجز کی دولت سے مشرف نہیں ہو سکتا اور خداناشناسی سے خلاصی نہیں پاتا اور غیر حق کو حق نہیں جانتا۔

مدارج الخیر میں لکھتے ہیں دائرۂ لاتعین حقائق انبیاء علیہم السلام کا آخری دائرہ ہے۔ اس میں ورد فیض ذات بحت سے جو کہ مبری و منزہ ہے تعینات سے سالک کی ہیئت وحدانی پر ہوتا ہے، اس مقام میں قدم بے چارہ عاجز و لنگ اور نظر حیران و سرگرداں رہ گئی ہے۔

اے وہ کہ تیرے در سے ہے زخمی دلوں کو آس
عاشق کی جاں کو یاد سے تیری قرار آئے

موسیٰ کی طرح لاکھوں ہی دنیا میں بہر دید — رب ارنی کہتے ہوئے خواستگار آئے
سینے دہک رہے ہیں جدائی کی آگ سے — سب تیرے درد عشق ہی میں اشکبار آئے

اس مقام پر اکابر طریقہ نے سیر نظری تجویز فرمائی ہے لیکن بارگاہ عظمت و کبریا میں نظر بے چاری حیران ہے۔

یہ کہتی ہے صدائے لن ترانی — مکانی اور تاب لامکانی

ان مواطن مقدسہ میں سیر قدمی یا سیر نظری کی تجویز اس معنی میں نہیں ہے کہ وہاں نفوذ اور شہود ہے بلکہ اس کا مطلب ہے کہ اگر ان مراتب لامکانی کو مقامات مکانی میں صورت مثالی میں نقش کریں تو اس سیر کو سیر قدمی یا نظری سے تعبیر کریں گے جیسا کہ بیان کیا جاچکا۔

معلوم ہوا کہ ہر دائرہ میں کیفیات خاصہ ہوتی ہیں اور وہ کیفیات خاصہ قرب بے نہایت سے عبارت ہے جس کی کوئی صورت نہایت نہیں ہو سکتی اور جس کو انتہائے دائرہ سے تعبیر کرتے ہیں وہ باعتبار سالک کہتے ہیں یعنی اس موطن میں سالک کو جو حظ تھا وہ پورا ہو گیا۔ سالکین کے لئے ان مواطن میں سوائے وجدان کے اور کچھ نصیب نہیں، کم ہیں وہ لوگ جو کشف و عیاں سے ممتاز ہوں۔ یہ ہے مختصر بیان حضرات نقشبندیہ مجدیہ قدس اللہ اسرارہم کے سلوک کا۔

تم سے کہتا ہوں میں حد پرواز کا راز　　　　بات سمجھو گے مری گر ہوئے اہل پرواز

خلاصہ: مراقبات کے ضمن میں تین ولایتیں، تین کمالات اور سات حقائق مذکور ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ مقامات کا ذکر ہوا ہے۔ یہ تمام گویا دریا میں سے قطرے کا ذکر ان اوراق میں کیا گیا ہے۔ اس معزز خاندان کے تمام متوسلین کو حاصل نہیں ہوتے بعض ولایت قلبی بلکہ دائرہ امکان تک رہ جاتے ہیں۔ بعض کو ولایت کبریٰ اور بعض کو ولایت علیا حاصل ہوتی ہے اور بہت کم کو کمالات ثلثہ حاصل ہوتے ہیں اور خال خال حقائق سبعہ وغیرہ سے فائز ہوتے ہیں۔

(مفتاح السلوک مع الاضافہ)

حررہ:

العبد الفقیر السید احمد علی شاہ ترمذی حنفی سیفی

حال فقیر کالونی اورنگی ٹاؤن

جامعہ امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ

سیریل نمبر:000266-01-26

مؤرخہ:۰۱ اپریل،۲۰۲۶

بروزِ قیامت رؤیت باری تعالیٰ

سوال:

میرا تعلق سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ سیفیہ سے ہے اور حضرت پیر سیف الرحمن مبارک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے بیعت اور خلافت حاصل ہے۔ آپ کی ایک کتاب جو مراقبات کے بارے میں ہے اور نیٹ پر موجود ہے جسے صوفی غلام صفدر محمدی سیفی نے اپلوڈ کیا ہے اس میں لکھا ہوا کچھ مواد بظاہر اہل سنت کے مشہور عقیدے کے خلاف جاتا ہے:

مثلاً صفحہ ۱۳ پر لکھا ہے:

"حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے فرمایا ہے کہ جس لطیفے کو فنا حاصل نہیں ہوگی وہ لطیفہ قیامت کے دن اندھی حالت میں کھڑا کیا جائے گا"۔

آگے لکھا ہے:

"اس لیئے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا دیدار ظاہر کی آنکھوں سے نہیں ہوگا وہ دل کی آنکھوں سے ہی ہوگا"۔

یہ بات اہل سنت وجماعت کے عقیدے کے خلاف ہے کہ دیدار دل کی آنکھوں سے ہوگا بلکہ واضح احادیث موجود ہیں کہ دیدار سر کی آنکھوں سے ہوگا اور اس پر اہلسنت کے علماء کرام کے فتاویٰ جات بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ یہ امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کی تعلیمات کے بھی خلاف ہے کیونکہ امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس نے مکتوبات شریف میں کافی مقامات پر مشاہدے اور رؤیت میں فرق بیان کیا ہے اور رؤیت جو آنکھوں سے ہوگی اسے آخرت میں ثابت کیا ہے جبکہ مشاہدے کو دنیا میں ثابت کیا ہے۔

چونکہ یہ عقیدے کا مسئلہ ہے اس لیئے آپ سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اس پر اپنا مؤقف واضح کریں تاکہ ابہام دور ہو جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں نے مکتوبات امام ربانی کا کئی مرتبہ مطالعہ کیا ہے لیکن یاد نہیں آرہا کہ کہیں یہ پڑھا ہو کہ جس لطیفے کو فنا حاصل نہیں ہوگی تو وہ قیامت کے دن اندھی حالت میں کھڑا کیا جائے گا۔ اس بارے میں اگر آپ کے پاس امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ الاقدس کے کسی مکتوب یا کتاب کا حوالہ ہے تو وہ بھی ضرور شیئر کر دیں۔

جزاکم اللہ تعالیٰ فی الدارین

المستفتی:

محمد ادریس سیفی

اَلْجَوَابُ بِعَوْنِ الْمَلِكِ الْوَهَّابِ اَللّٰهُمَّ هِدَايَةَ الْحَقِّ وَ الصَّوَابِ

اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ قیامت کے دن اہلِ جنت کو ان کی ظاہری آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کرایا جائے گا، اور تمام اہلِ جنت دیدارِ الٰہی سے ایسے لطف اندوز ہوں گے کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور چیز ان کے لیے اس قدر باعثِ مسرت نہیں ہوگی۔

شرح العقیدۃ الطحاویۃ میں ہے:

"قال رحمه الله تعالى: (والرؤية حقّ لأهل الجنة بغير إحاطة ولا كيفية، كما نطق به كتاب ربّنا: (وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ إِلَى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ) ... ومسألة الرؤية، مسألة عظيمة افترقت فيها الأمة، فأهل السنة والجماعة يؤمنون بأن المؤمنين يرون ربهم يوم القيامة عيانا بأبصارهم، يرونه في عرصات القيامة-يعني: في مواقف القيامة-، ويرونه في الجنة، كمايشاءسبحانه وتعالى، يرونه ويسعدون، وينعمون بالنظر إلى ربهم."

ترجمہ: مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں "(جنت والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا دیدار حق ہے) بغیر احاطہ (یعنی مکمل گھیر لینے) اور بغیر کیفیت (یعنی اس کی حقیقت وصورت بیان کرنے)، جیسا کہ ہمارے رب کی کتاب قرآن عظیم الشان نے اس کو بیان کیا ہے: (اس دن بہت سے چہرے تروتازہ ہوں گے، اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے)... اور رؤیت (اللہ تعالیٰ کو دیکھنے) کا مسئلہ ایک عظیم مسئلہ ہے جس میں امت کا اختلاف ہوا ہے۔ پس اہلِ سنت وجماعت اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ مؤمن لوگ قیامت کے دن اپنے رب کو کھلی آنکھوں سے دیکھیں گے، وہ اسے میدانِ قیامت میں دیکھیں گے — یعنی قیامت کے مختلف مقامات پر، اور جنت میں بھی دیکھیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ وہ اسے دیکھیں گے، خوش ہوں گے، اور اپنے رب کے دیدار سے نعمتیں حاصل کریں گے"۔[1]

الفقہ الاکبر میں ہے:

"وكان الله تعالى خالقًا قبل أن يخلق ورازقًا قبل أن يرزق والله تعالى يرى في الآخرة ويراه المؤمنون وهم في الجنة بأعين رؤوسهم بلاتشبيه ولا كيفية ولايكون بينه وبين خلقه مسافة"۔

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ خالق تھا مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے بھی، اور رازق تھا روزی دینے سے پہلے بھی۔ اور اللہ تعالیٰ آخرت میں دیکھا جائے گا، اور مؤمن اسے جنت میں اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے، بغیر کسی تشبیہ (یعنی مخلوق سے مشابہت) کے، اور بغیر کیفیت (یعنی اس کی حالت بیان کیے)، اور اس کے اور اس کی مخلوق کے درمیان کوئی مسافت (فاصلہ) نہیں ہوگا"۔[2]

---

[1] (إثبات رؤية المؤمنين لربهم في الآخرة، ص:۱۱۲، ط: دار التدمیریة)

[2] (رؤية الله فی الآخرة، ص۵۳، ط: دار الفرقان)

حقیقت یہ ہے کہ دیدار ہو گا ظاہری آنکھ سے (یہ عقیدہ ہے)، مگر لذت، معرفت اور کمال دل کی آنکھ سے حاصل ہو گا (یہ تصوف ہے)۔ مثلاً دو آدمی ایک ہی چیز دیکھتے ہیں، ایک کو صرف "دیکھنا" نصیب ہوتا ہے، دوسرے کو دیکھنے کے ساتھ سمجھنا بھی نصیب ہوتا ہے، اور اس کی محبت اور لذت سے بھی آشنا ہوتا ہے۔

دراصل امام ربانی مجدد الف ثانی اور خواجہ محمد معصوم رحمہما اللہ تعالیٰ کا کلام انکارِ رؤیت نہیں بلکہ تکمیلِ رؤیت ہے۔

جیسا کہ مکتوبات معصومیہ میں ہے:

حاجی محمد عارف کے نام درجات ولایت ولطائف عالم امر اور ان کے مناسب امور اور لطائف عالم خلق کے بیان میں تحریر فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

برادر گرامی حاجی عارف کے مکتوب مرغوب نے پہنچ کر خوش وقت کیا، حق سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیشہ ترقیات کے دروازے کھلے رکھے اور اپنی مرضیات کے کسب کے ساتھ سربلند کرے، آپ نے فنائے لطائف حاصل ہونے کے بارے میں لکھا تھا حمد اللہ سبحانہٗ علیٰ ذالک (اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد ہے)۔

آپ جان لیں کے ولایت کے پانچ درجے ہیں جو کہ عالم امر کے پانچ لطائف (قلب، روح، سر، خفی اور اخفٰی) کے طے کرنے اور ان لطائف میں سے ہر ایک کے مناسب کمالات تک وصول اور ہر ایک کی فنا وبقا کے حصول سے وابستہ ہیں، اگرچہ نفس ولایت ان لطائف میں سے بعض کی فنا کے ساتھ وابستہ ہے لیکن اس کا کمال لطیفۂ اخفٰی کی فنا پر موقوف ہے، نیز ہو سکتا ہے کہ لطیفۂ قلب وروح کی فنا حاصل ہو جائے، اور ولایت حاصل ہو جائے اور لطیفۂ سر فنا کی دولت سے بے بہرہ ہو، اور فنائے سِر حاصل ہو جائے اور فنائے خفی واخفٰی حاصل نہ ہو، جب کل کو (قیامت میں) حقائق اشیاء ظہور کریں گے تو وہ لطیفہ جو اس عالم (دنیا) میں فنا وبقا کو نہیں پہنچا ہے ان ثمرات ونتائج سے جو کہ فنا وبقا پر مترتب ہوتے ہیں بے بہرہ رہے گا اور کچے دانے کی طرح رہ جائے گا جو کہ پختہ دیگ میں رہ گیا ہو۔

وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَى فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَى وَأَضَلُّ سَبِيلًا (الإسراء ۷۲)[1]

نیز مکتوبات معصومیہ میں ہے:

فنا کا بیان

حضرت سیدی قیوم ثانی خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جلد سوم، مکتوب ۴ میں فرماتے ہیں:

جاننا چاہیئے کہ فنا کا فائدہ صفات بشریہ کا زائل اور شرک خفی کا رفع ہونا ہے۔ اگرچہ سر، خفی اور اخفٰی شرعی احکام کے ساتھ مکلف نہیں ہوئے ہیں اور ان کے شرک کا اسلام میں کوئی اعتبار نہیں کیا گیا۔ لیکن ولایت خاصہ کے مرتبہ میں اس شرک خفی کے رفع سے چارہ نہیں ہے اور جس قدر یہ (لطائف) زیادہ لطیف ونورانی ہوں گے، ان کا شرک اسی قدر زیادہ خفی ہو گا اور اس

---

[1] (مکتوبات معصومیہ، مکتوب نمبر ۲۱۳، ج ۱، ص ۴۶۸)

شرک کا رفع کرنا اسی قدر زیادہ دقیق ہو گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ بعض اشخاص کو فنائے قلب وروح حاصل ہو جائے اور فنائے سِر حاصل نہ ہو اور بعض کو فنائے سِر حاصل ہو جائے اور ان دونوں لطیفوں (خفی اور اخفٰی) کی فنا حاصل نہ ہو جو کہ اس کے بعد میں اور اس کو ان ہی (تین لطیفوں) لطیفہ قلب، روح اور سِر پر اکتفا ہو اور وہ شخص اولیاء اللہ میں سے ہو، لیکن جب کل (قیامت کے روز) ان لطائف میں سے ہر ایک لطیفے کے حقائق جلوہ گر ہوں گے تو جو لطائف کہ اس دنیا میں فنا وبقا کی دولت سے مشرف نہیں ہوئے ہوں گے وہ (وہاں پر) اس فنا وبقا کے مناسب ثمرات ونتائج سے کامل فائدہ حاصل نہیں کریں گے۔

وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَى فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَى وَأَضَلُّ سَبِيلًا (الإسراء ٧٢)

ترجمہ: جو شخص اس (دنیا) میں اندھا رہا تو وہ آخرت میں بھی اندھا اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا ہو گا۔[1]

تفسیر مظہری میں ہے:

قلنا المراد بالعمى ھاھنا عمى القلب۔

ترجمہ: کہ یہاں (آیت مبارکہ میں) أَعْمَى سے مراد دل کا نابینا ہونا ہے۔[2]

احیاء العلوم میں ہے:

ثم بيان أن أعظم اللذات لذة النظر إلى وجه الله تعالى ثم بيان سبب زيادة لذة النظر في الآخرة على المعرفة في الدنيا۔

ترجمہ: پھر اس بات کا بیان کہ سب سے بڑی لذت اللہ تعالیٰ کے چہرۂ اقدس کے دیدار کی لذت ہے، پھر اس وجہ کا بیان کہ آخرت میں دیدارِ الٰہی کی لذت دنیا میں حاصل ہونے والی معرفت پر مبنی ہے۔[3]

سعادت العباد شرح مبدا و معاد میں ہے:

رؤیت باری تعالیٰ اور خواجہ محمد پارسا قدس سرہٗ

عمدۃ الابدال قدوۃ الاقطاب حضرت خواجہ محمد پارسا نقشبندی قدس سرہٗ العزیز اپنی تصنیف لطیف "تحقیقات" میں رقم طراز ہیں کہ عامۃ المسلمین جس قدر آخرت میں حق تعالیٰ کا دیدار کریں گے، اولیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ یہاں (دنیا میں) اسی قدر شرف دیدار سے مشرف ہیں۔ اولیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ آخرت میں جس قدر دیدار کریں گے انبیائے عظام علیہم السلام یہاں اس دنیا میں اسی قدر شرف رؤیت سے بہرہ ور ہیں۔ انبیائے عظام علیہم السلام جس قدر روز قیامت رؤیت باری تعالیٰ سے لطف اندوز ہوں گے سید الانبیاء حضرت محمد مصطفٰی علیہ التحیۃ والثناء اتنا ہی اس دنیا میں دیدار خدا سے بہرہ یاب ہیں۔ فلہٰذا انبیائے سابقین علیہم السلام اور ہمارے نبی مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم رؤیت اخروی میں برابر نہیں ہوں گے لَا یُشَارِکُ فِیْہِ غَیْرُہٗ ان کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں۔

---

[1] (مکتوبات معصومیہ، سیرت مبارکہ، ص ٢٧٨)

[2] (التفسير المظهرى، ج ١، ص ٢١٧٨، ناشر: مكتبة رشديه، پاکستان)

[3] (احياء علوم الدين، ج ٦، ص ٣٢٨)

جسے جنتی حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگی، اسی کے موافق اسے دیدار میسر ہوگا۔[1]

خلاصہ کلام

امام ربانی مجدد الف ثانی، خواجہ محمد معصوم اور ان کے متبعین رحمہم اللہ تعالیٰ کا کلام انکارِ رؤیت نہیں بلکہ تکمیلِ رؤیت ہے۔ اصل دیدار آنکھوں سے ہوگا، جبکہ اس کی لذت، معرفت اور درجات دل کے احوال اور سلوک (فنا و بقا) پر موقوف ہیں۔

وَاللهُ اَعْلَمُ عَزَّوَجَلَّ وَرَسُوْلُہ اَعْلَم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلَّم

حررہ:

احقر العباد تراب اقدام الاولیاء فقیر سید عبد الحق شاہ حنفی ترمذی سیفی

جامعہ اسلامیہ عبد اللہ بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہما

جان محمد کلمتی گوٹھ، گھگھر پھاٹک، نزد دیوان سیمنٹ فیکٹری، کراچی

[1] (حاشیہ عقائد نور پشتی، ص ۳۵، ۳۶، سعادت العباد شرح مبدا و معاد، ج ۱، منہا ۹، ص ۱۸۹، ۱۹۰)